

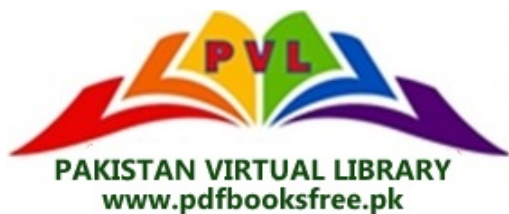


PDFBOOKSFREE.PK

آئیڈیل

رضیہ بٹ

آنڈیل



رضیہ بٹ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

5	میرا کیا قصور
11	بھائی جان
22	ڈاکیہ
31	اکیلا
43	آئیڈیل
58	پیار
69	دشمن
85	ادارہ خدمت خلق
100	داد یا بیداد
115	سیلاب
127	ویرانے میں بہار
147	پرکھ
155	یا کچھ اور
163	خالی گود
175	بڑے گھر کی
186	ماموں
207	زرد چہرے
217	گل پروشے
230	فریب

میرا کیا قصور

اب اس میں میرا کیا قصور کہ عورت میزری کمزوری ہے۔
جہاں کہیں میں نے عورت کو دیکھا۔ میری نظریں آپوں آپ اس میں یوں اٹک
گئیں۔ جیسے کنڈے اٹک جاتے ہیں۔ لاکھ کوشش کروں۔ ہزار جتن کروں لیکن نگاہیں
ایسی باغی ہو جاتی ہیں کہ کسی طور قابو ہی میں نہیں رہتیں۔
میری اس بات سے میری بیوی چڑتی ہے۔ ہم دونوں میں کبھی کسی بات پر لڑائی
نہیں ہوئی۔ کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ میں خود بھی خاصا معقول آدمی ہوں۔ اور میری
بیوی بھی خوب سمجھدار۔ لیکن اس بات پر ہم دونوں میں وہ مفرکے ہوئے ہیں۔ کہ خدا
کی پناہ۔

میں اس اللہ کی بندی کو ہزار بار سمجھا چکا ہوں۔ کہ سب یہ میری عادت ہے۔ صرف
دیکھتا ہوں اور تو کچھ نہیں کرتا۔ میرا سابقہ ریکارڈ داغدار نہیں۔ تم ہی پہلی عورت ہو جو
میری زندگی میں داخل ہوئی ہو۔ اور جوانی ہی میں داغ مفارقت نہ دے گئیں۔ تو قسم
کھاتا ہوں تم ہی آخری عورت بھی ہوگی۔ جو میری زندگی میں آئی۔ نوجوان عورتوں اور
لڑکیوں کو میں دیکھتا ضرور ہوں۔ لیکن اس سے آگے کبھی نہیں بڑھتا۔ کسی سے تعلقات
بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ملنے کی خواہش نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ کبھی کسی سے بات کرنے
کی ضرورت محسوس نہیں کرتا..... صرف دیکھتا ہوں اور اس بات کا تمہارے سامنے پوری

آئیڈیل

ایمانداری سے اعتراف بھی کرتا ہوں کہ دیکھنے سے نگاہوں کو خوشی و تسکین ملتی ہے۔ لذت کا انوکھا سا سرور ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے اندر کوئی بہت بڑا فنکار چھپا ہو۔ اس کے اُکسانے پر میری نگاہیں بے قابو ہو جاتی ہوں اور صنفِ لطیف کے لئے انتہائی پاکیزہ اور لطیف جذبات دل میں ابھر آتے ہوں.....

لیکن توبہ توبہ میری باتوں کا اس پر کبھی اثر ہو..... اسے تو میری معصومیت پر یقین ہی نہیں آتا۔

”یہ بھی بھلا ماننے کی بات ہے۔“ وہ جس انداز سے کہتی ہے۔ چور ہونے کا احساس دلا دیتی ہے۔

کبھی کبھی تو بے طرح الجھ پڑتی ہے۔ کئی کئی دن موڈ آف رہتا ہے منہ پھلائے پھرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی معتدل بھی ہو جاتی ہے۔ بڑے آرام سے سمجھاتی ہے۔ دیکھیں ناہم میاں بیوی ہیں۔ ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی شعوری کوششیں ہمارا فرض ہے۔ مان لیا آپ نو جوان عورتوں اور لڑکیوں کو صرف نگاہوں کی پیاس بجھانے ہی کے لئے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات سے دکھ پہنچتا ہے۔ جلن محسوس ہوتی ہے۔ سکون غارت ہو جاتا ہے آپ میری خاطر ہی اس عادت کو ترک کر دیں۔

اور

میں

جو اپنی اس کمزوری سے پوری طرح آشنا ہوں۔ پکا پکا وعدہ بھی نہیں کر سکتا۔ موڈ اچھا ہو..... تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا ہوں۔ اور طبیعت موڈ میں نہ ہو تو جھاڑ پلا کر رکھ دیتا ہوں۔ ایسی بھی کیا تنگ نظری۔ جب بات صرف دیکھنے تک ہی محدود ہے۔ تو پھر بال کی کھال نکالنے کی کیا تنگ۔

بہر حال زندگی گزرتی چلی جا رہی ہے۔ تیز رفتار گاڑی کی طرح کبھی تو رواں دواں اور کبھی یوں کہ جیسے چلتی زندگی کے پہیوں میں کوئی چیز آ جائے۔ باز میں آیا ہوں نہ ٹوکنے سے باز بیوی آتی ہے۔ بیچاری پر مجھے ترس بھی آتا ہے۔ میرے ساتھ جب بھی

آئیڈیل

باہر جاتی ہے۔ اس کی سانس جیسے انکی ہوئی ہوتی ہے۔ میری نظروں کا تعاقب ہر آن ہر لمحہ کرتی رہتی ہے۔ شاپنگ کرنے جائے سینما جائے یا کہیں اور گھومنے پھرنے اس کی نظروں میں دھڑکا ہوا وقت موجود رہتا ہے۔

جہاں کہیں میری نگاہوں کے کنڈے کسی نو جوان وجود میں اٹکے وہ ٹپٹا گئی۔ بازار میں ٹوک تو نہیں سکتی۔ ہاں نگاہوں سے خوفناک قسم کی وارننگ ضرور دیتی ہے۔ کبھی کبھی موقعہ پا کر چنگکی بھی کاٹ لیتی ہے۔ اپنی نوکدار ایڑی سے میرا پاؤں بھی مسل دیتی ہے۔ لیکن

میں بھی پکا ڈھیٹ ہوں۔ اس کی جانب دیکھتا ہی نہیں کمال ہوشیاری سے نگاہیں چرا لیتا ہوں۔ چنگکی کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور پاؤں کی تکلیف بھی برداشت کر جاتا ہوں.....

لیکن کچھ عرصے سے اب میں بھی پریشان رہنے لگا ہوں۔ خوشحال ازدواجی زندگی میں یہ پھانس اب بری طرح کھٹکنے بھی لگی ہے۔ بیوی کی خاطر مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ سوچ سوچ کر بھی سوچا ہے۔ کہ ہر وقت سیاہ چشمہ استعمال کیا کروں..... تاکہ میری نگاہوں میں بقول میری بیوی عود آنے والی چمک اس سے پوشیدہ رہ سکے۔ لیکن چشمہ کیا لیا..... لڑائی کی رفتار دگنی ہو گئی..... دوسرے یا تیسرے معرکے میں چشمہ میری بیوی نے توڑ پھوڑ ڈالا..... اور میں فرار کا کوئی اور طریقہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

کئی دن سوچتا رہا..... کبھی سوچتا بیوی کے ساتھ کبھی باہر نکلا ہی نہ کروں۔ کبھی خیال کیا۔ کہ اس عادت کو شعوری کوشش سے ترک کرنے کی کوشش کروں..... چاہے خالی خولی دیکھنے ہی تک محدود تھی۔ لیکن تھی تو بری عادت..... لیکن مجھے احساس تھا۔ کہ یہ عادت جانے کی نہیں..... بہر حال بیوی کے سامنے توبہ کر لی.....

لیکن میں چونکہ انتہائی مخلص قسم کا شوہر بھی ہوں۔ اس لئے بیوی سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”بھئی یہ توبہ قسط وار ہوگی.....“

آئیڈیل

”مطلب“ وہ ہنسی نہ روک سکی۔ اور میں نے شہ پا کر کہا۔ ”آہستہ آہستہ جائے گی عادت..... بھول چوک معاف..... بابت بات پر اب تم نے بھی ہنگامہ نہیں بنانا ہوگا۔ میں اپنے اندر کے فنکار کو آہستہ آہستہ ہی موت کی نیند سلا سکوں گا.....“

بیوی خوش تھی۔ بڑی پر تو آیا تھا نا.....
میں نے بیوی کو خوش کرنے کے لئے واقعی شعوری کوشش شروع کر دی..... لیکن اس کوشش میں میرے اندر کا چھپا ہوا فنکار بری طرح مسلا گیا..... مجھے اتنی تکلیف ہوئی..... کہ بیان سے باہر ہے۔

بہر حال ازدواجی زندگی کی خوشیوں میں اس قربانی سے کچھ نہ کچھ حصہ تو دینا تھا۔ بیوی پر زبردست قسم کا احسان بھی تو ہوتا تھا۔ عجب بھولی بھالی عورت ہے۔ میرے بہلاؤں سے اس طرح بہل گئی کہ لگتا ہی نہیں کبھی اسے مجھ سے اس سلسلہ میں کوئی شکایت تھی۔ ہاں کبھی کبھی جب میری نظروں میں شکار آنا گزیر ہو جاتا۔ تو وہ گھبرا گھبرا کے مجھے دیکھنے لگتی اور میں اس کی پریشان نظروں سے محفوظ ہوتے ہوئے اپنا کام بھی کر لیتا۔ اور اسے بھی تسکین بہم پہنچانے کی کوشش کر لیتا۔ یہ سلسلہ اچھا تھا۔ میری بیوی پر میری بصری شرافت کا سکہ جمنے لگا۔

چند دنوں کی بات ہے۔ ایک عزیز کی شادی کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا..... یہ بات واضح کر دوں۔ کہ اپنے کنبے اور قبیلے میں میری نگاہوں نے کبھی کوئی گستاخی نہیں کی..... اس لئے میری بیوی کے لئے وہاں جانا تو وجہ اطمینان تھا۔

لیکن

مرحلہ تھا۔ سفر کا.....

جانا بھی ریل کار سے تھا۔ لوئر کلاس میں..... جہاں ظاہر تھا۔ جہاں جگہ ملی بیٹھنا پڑے گا۔

اتفاق ہی سے ٹین سیٹوں کے برتھ پر ایک معمر عورت بیٹھی تھی۔ میری بیوی ادھر لپکی..... لیکن میرے بیٹھنے سے پہلے ہی اس پر گھبراہٹ کا دورہ سا پڑا..... سامنے والے

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

برتھ پر تین نوجوان لڑکیاں براجمان تھیں۔ بڑی بے باک قسم کی نئی تہذیب کی دلدادہ لڑکیاں..... جن کی اک اک حرکت دعوتِ نظارہ تھی۔

میری بیوی یہاں سے فوراً سے پیشتر اٹھ جانا چاہتی تھی۔ مجھے اٹھا دینا چاہتی تھی..... عجیب طرح گرفتار بلا تھی۔ کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ اور کہنا بھی چاہتی تھی۔ اس کمپارٹمنٹ میں اب کوئی سیٹ خالی نہ تھی..... چند لوگ کھڑے بھی تھے۔ اچھی بھلی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو جانا حماقت کے سوا اور کیا تھا..... بہر حال وہ بہت شہنشاہی تھی۔

ساتھ والی معمر خاتون تعارف کے پہلے مرحلے میں میری بیوی سے مسافروں والا مخصوص سوال کر رہی تھی۔ ”کہاں جانا ہے آپ کو.....“

لیکن میری بیوی اپنے الجھاؤ میں شاید ان کا سوال سن ہی نہ پائی تھی۔ میں زیر لب مسکرایا۔

اور پھر بیوی کی قابلِ رحم حالت دیکھتے ہوئے تو بہ کی ایک قسط ادا کرتے ہوئے رخ قدرے موڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ اس طرح کہ تینوں لڑکیاں میری نگاہوں کی زد سے محفوظ رہیں.....

میری بیوی نے سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھا میں بڑی شرافت سے اسی طرح بیٹھا رہا

اور پھر

دو گھنٹے کا طویل سفر میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے گزار دیا۔

میری بیوی آج بہت خوش تھی۔ میں نے بھی تو فرمانبرداری کا پورا پورا ثبوت دیا تھا..... جس طرح اس نے بٹھایا اسی طرح بیٹھا رہا۔ ہلا نہ جلا۔ بس ویسے ہی بیٹھا رہا۔

یہ دوسری بات ہے۔ کہ یہ دو گھنٹے میری نگاہیں پورے جاندار احساس کے ساتھ مصروف عمل رہیں۔ اور میرے اندر کا فنکار گدگد کرتا رہا۔

میلے سے نیلے تہبند، کانگے گرتے اور بوسیدہ دوپٹے میں وہ نوجوان دیہاتی عورت ایک بغل میں بچے کو لئے دوسری میں کپڑوں کی پوٹلی دبائے ہاتھ روم کے دروازے

آئیڈیل

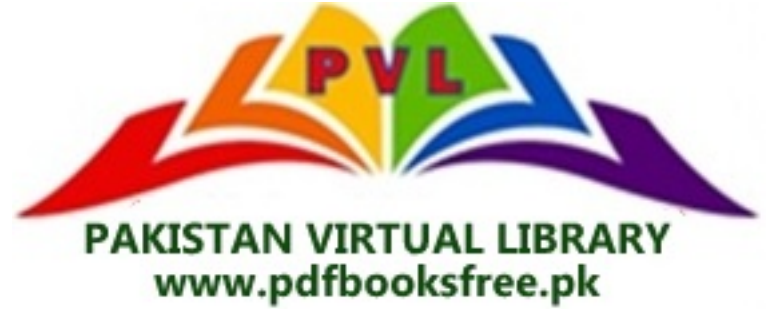
سے لگی کھڑی تھی۔ تقریباً سارا راستہ اس کی پشت میری طرف رہی۔ لیکن گاڑی کے چلنے سے جوار تعاش اس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا جوان بدن پیدا کر رہا تھا.....
اب آپ سے کیا کہوں۔

یہ چوری ضرور ہے۔ لیکن میں بیوی سے شرمندہ نہیں ہوں۔ نہ ہی کوئی احساسِ جرم میرے ضمیر پر ہے۔

میں نے اپنی بیوی سے یہ تو کبھی بھی نہیں کہا کہ صرف فیشن زدہ لپے پٹے چہرے ہی میرے نظروں میں اٹک جاتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ ہی کہا ہے کہ عورت میری کمزوری ہے.....

اب بیوی انتہائی سادہ اور بھولی بھالی ہو۔
تو
میرا کیا قصور!

☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

بھائی جان

خط کے اس حصے کو اس نے تیسری بار پڑھا۔

”لو بھئی شمو اس دفعہ تمہارا گلہ دور کر ہی دیں گے۔ میں دو تین دن تک لاہور جا رہا ہوں۔ راستے میں تمہارے پاس ضرور ٹھہروں گا..... خوش ہوگی نا میری منی سی بہن.....“

”کس کا خط ہے بی بی۔“ شمو کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹیں دیکھ کر صفائی کرتی جینا نے پوچھا۔

”بھائی جان کا..... جینا میرے بھائی جان آ رہے ہیں.....“ خط میز پر رکھتے ہوئے وہ دفور مسرت سے لہرا گئی۔

”کب“ جینا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”بس آج کل میں آئیں گے ہو سکتا ہے، آج آجائیں یا کل، شاید پرسوں آجائیں۔“ اس نے پھر خط اٹھایا۔ خط پر نو تاریخ تھی۔

”آج گیارہ ہے.....“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”ہاں بی بی“

”تو یہ خط ایک دن لیٹ ملا..... کل ملنا چاہیے تھا۔“

”چلو مل ہی گیا نا بی بی..... کل مل جاتا تو آپ کے لئے انتظار کا ایک اور دن بڑھ

آئیڈیل

جاتا.....“

”سچ کہتی ہو جینا.....“ وہ خط ہاتھ میں پکڑے پکڑے پٹنگ پر بیٹھ گئی۔“ واقعی مجھے تو انتظار ابھی سے کوفت دینے لگا ہے۔ تم نہیں جانتیں مجھے اپنے بھائی سے کتنا پیار ہے۔“

”ہر بہن کو ماں جائے سے اتنا ہی پیار ہوتا ہے بی بی۔“ جینا جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے بولی۔ ”میکے کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آپ خط پڑھ رہی تھیں اور میں آپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یقیناً مانو بی بی، چہرے ہی سے میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ خط بی بی کے میکے سے آیا ہے۔“

”چل بڑی آئی۔ چہرہ پڑھنے والی۔“

”اللہ قسم بی بی..... آپ کے چہرے پر جو پیار، جو محبت پھیل رہی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ اسی لئے تو میں نے پوچھا تھا۔ ورنہ مجھے کیا۔ خط تو آپ کے ہاں روز ہی آتے ہیں۔ ابھی کل ہی تو آپ کی منڈ کا خط آیا تھا۔ آپ نے خود ہی بتایا تھا میں نے کوئی پوچھا تھا.....“

”کیوں کل میرے چہرے پر پیار اور محبت نظر نہ آئی تھی۔“ شمو ہنستے ہوئے بولی۔

جینا نے مسکراتے ہوئے سرنفی کے انداز میں ہلایا۔

”بے وقوف۔“ کہتے ہوئے شمو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

واقعی وہ بہت خوشی تھی۔ اتنی خوش کہ جسے عام سی عورت جینا نے بھی آسانی سے محسوس کر لیا تھا۔

بات ہی ایسی تھی۔ کہ اس کے عزیز ترین بھائی جان کے آنے کا مژدہ تھا۔ اس کی شادی کو تین سال ہونے کو آئے تھے۔ لیکن بھائی جان ایک دفعہ بھی اس کے ہاں نہیں آئے تھے۔ وہ جب بھی ماں کے ہاں جاتی بھائی جان سے شکوہ کرتی۔ اور وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے۔ ”ضرور آؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔ اپنی منی بہن کا گھر ضرور دیکھنے آؤں گا۔“

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

وہ روٹھ جاتی..... بھائی جان بڑے پیار سے اسے منا لیتے، یہ ماننا روکھا سوکھا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی سو کبھی پچاس کا نوٹ چپکے سے اس کی منی میں آ جاتا تھا۔ کبھی تکلفاً وہ پیسے واپس کرنے کی کوشش بھی کرتی تو بھائی جان ڈانٹ دیتے۔

”مانا کہ تیری شادی ہوگئی، لیکن میرے لئے تو ابھی منی ہی ہے۔“

اس کے جانے پر بھائی جان بھی تو بہت خوش ہوتے تھے، کبھی مٹھائی لارہے ہیں۔ کبھی پھل..... اس کی پسند کے کھانے پکوا رہے ہیں۔ مرغیاں بروسٹ کروا رہے ہیں۔ تلی ہوئی مچھلی منگوا رہے ہیں۔ انہیں تو یوں لگتا تھا، منی عید کا چاند بن کر گھر میں اتر آئی ہے۔

”تجھے کیا بتاؤں جینا۔“ وہ بھائی جان کی باتیں سناتے ہوئے بولی۔ ”میرے بھائی جان کتنے اچھے ہیں۔ مجھے تو حسرت تھی کہ وہ میرے گھر آئیں۔ اور میں بھی دل و جان سے ان کی خاطر مدارت کروں۔ شکر ہے انہوں نے بھی آنے کا لکھا.....“

”خوش قسمت ہیں آپ بی بی۔ جو بھائی اتنا چاہتا ہے۔ بہت کم ہی بھائی ہوتے ہیں ایسے۔“ جینا نے جہانگیرہ انداز میں کہا۔

”آئیں گے تو دیکھ لینا.....“ وہ بڑے سرور اعتماد سے بولی۔

”آپ کی خوشی ہی بتا رہی ہے بی بی۔“ جینا جھاڑن گھٹنے پر رکھ کر اس کے سامنے ہی قالین پر بیٹھ گئی۔ باتونی وہ بہت تھی۔ آج بی بی بھی باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں۔

”مجھے بڑا ارمان تھا جینا..... کہ بھائی جان میرے گھر آئیں۔“

”خوب خاطر ہیں کرنا آپ بھی بی بی۔“

”خاطریں..... دیکھنا تو سہی..... میکے سے تو کبھی کوئی آتا ہی نہیں تین سال ہو گئے میری شادی کو صرف تین دفعہ اماں آئیں۔ اور دو دفعہ آپا۔ اماں جب بھی آتی ہیں۔ اس طرح لدلدا کر کے کیا بتاؤں۔ آپا دونوں دفعہ سو سو روپیہ منے کو دے گئیں..... اب دیکھنا بھائی جان کیسے آتے ہیں.....“

”بہت امیر ہیں.....“ جینا تجسس سے بولی۔

”سسرال والے غریب تو نہیں.....“ شمو کا لہجہ شاکی تھا..... سجاد کے بھائی جان بھی تو دیکھتی ہو۔ آئے دن آئے رہتے ہیں۔ کیا مجال جو منے کے لئے چار پیسے کی چیز ہی لے آئیں۔ پچھلی دفعہ تیر مارا تو پلاسٹک کا کھلونا اٹھالائے۔“

”ہاں بالکل معمولی سا۔ ایک دن ہی میں ٹوٹ گیا۔“

”پیار بڑا جتلاتے ہیں۔“

”رہنا جو ہوتا ہے اب سوکھا پیار بھی نہ کریں۔“

جینا شمو کو خوش کرنے کے لئے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

”میں تو“ شمو بولی۔ ”سجاد کے لئے ان سب کے ساتھ اچھی طرح پیش آتی ہوں۔ ورنہ ان لوگوں کا یہ رویہ تم دیکھتی ہونا..... کچھ بھی کرو۔ جا کر باتیں ضرور بنائیں گے۔ خدا قسم دل جلا ڈالتے ہیں.....“

”ہاں بی بی..... دل تو جلتا ہی ہے.....“ جینا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

دونوں باتوں میں اس طرح کھو گئیں کہ جینا کو کام کرنا یاد رہا نہ شمو کو۔ شمو کو آج بازار بھی جانا تھا۔ لیکن باتوں ہی میں گیارہ بج گئے۔

”جینا کی بچی وقت پتہ ہے کیا ہو گیا؟“ شمو نے مینٹل پیس پر رکھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”گیارہ بج رہے ہیں.....“

”ہاہائے..... اتنا وقت گزر گیا۔ باتوں میں پتہ نہ چلا۔ ابھی تو میں نے برتن بھی دھونے ہیں.....“

”جلدی کر کھانے کو دیر ہوگئی، تو سجاد کا پتہ ہے نا..... ڈیڑھ بجے آ جاتے ہیں۔“

دونوں کام کرنے لگیں۔ شمو بیڈ کو پھیلا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی، جینا دیکھنا ڈرا.....“

”اچھا جی“ کہتے ہوئے جینا دروازے کی طرف گئی اور جب واپس لوٹی تو اس

کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک چٹ تھی۔

”سجاد صاحب کے دفتر کا چپرا سی لایا ہے۔ جینا نے چٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شمو نے ایک نظر میں چٹ پڑھ لی۔

”بھائی جان آگئے ہیں، بازار کچھ کام ہے۔ میرے ساتھ ہی گھر آئیں گے کھانے کا بندوبست کر لینا.....“

”جینا“ و فور مسرت سے شمو چیخ اٹھی..... ”بھائی جان آگئے۔“

”کہاں“ جینا نے پوچھا..... لیکن شمو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بھائی جان آگئے تھے اور اس کا سارا گھبراہٹ پلٹ تھا۔ گیارہ بج چکے تھے اور کھانے کا بندوبست کرنا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اسے کچھ سوچہ ہی نہیں رہا تھا۔

”ہائے اللہ اب کیا کروں۔“ وہ بیڈ کو رکھتے ہوئے بولی۔

”کیوں بی بی“ جینا نے پوچھا۔

”اے تو تو دفع ہو۔ کام ختم کر جا کے۔ ابھی باورچی خانے کا کام اسی طرح پڑا ہے۔“

”سب ہو جائے گا۔“

”تیرا سر ہو جائے گا..... کھانا بھی پکانا ہے ابھی..... اُف خدایا..... کیا کیا کروں گی.....“

”بی بی گھبراائیں نہیں، منٹوں میں سارا کام ہو جاتا ہے۔ آپ یہ کمرہ ٹھیک کر لیں، میں باورچی خانہ دیکھتی ہوں، ہاں آپ ساتھ ساتھ سوچ بھی لیں، کہ کیا پکانا ہے۔“

”اب اتنی جلدی میں کیے گا تیرا سر۔ ابھی تو سودا بھی لانا ہوگا۔ دیکھو..... برکت ہے باہر..... سودا تو لا دے.....“

جینا اچھا کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ شمو نے پرانا بیڈ کو پرے پھینک دیا۔ سٹور سے جا کر نیا بیڈ کو نکال لائی..... بستر پر پھیلاتے ہوئے وہ بازار سے منگوانے والی چیزوں کا سوچ رہی تھی۔ وقت کم تھا۔ اس لئے زیادہ چیزیں پک نہ سکتی تھیں۔ کچھ کچی پکائی چیزیں

منگوانے کا سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔
برکت آ گیا۔

شمونے بوٹہ نکالا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”بس پانچ منٹ میں آؤ سودا لے کر سبجھے۔“

”جی بہت اچھا۔“ وہ بولا۔

”کسی کا سائیکل لے جائیے گا۔“ جینا نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ دکان سے کرایہ پر لے لینا۔ اب مانگنے کسی سے جاؤ گے۔“

”اچھا جی۔ آپ سودا لکھ دیں۔ کوئی چیز بھول نہ جائے۔“

جینا نے جلدی سے بڑھ کر دراز میں سے شمو کی کاپی پٹل نکالی اور بولی۔ ”میٹھے کے لئے کھوا ضرور منگوانا بی بی۔“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔ لیکن کھیر اتنی جلدی بن جائے گی۔“

”کیوں نہیں آپ دیکھیں تو سہی۔“

”مچھلی تو تلی ہوئی منگوا لیں گے۔ میرا خیال ہے مرغ بھی ہوٹل سے منگوا لیں۔ تم

پلاؤ بنالینا۔۔۔۔۔ شامی کباب اور۔۔۔۔۔“

اس نے کئی چیزیں گنوا دیں۔ بھائی جان کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ہر چیز میز پر رکھنا چاہتی تھی۔

جینا نہ رہ سکی۔ ”اتنی چیزیں ایک وقت میں کھالیں گے۔ کچھ رات کے لئے رہنے دیں۔“

”اوہ جینا۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”پتہ نہیں وہ رات یہاں رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ رات رہ گئے۔۔۔۔۔ تو پھر دیکھیں گے میں دو پہر کو ہی پر لطف دعوت کا اہتمام کرنا چاہتی ہوں۔

تمہیں کیا پتہ مجھے کتنی خوشی ہے۔۔۔۔۔ کونسا روز آتے ہیں۔ یا روز آئیں گے۔ یہ سب

چیزیں پکانا ہیں۔ میں خود تمہارے ساتھ کھانا پکاؤں گی۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے

پیارے بھائی جان کی پسند کی چیزیں پکاؤں گی۔ اتنی چیزیں کھا، نا بھی سکے، کچھ تو ضرور

لیں گے۔ بس میری خوشی پوری ہو جائے گی۔۔۔۔۔“
جینا بھلا کیا کہتی۔

برکت سودا سلف لینے چلا گیا، وہ باورچی خانے میں جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ اور شمونے کمرے ٹھیک ٹھاک کر دیئے۔ احتیاطاً ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ بھی

ٹھیک کر دیا۔۔۔۔۔ پلنگ پر خوبصورت بیڈ کوڑا لا۔ نئے دلکش کور کرسیوں پر رکھے۔

چھوٹا قالین بھی ڈال دیا۔ غسل خانے میں تولیہ صابن اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھ دیں۔ گلدانوں میں تازہ پھول سجادیئے۔

وہ منے کو صاف ستھرے کپڑے پہناتے ہوئے خوشی سے بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی۔ ”منے ماموں آ رہے ہیں۔۔۔۔۔ ماموں۔۔۔۔۔ میرے بھائی جان۔۔۔۔۔ تیرے ماموں۔۔۔۔۔ سلام کرنا۔ گندی باتیں نہیں کرنا ان کے سامنے۔ رونا بھی نہیں اور ضد بھی نہیں کرنا۔۔۔۔۔“

دو سالہ منان جذبوں کو کہاں سمجھ رہا تھا، جو شمو کے من میں متلاطم تھے۔

جینا کے ساتھ مل کر اس نے کھانا بنایا۔ ہمسائی سے دو چولہے منگوا لئے۔ دواپنے تھے۔ باورچی خانہ بیک وقت چار چولہے جلنے سے خوب گرم ہو رہا تھا۔ وہ تو کچھ سردی تھی، جو حدت بھی لگ رہی تھی۔ گرمی ہوتی تو تنور سا بننا ہوتا۔

شمو کی گھبراہٹ سے کام جلدی ہونے کی بجائے دیر سے ہو رہا تھا۔

”آپ جائیں بی بی۔ باقی سب کچھ میں کر لوں گی۔۔۔۔۔“ جینا نہ رہ سکی۔

”ابھی کتنی چیزیں تیار کرنا ہیں۔ نرگسی کو فٹے میں بنادیتی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔

”کو فٹے، کباب، تورمہ، پلاؤ۔۔۔۔۔ سب تیار کر لوں گی بی بی۔ آپ یہ کھیر کا پیالہ

اٹھالیں، ہوائیاں چھڑک کر فرج میں رکھ دیں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“

”تم کر لو گی“

”ہاں بی بی۔۔۔۔۔ بے فکر رہو۔ سب کر لوں گی، آپ برتن وغیرہ نکال لیں۔۔۔۔۔“

”واقعی۔“ شمونے کہا اور کھیر کا بھرا پیالہ اٹھا کر کھانے کے کمرے میں آ گئی۔ پتے

کی ہوائیاں پیالے پر بڑی محنت سے پھولوں کی صورت میں چھڑکیں۔ اور پھر پیالہ فرج میں رکھ دیا۔ اب وہ شوکیس کی طرف متوجہ تھی۔ جس میں عام مہمانوں کے استعمال ہونے والے برتن رکھے تھے۔

اسے یہ برتن پسند نہ آئے، آخر جہیز کا ڈزنیٹ کس دن کے لئے رکھا تھا، خوبصورت نفیس اور سبک سا ڈزنیٹ۔

برکت کو بلا کر اس نے ڈزنیٹ کا بڑا سا ڈبہ نکلوایا۔ بڑی احتیاط سے برتن نکالے خود ہی دھوئے اور پونچھ کر میز پر سجانے لگی۔

خوبصورت اور نفیس برتنوں سے میز کیا کرے کی سچ دھج نرالی نظر آنے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ بھائی جان کے شان شایان یہی برتن تھے۔ ان کی عزت افزائی اسی طرح ہو سکتی تھی۔

برتن میز پر لگا کر ڈونگے ڈشیں اور دوسری ضرورت کی چیزیں ٹرے میں رکھ کر وہ باورچی خانے میں لے آئی جینا کے کام کی رفتار تسلی بخش تھی۔ وہ چٹنی اور سلاڈ بنانے لگی۔ آج تو دنیا بھر کی چیزیں اکٹھی کر لینے کو اس کا جی مچل رہا تھا۔ رات کے لئے غیر ملکی ڈشیں تیار کرنے کا وہ دل ہی دل میں ارادہ کر رہی تھی۔

ایک بج کر پچیس منٹ پر ہر چیز تیار تھی۔ اطمینان سے ہر دیکھی اور ککر کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے چیزوں کا آخری جائزہ لیا۔ چاول انگلی اور انگوٹھے میں مسل کر دیکھے۔ کباب الٹے پلٹے۔ زکسی کوفٹوں کا مسالہ چکھا۔ ساگ گوشت بڑا لذیذ تھا۔ روسٹڈ مرغ اس نے فرائینگ پین میں ڈھانپ دیا اور مچھلی کا غدی لفافے میں ہی بلکی آئینچ پر رکھے تو بے پروا رہ دی۔

پھلکے ضرورت ہوئی تو کھانا لگانے کے بعد ڈال لینا۔ رہے بھائی جان چاول کھائیں۔ تو پھر روٹی پھلکے بھی نہیں.....“

”ٹھیک ہے سجاد صاحب نے اگر کھانا ہوئی تو پکالوں گی۔“ جینا صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

”آنا گندھا ہوا ہے نا!“

”ہاں جی۔“

”بس سب ٹھیک ہے۔ آج لگتا ہے کہ کھانا نہایت لذیذ پکا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”آج محنت میں محبت بھی شامل تھی نا بی بی.....“ جینا آنکھیں جھپکا کر بولی۔ وہ مجھے یاد ہی نہ تھا۔ بھائی جان پشاور قہوہ بڑے شوق سے پیتے ہیں، قہوہ تو پڑا ہے چھوٹی الاپچی دیکھ لو ہے کہ نہیں.....“

”ہیں جی..... میں نے دیکھ لی ہیں۔ اتنے ثقیل کھانے کے بعد قہوہ تو ضروری ہوتا ہے نا۔“ جینا نے کہا۔

”تو بڑی سیانی ہے۔“ شمو نے داد کے طور پر کہا۔ ”اچھا سب کچھ ٹھیک ہے۔ کھانے میں خود نکالوں گی۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ تو باورچی خانے کا یہ سارا کاٹھ کباڑ سنبھال لے۔“

”اچھا جی۔“ کہتے ہوئے جینا مرچ مصالحوں کے ڈبے ٹھیک کرنے لگی۔

اور.....

شمو باہر نکل گئی۔

صاف ستھرے کپڑے پہن کر اس نے ہلکا سا میک اپ کیا، کانوں میں کپڑوں کے ہمرنگ بندے ڈالے اور بکس میں اتار کر رکھی ہوئی چوڑیاں بھی پہنیں۔ چوڑیاں بکس میں رکھنے کا بھی ایک لمبا چوڑا قصہ تھا۔ سجاد کے بھائی جان کو کاروبار کے سلسلہ میں پیسے کی ضرورت تھی۔ وہ چار دفعہ اشارتاً کٹائیئے زیور بکس میں رکھ کر روپیہ قرض لینے کی بات کر چکے تھے۔ ان کی بیوی کے پاس تھا ہی کتنا زیور، شمو کو یوں لگتا تھا جیسے ان کی نظر اس کے زیور پر ہو۔ اس نے زیور بکس میں بند ہی کر دیا تھا۔ اور دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر پوچھیں گے تو کہہ دیں گے زیور اماں کے پاس پڑا ہے۔ سجاد ایسا نامعقول آدمی تو نہیں تھا جو بیوی کا زیور گروی رکھ کر بھائی کی ضرورت پوری کرتا۔ پھر بھی شمو نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایسا کیا تھا۔

اب جہاں بھائی جان کی خاطر مدارت کا خیال تھا کوئی کسر اٹھانہ رکھنا چاہتی تھی۔ وہاں بھائی جان کو اپنی خوشحال خوشگوار ازدواجی زندگی کا تاثر بھی دینا چاہتی تھی۔ اسی لئے چوڑیاں کلائیوں میں بھر لی تھیں۔ سونی کلائیوں ممکن ہے۔ بھائی جان کے ذہن میں کوئی اندیشہ بیدار کر دیں۔

پونے دو کے قریب سجاد کا سکوتر پھٹ پھٹ کرتا دروازے کے سامنے رکا۔ اس نے منے کو آواز دی۔

شمو کا دل بھی کچھ خوشی سے سکوتر کی ہی طرح پھٹ پھٹ کر رہا تھا۔ تین سال میں پہلی دفعہ بھائی جان اس کے گھر آ رہے تھے..... اس کے بھائی جان اس کے اپنے بھائی جان! بالکل ہچگانہ سی بے تابی سے وہ دوڑی۔

”منے ماموں آ گئے..... ماموں آئے ہیں منے۔“ کہتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف لپکی۔ مناس کی ٹانگوں میں آ کر گرتے گرتے بچا۔

”بچے کو اٹھائے بغیر وہ دروازے کی طرف لپکی۔ روتے ہوئے منے کو جینا نے اٹھا لیا۔

”ماموں آ رہے ہیں بیٹے.....“ جینا نے چکارا۔ وہ بھی دلچسپی سے ڈیوڑھی کی جانب دیکھنے لگی۔ شمو کی باتوں سے اس کا اشتیاق بھی تو بے پناہ تھا۔

شمو نے دروازے کے دونوں پٹ جس والہانہ بیتابی سے کھولے، سجاد کچھ حیرت زدہ سا ہوا۔ شمو کے لباس اور بناؤ سنگھار کو دیکھا تو پوچھا۔ ”کہیں گئی ہوئی تھی۔“

”نہیں تو..... وہ بھائی جان کہاں ہیں.....“ والہانہ پن سے شمو نے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کے انداز سے سجاد کے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ اتنی بیتابی۔ اتنا والہانہ پن ”کہاں ہیں بھائی جان۔“ اس نے سجاد کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

اسے سر تا پا حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے سجاد بولا۔ ”آ رہے ہیں۔ گلی کے کٹر پر سکوتر سے اتر گئے.....“ کھڑا ہے نا وہاں“

سجاد سکوتر ڈیوڑھی میں کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ شمو ہلینز پر جا کھڑی ہوئی۔ ”السلام علیکم“ بھائی جان نے ایک لمبا سلام مارا.....

شمو حیرت زدہ بت سی بنی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ”آپ..... آپ.....“ وہ ہکلائی۔

”ہاں میں آج سیدھا سجاد کے پاس ہی گیا تھا..... کچھ کام تھا بازار میں..... اور کہو سب ٹھیک ٹھاک۔“ بھائی جان اندر داخل ہو گئے۔

شمو کے والہانہ اشتیاق، بیتابی اور پیار کے جذبوں کو جیسے اونگھ آ گئی۔ بھائی جان ضرور آئے تھے۔

لیکن

اس کے نہیں سجاد کے کئی لمحے وہ گم صم سی خالی خالی نظروں سے گلی کو یوں دیکھتی رہی جیسے بھائی جان کے اب بھی آ جانے کا امکان ہو۔

”شمو“ سجاد اسے یوں کھڑا دیکھ کر پلٹ آیا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ تو کچھ نہیں بولی۔ ہاں جینا نے کہا۔ ”بی بی کے بھائی جان نے بھی آنا تھا۔ وہ

خط آیا تھا.....“

”اوہ۔“ سجاد نے زیر لب صرف اسی قدر کہا۔ ”گھر میں داخل ہوتے ہی جس

ڈھیر سارے اہتمام کا احساس عجیب سا لگا تھا۔ ان کی سمجھ آ گئی۔

☆☆☆

ہوئے بولا..... اور پھر ایک زوردار جمائی لی..... کروٹ بدلی اور تکیے کے نیچے سے بیڑی نکال ہونٹوں میں دبائی.....

”ماچس..... ماچس.....“ وہ زور سے چلا یا..... سیکنہ دوڑی دوڑی ماچس لے آئی۔
”پھر نکال لی تھی میری ماچس..... ہزار دفعہ کہا ہے چولہے کے لئے الگ ماچس رکھا کرو.....“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔ جھٹک کر جلتی تیلی بجھائی اور پھر کمرے کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر پھینک دی۔ ماچس کی ڈبیہ بیڑیوں کے ساتھ سرہانے تلے رکھ دی..... چارپائی پر پورا جسم پھیلانے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے کش لینے لگا۔
کئی لمحے وہ یونہی پڑا رہا۔ پھر بیڑی پھینکتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک بھر پور انگڑائی لی..... اور چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سیکنہ نے جلدی سے اس کا بوسیدہ ربڑ کا چیل اس کے پاؤں کے قریب رکھ دیا.....

اس نے چیل پاؤں میں اڑ سے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ تازہ دم تھا۔ اور روزمرہ کی ڈیوٹی دینے پر ذہنی اور جسمانی طور پر آمادہ..... اس نے سامنے دیوار سے لگی کھوئی پر اپنی وردی پر نگاہ ڈالی۔ پتلون کے پائینچے اڑے ہوئے تھے۔ اور بش شرٹ بھی خاصی بوسیدہ ہو رہی تھی..... وہ کتنے عرصے سے نئی وردی کا سوچ رہا تھا۔ لیکن گھر کے حالات!

اس کی نظریں وردی کے برابر میں ٹنگے ماں کے پیوند لگے گرتے پر پڑیں۔ اور ساتھ ہی سیکنہ کی میلی کچلی شلوار قمیض دیکھی۔ یہ جوڑا جانے کس رنگ کا تھا۔ اب تو بدحواس ذہن کی طرح لگ رہا تھا۔ اپنی وردی کا خیال دل سے پھر نکل گیا اس تنخواہ پر اس نے سیکنہ کے لئے نئے کپڑے بنوانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ تنخواہ تو مہینہ کاٹنے کے لئے ایک آزمائش تھی..... لیکن پھر بھی..... اس نے سیکنہ کے لئے کپڑے ضرور خریدنا تھے..... خریدنا تو خدا جانے وہ کیا کچھ چاہتا تھا۔ لیکن استطاعت ہی نہ تھی وہ اکثر سوچا کرتا..... کہ جب زندگی اتنی بد صورتی سے گزرنا تھی۔ تو خدا نے ذہن میں اتنی

ڈاکیہ

کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے ڈھیر ساری روشنی کمرے میں در آئی تھی۔ سورج کب سے نکلا ہوا تھا۔ کمرے میں خاصا جھس ہو رہا تھا.....
ماں کے بار بار جگانے پر بھی وہ ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ باہر سے اٹھ کر اندر آ لینا تھا..... اور جوانی کی نیند اس جھلنگ سی چارپائی پر بھی بے سدھ کئے ہوئے تھی۔
ماں نے کمرے کی صفائی بھی کر لی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے فرش پر اس کی دس سالہ بہن نے گیلہ کپڑا بھی پھیر دیا تھا۔ میلے برتن بھی باہر لے گئے تھے۔ اور باہر سے بستر لاکر ایک کونے میں تہہ کر کے رکھ دیئے تھے۔

ماں ناشتہ بنانے بیٹھ گئی۔ دوپراٹھے پکائے۔ اور سلور کی دیگچی میں چائے اُبال لی..... اپنے اور سیکنہ کے لئے اس نے سوکھی گیلی دو چپاتیاں بھی اتار لیں۔
مٹی کی ہنڈیا میں رات کا تھوڑا سا بچا سالن اس نے ناک کے قریب کرتے ہوئے سونگھا۔ گرم کرنے سے پہلے اندازہ کیا۔ کہ خراب تو نہیں ہو گیا۔ گرمی بھی تو رات بہت تھی۔ لیکن سیکنہ خاصی سمجھدار تھی۔ ہنڈیا گھڑوں کے قریب رکھ دی تھی۔ بار بار یہاں پانی گرتا تھا۔ اور مٹی ٹھنڈی رہتی تھی.....

سالن گرم کرتے ہوئے اس نے بیٹے کو دو تین کراری سی آوازیں دیں۔
”ابھی بڑا وقت ہے ماں..... کیوں لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو.....“ وہ آنکھیں ملتے

خوبصورتیاں کس لئے بھردی تھیں.....

ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ باہر نکلا اور ٹل کے نیچے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا.....
وہ ایک مقامی ڈاک خانے میں چٹھی رساں تھا۔

اس نوکری کے متعلق تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بچپن ہی سے اس کے ذہن میں بڑے خوش کن پلان تھے۔ لیکن باپ کی بے وقت موت نے سب کچھ تہس نہس کر دیا..... باپ نچلے متوسط طبقے کا آدمی تھا۔ جس کے پاس ورثے میں آئے ہوئے اس چھوٹے سے کمرے اور کچے کچن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تھوڑی بہت پونجی تھی بھی تو وہ بیماری میں کام آگئی..... دور پار کے رشتہ دار بروقت نہ آ پہنچتے تو شاید کفن و دفن کے لئے بھی محلہ والوں کو چندہ جمع کرنا پڑتا.....

پھر انہی رشتہ داروں کے اثر و رسوخ سے اسے چٹھی رسائی کی ملازمت مل گئی تھی۔ بس ضرورت کا منہ کھلا تھا۔ اسے بند کرنے کو اس نے یہ ملازمت اختیار کر لی۔ ورنہ دل سے اسے یہ کام پسند تھا ہی نہیں..... اس کے خواب تو بڑے سہانے تھے۔

وہ وردی پہن کر تیار ہو گیا..... بالوں میں کنگھی کر رہا تھا..... کہ ماں نے ناشتے کے لئے پکارا۔

”دیر ہو رہی ہے بیٹے۔“

”ہونے دو۔“

”بڑی بات ہے۔“

وہ ماں کے قریب آ کر اونچی چوکی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے پرانی سی چنگیر میں رکھے دونوں پرائیڈ اس کے آگے کر دیئے۔ رات کا بچا سالن بھی ایک پرائیڈ پر ڈال دیا..... سامنے ہی بوری بچھائے سیکہ بیٹھی اپنی سوکھی گیلی روٹھی چائے میں ڈبو ڈبو کر نگل رہی تھی.....

”ماں.....“

”ہاں“

”یہ پرائیڈ سیکہ کو دے دو۔“

”کھا جو رہی ہے“

”میں دیکھ رہا ہوں وہ جو کھا رہی ہے۔“

ماں نے سیکہ سے روٹی لے لی اور دوسرا پرائیڈ اسے دے دیا۔ وہ بیچاری ہر اس اسی ماں اور بھائی کا منہ تکتے لگی۔

”کھاؤ کھاؤ۔“ اس نے پیار سے کہا۔ اور پھر ماں سے بولا۔ ”ماں سب کے لئے ایک جیسی روٹی پکایا کرو.....“

ماں ہنس پڑی..... اور پھر آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے بولی۔ ”تو نے سارا دن ڈیوٹی دینی ہوتی ہے بیٹے.....“

”تو کیا ہوا..... تم دونوں کون سا سارا دن گدیلوں میں پڑی آرام کرتی رہتی ہو۔“
ماں گیلی گیلی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ اور وہ چائے گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا..... ”میرا بس چلے ماں تو میں میں۔ جانے کیا کیا کروں تمہارے لئے۔“

”جیتے رہو بیٹا..... اب بھی کیا کم کر رہے ہو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس نے کسی کا محتاج نہیں کیا۔ عزت کی روٹی مل رہی ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا..... بیزار بیزار سا اٹھا۔ اور کام پر چل دیا۔ اس کام سے اس کی ذہنی مطابقت کبھی نہ ہوئی تھی۔ ڈاک خانے جاتا۔ تھیلا ڈاک سے بھرتا۔ مٹی آرڈر کی رقم جیب میں ڈالتا..... پارسل اٹھاتا اور محلے محلے تقسیم کے لئے مشینی انداز میں ساری ڈاک تقسیم کر کے لوٹ آتا۔

معمول کی طرح آج بھی وہ اپنے تھیلے میں اپنے حلقے کی ڈاک بھر رہا تھا۔ کہ فضلے نے اسے خوشخبری سنائی۔

”کل سے تیری ڈیوٹی کا حلقہ بدل گیا ہے.....“

”حلقہ ہی بدلا ہے ڈیوٹی تو نہیں بدلی۔“

”جتنے بڑی بڑی کوٹھیوں میں ڈاک تقسیم کرنا اچھا لگتا ہے نا!“

وہ ہنس پڑا۔ فضلے سے اکثر وہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ بڑی بڑی جہازی سائز کوٹھیوں کے چم چم کرتے برآمدوں میں جب وہ خط پھینکتا تو صفائی اور آرائش اس کے حواس پر بڑا جاندار اثر چھوڑتے۔ بھاری بھرکم بیگمات۔ صحت مند بچے۔ رنگین ٹیلی ویژن ایسی جامہ زیب جوان لڑکیاں یہاں نگاہوں کی تسکین کے کچھ تو ساماں تھے۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں کی تو دنیا ہی نرالی تھی۔ اور یہ نرالی دنیا اسے بہت ہی اچھی لگتی تھی۔

وہ اکثر اس دنیا کا اپنی دنیا سے موازنہ کیا کرتا تھا۔ ایک بات اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ اس نے ہمیشہ سنا تھا۔ کہ جوانی بذات خود حسن ہے۔ لیکن اس کا مشاہدہ اس بات کے برعکس جاتا تھا۔ نذیراں بھی تو جوان تھی۔ لیکن اس کی جوانی میں رستے کبھی حسن نظر نہ آیا تھا۔ میلی کچلی سی لڑکی..... حسن کا ایک ہاتھ ہمیشہ الجھے بالوں میں کھلی کرتا رہتا۔ جس کے قریب سے گزرتے ہوئے کھٹی لسی کی بدبو آتی تھی۔ اس کے برعکس ایکسین صاحب کی وہ مومی سی صاحبزادی، شمیم صاحب کی نرم و گداز قسم والی شاداب شاداب بیٹی..... خط تھیلے میں سے نکالنے کے بہانے وہ کئی بار حسن کے قرب سے محفوظ ہوا کرتا تھا۔ اسی لئے جب جامنی ہونٹوں اور گدلی گدلی آنکھوں والی نذیراں کے متعلق کچھ ماں نے دبے لفظوں میں رشتے کے لئے کہا تھا۔ تو وہ آتش زیر پاں سے الجھ پڑا تھا۔ کچھ اس بری طرح کہ ماں پریشان ہو گئی تھی۔ اور جب ذرا خود بھی ذہن کو ٹھکانے پہ لانے پر کامیاب ہوا تھا۔ تو شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ لیکن نذیراں اسے برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

نیا حلقہ اسے پسند آیا۔ وسیع و عریض کوٹھیوں کے مشرقی سمت پھیلے دو محلوں اور بڑی مارکیٹ سے لے کر مین بازار تک اسے ڈاک تقسیم کرنا ہوتی۔ قلقل تھپتھپ اگلتی عورتیں گل رنگ لڑکیاں اور گول منول خوبصورت لباسوں والے بچے دیکھنا اب روز کا معمول ہی تھا۔

”جوانی غریب کی ہو یا امیر کی..... سوچیں یکساں ہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی ان دنوں

جاگتے میں بڑے زعفرانی خواب دیکھنے لگا تھا۔ کئی دفعہ تو یوں بھی ہونے لگا کہ وہ اپنے خوابوں میں کھویا چلا جا رہا تھا۔ اور کئی مکانات اور دکانوں کی ڈاک تھیلے ہی میں پڑی یا ہاتھ میں پکڑی رہ گئی ہے۔ احساس ہونے پر اسے واپس چلنا پڑتا۔ اس کے ہونٹ متہتم ہو جاتے..... حسین حناقتوں پر اسے کبھی افسوس نہ ہوا۔

روز کا معمول اور راستہ ایک ہی تھا۔ بڑی مارکیٹ سے مین بازار وہاں سے کشادہ گلیوں والے دونوں محلے اور پھر جہازی سائز کوٹھیاں۔ وہ خراماں خراماں ڈاک بانٹتا فاصلے پٹنٹے چلا جاتا۔

لیکن

چند دنوں سے

وہ ایک عجیب و غریب بات نوٹ کر رہا تھا۔

اتنی عجیب کہ اس کی صداقت پر اسے یقین نہ آتا تھا۔

مین بازار سے جب وہ گلی نمبر ایک سے ہوتا دوسری گلی میں مڑتا۔ تو سبز کھڑکیوں دروازوں والا ایک دو منزلہ مکان دائیں ہاتھ پڑتا..... اس کے بیرونی دروازے پر موٹے سے کپڑے کا بے رنگ سا پردہ ہمیشہ لٹکتا رہتا تھا۔

پہلے تو اس نے کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن چند دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ پردے کی اوٹ سے ایک چہرہ جھانکتا ہے۔ آدھا چھپا آدھا کھلا چہرہ جس پر دو خوبصورت آنکھیں جچی تھیں۔

کئی دن وہ دیکھتا رہا۔ واقعی ایک خوبصورت چہرہ ہر روز پردے کی اوٹ میں ہوتا..... یوں جیسے سراپا انتظار ہو۔ انتظار کی ان کبھی کیفیت اس نے ان خوبصورت آنکھوں میں مچلتی محسوس کی۔

ایک حسین چہرہ اور وہ بھی سراپا انتظار۔ کئی دن تو اسے اس حقیقت کا یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ تھی.....

اب وہ خوب چوکنا ہو گیا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے سراپا پر نگاہ ضرور

آئیڈیل

ڈالتا..... ہاتھ آپوں آپ بالوں کو درست کرنے کے لئے سر تک پہنچ جاتے بش شرٹ کے بٹن بند کر لیتا۔ تھملا کندھے پر خوبصورتی سے لٹکاتا اور ہاتھوں میں خط لفافے رجسٹریاں بڑے سٹائل سے پکڑتا۔ ان دنوں اسے اپنی بوسیدہ وردی کا بری طرح احساس ہونے لگا تھا۔ سیکینہ کے کپڑوں سے پہلے اب وہ اپنی وردی بنوانے کا سوچ رہا تھا۔ ویسے ماں سے پتلون کے پائینچوں کی مرمت اس نے کروائی تھی۔ اور روزانہ استری کر کے وردی پہننا بھی معمول بنالیا تھا۔ ٹکڑ والے مکان سے سیکینہ لوہے کی استری مانگ لایا کرتی تھی۔ بانکا چھیل چھبلا تو تھا ہی اس پر سج دھج۔ ان دنوں اس پر خوب نکھار آیا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی شوخیاں۔ ہونٹوں پر مچلتا تبسم آسودگی کس طرح انگ انگ میں رچ بس گئی تھی۔

دن ہوتا یا رات اس کے ذہن میں وہ خوبصورت آنکھیں انتظار کی کیفیت لئے ابھرتی رہتیں۔

شک کی گنجائش نہ تھی نہ شبے کی۔ وہ آنکھیں ہمہ انتظار تھیں۔ وہ خاموشی سے اس دروازے کے قریب سے گزر جاتا۔ دل بے اختیار دھڑکنے لگتا۔ اس بات ہو شر با سے چند لمحے باتیں کرنے کی فطری خواہش بھی بیدار ہوتی۔ لیکن وہ ایسی جرأت کیسے کر لیتا۔ ہاں تقریب بہر ملاقات کے متعلق وہ سوچتا ضرور رہتا۔

”کاش اس گھر کا کوئی خط آجائے.....“ وہ دل میں سوچتا۔ پھر تو بات کرنے کا موقعہ نکل سکتا ہے۔ اس گھر کا نمبر نوٹ کیا ہوا تھا۔ اور صبح جب ڈاک تھیلے میں ڈالتا۔ تو تجسس سے لفافوں پر لکھے پتے پڑھنے لگتا۔

اس گھر کا کوئی خط نہ ہوتا..... مایوسی چھن بن جاتی۔ اور اس کا ذہن کوئی اور ترکیب سوچنے میں مصروف ہو جاتا۔

پندرہ بیس دن گزر گئے۔ ان پندرہ بیس دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ گیا جو بیس پردہ چھپی شگفتہ اور شاداب سی لڑکی کی آنکھوں میں اس نے انتظار کی ٹوٹی کیفیت محسوس نہ کی ہو..... اس کے گھر کے آگے سے خاموشی سے گزر جانے کے بعد کبھی کبھی وہ دل

آئیڈیل

کے ہاتھوں بے چین ہو کر مڑ کر دیکھتا۔ تو وہ حیران آنکھیں اسے ہی دیکھتی ہوتیں..... ان آنکھوں میں اب انتظار میں مایوسی بھی گھلی ہوتی.....

اس دن اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ ڈاک تھیلے میں ڈالتے ہوئے اس کی نظریں ایک بیرونی ملک سے آنے والے نیلے لفافے پر اٹک گئیں۔ بے تابی سے اس نے لفافہ الٹا پلٹا اسی گھر کا خط تھا۔ مکان نمبر ۱ اسے از یاد تھا۔ اور گلی بھی ذہن میں نقش تھی۔

کئی لمحے وہ نیلا لفافہ ہاتھ میں لئے بے پایاں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ اس کا دل بے اختیار اندھڑک رہا تھا۔ کچھ پالینے کی طمانیت کا احساس رگ و پے میں بھر رہا تھا۔

یہ نیلا لفافہ اس نے ساری ڈاک سے الگ کر لیا۔ بڑی احتیاط سے اسے جیب میں ڈالا..... اور باقی ڈاک دستور کے مطابق کچھ تھیلے میں ڈالی کچھ ہاتھ میں پکڑی۔ اور روزمرہ کی ڈیوٹی پر چل دیا۔

آج اس کے قدم کسی بدست شرابی کی طرح بہک رہے تھے۔ بازار کی کتنی دکانوں پر اس نے غلط ملط خط دے دیئے۔ خط الٹ پلٹ ہوئے۔ واپس لے کر صحیح جگہ پہنچائے۔ اپنی حماقت پر شرمندگی بھی ہوئی۔ لیکن یہ شرمندگی بھی گنگنا رہی تھی۔

اور

جب وہ ایک گلی سے ہوتا ہوا اس گلی میں آیا۔ تو اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ دل جانو خلق میں آ کر اٹک گیا تھا۔ جیب سے لفافہ نکالتے اس کے مضبوط ہاتھوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔

گلی مڑتے ہی اسے معمول کی طرح سراپا انتظار آنکھیں نظر آ گئیں..... اُف اس کا دل کس وحشیانہ بے تابی سے دھڑکنے لگا تھا۔ جانے کیسے قدم اٹھاتے وہ اس گھر کے سامنے آ گیا۔

نیلا لفافہ بڑی عقیدت اور بڑی محبت اور بڑے اشتیاق سے پس پردہ چہرے کی

طرف بڑھا دیا۔

”خط۔“ اک چیخ نما جوشیلی مسرت بھری آواز اس لڑکی کے حلق سے نکلی۔

”انتہائی بے صبر بے تاب سے وہ پردے کی اوٹ توڑ کر سامنے آ گئی.....

گلابی گلابی شاداب شاداب سی لڑکی.....

وہ مہبوت سا اسے تکتا رہ گیا۔

اور وہ اک چھپے سے خط اس کے ہاتھ سے لیتی و فور مسرت سے چلائی۔

”ماں! ماں! اُن کا خط ماں.....“

پاگل کر دینے والی خوشیوں کا احساس اس کے سراپا پر چھایا تھا۔ وہ خط لے کر اندر بھاگی.....

”اُن کا خط آ گیا ماں.....“ خط کو سینے سے لگائے ہوئے وہ خوشی سے رو دینے کو

تھی۔ ”اللہ کتنے انتظار کے بعد ملایہ خط۔ آنکھیں پتھر اگئی تھیں راہ تکتے.....“

وہ بہکتے بہکتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں سفید لمبل کا دوپٹہ سر پر ٹھیک

سے جہاتے اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”پگلی پڑھ تو سہی کیا لکھا ہے اس نے.....“

وہ لرزتے ہاتھوں سے خط کھول کر پڑھنے لگی۔

اک بار بھی تو اس نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اسے یوں لگا جیسے انتہائی بلندیوں سے وہ چکراتا ہوا نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ دھم

سے وہ نیچے گرے گا۔ اور اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی بھی کرچیاں

بکھر جائیں گی۔

اکیلا

وہ سردیوں کی بخ بستہ سی اندھیری رات تھی۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ چل رہے

تھے۔ درختوں کے سوکھے پتے جھڑک کر ہواؤں کے ریلے سے ادھر ادھر جا رہے تھے۔

جب کوئی زور کا ریلہ آتا تو شاں شاں کی آوازیں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں مل

کر کسی بین کا تاثر چھوڑ جاتیں۔ ماحول میں ویران سناٹوں کی گونج محسوس ہوتی۔ اور

اداسی کنار کی طرح روح کے اندر بڑے مبہم طریق سے اترنے لگی۔

وہ اپنے پلنگ پر رضائی میں دبکا پڑا تھا۔ نظام دین نے رضائی کے اوپر کبیل بھی

ڈال دیا تھا۔ جانتا تھا۔ بوڑھے جسم کو اس شدید ترین سردی سے بچانے کے لئے ایک

رضائی ناکافی ہے۔ آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل کر راکھ زدہ انگاروں میں

بدل چکی تھیں۔ غسل خانے کی بتی روشن تھی۔ اور ادھ کھلے دروازے سے روشنی کی موٹی

سی لکیر کمرے کی تاریکی کو معتدل بنا رہی تھی۔ نظام دودھ کا گلاس بھی پلنگ کے قریب

پڑی چھوٹی سی میز پر رکھ گیا تھا۔ لیکن اس نے دودھ پیا نہیں تھا۔ نظام کی ساری

ہمدردانہ توجہ کے باوجود اپنے اکیلے پن کے احساس پر قابو نہ پا رہا تھا۔ اس کو اپنا آپ

سردیوں کی اس بخ بستہ رات کی طرح لگ رہا تھا۔ جو اندھیری تھی۔ بوجھل ہواؤں کے

جھکڑ اور سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے اپنے اندر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کتنا اکیلا تھا۔

ٹہنائی خاردار جھاڑیوں کی طرح اس کے اندر اُگ رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ بڑھ رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے کروٹ بدلی۔ رضائی میں لپٹا سر باہر نکالا۔ ہوا کے دباؤ سے کواڑ بار بار بج رہے تھے۔ کمرے میں لگجاسا اندھیرا تھا۔ اور اس کے برابر کا پلنگ خالی پڑا تھا۔

یہ پلنگ مریم کا تھا۔

مریم۔ جس کے ساتھ اس نے زندگی کے چالیس طویل سال بڑے بھرپور انداز میں گزارے تھے۔ اور جس کی زندگی میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کہ وہ مرکز اس کا من یوں خالی کر جائے گی۔

اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس پلنگ کو ٹولا۔ یہ پلنگ خالی تھا۔ لیکن اس خالی پلنگ سے کتنی بھری بھری یادیں وابستہ تھیں۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ رضائی سے نکالا۔ اور مریم کے خالی بستر پر یوں پھیرنے لگا۔ جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

اس بستر پر یادوں کے انبار تھے۔ ایک ایک سلوٹ یادوں کا ڈھیر تھی۔ یہ بستر چالیس برسوں سے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کمرے بدلے تھے۔ ترتیب بدلی تھی۔ لیکن یہ بستر اس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ یہ بستر اس کی چھوٹی سی دنیا تھی..... یہ دنیا..... کس خوبصورتی سے آباد ہوئی تھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں اس آبادی کا تصور آج بھی جوان تھا۔ مچھلی کی طرح پھسلتی۔ چکنی مٹی کی نرم نرم مورت۔ صندلی رنگت اور سیاہ چمکتی آنکھیں مریم جب اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ تو اس نے اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان جانا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں بہار کی دلکشی اور رنگینی بن کر داخل ہوئی تھی۔ وہ دن کتنے جاندار تھے۔ رفاقتوں چاہتوں سے بھرپور دن۔ رنگ رنگ سے خوشیوں کے سوتے اُبلتے تھے۔ سینے میں میٹھے میٹھے درد کا احساس ہمہ وقت رہتا تھا۔ چند دنوں کے لئے بھی وہ میکے جاتی تو زندگی خالی خالی محسوس ہوتی.....

لیکن..... گھبرا کر اس نے کروٹ بدلی۔ ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا۔ باہر جھکڑ آندھی کا روپ دھار رہے تھے۔ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بڑھ رہی تھی۔ اور شاں شاں کی

آوازیں شدت اختیار کر رہی تھیں۔

اس نے سوچا..... جب کی خالی زندگی اب کی خالی زندگی سے کتنی مختلف تھی۔ اس خالی پن میں ملن کی آس کا سند رہن ہوتا تھا۔ اور اس خالی پن میں کرب و اذیت کے سوا کچھ نہیں.....

آنکھیں بند کئے چپ پڑا وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا..... مریم کی زندگی کے آخری تین سالوں کا کرب اس کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں میں بھرنے لگا۔ مفلوجی کے تین سال اس نے اس بستر پر گزارے تھے۔ ان دنوں وہ گم صم رہتی تھی۔ ہائے ہائے کے سوا بہت کم الفاظ اس کے ہونٹوں پر آتے۔ اپنے آپ سے بیزار محتاج مریم بیکار سی شے تھی۔ جو اس بستر پر پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی اس بیکار شے سے اکتا جاتا تھا۔ لیکن بیکار شے ہونے کے باوجود بھی اس کے وجود کا اپنا ہی مقام تھا۔ تنہائی کا دکھ اور اکیلے پن کا کرب اس کے ہوتے ہوئے تو کبھی نہ جھیلا تھا۔

اس نے اپنے ناتواں وجود کو بڑی شعوری کوشش سے اٹھایا۔ پلنگ کے چوبلی تکیے سے سر ہانڈا کر پشت اس سے لگاتے ہوئے رضائی سینے تک کر لی۔

آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ جھکڑوں کے شور اسے اپنے اندر محسوس ہو رہے تھے۔ مریم کو مرے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں بچے چالیسویں کے بعد گئے تھے۔

ان کے ہوتے ہوئے مریم کی کمی اور اکیلے پن کا احساس اتنی شدت سے نہ جاگا تھا۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی مع آل اولاد کے حویلی میں مقیم تھے۔ ہر وقت مریم ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ بیٹے دلگیر تھے۔ بہوئیں آنسو بہا رہی تھیں۔ اور بیٹی تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ بچے بھی نانی اور دادی اماں کی شفقتیں یاد کرتے تھے۔ تو اسے مریم کے چھڑنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ سب اس کے دکھ کے شریک تھے۔ غم مشترک تھا۔ جدائی میں سب کی سانجھ تھی۔ پھر بھلا اسے اکیلے پن کا اتنی شدت سے احساس کیونکر ہوتا۔

اس کے پانچوں بچوں کو اس کا کتنا احساس تھا۔ وہ اسے یوں بہلاتے تھے۔ جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ کتنے ہی دن اس کے بیٹے اس کمرے میں اس کے ساتھ سوتے رہے تھے۔ جب تک اسے نیند نہ آ جاتی۔ وہ ماں کی باتیں کرتے رہتے۔ بہوئیں بھی اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھیں۔ گھر میں تین تین نوکروں کی موجودگی میں اس کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ کوئی اس کے کپڑے تہہ کر رہی ہے۔ تو کوئی حقہ تازہ کر رہی ہے۔ کوئی کھانے میں پسند کا پوچھ رہی ہے۔

اور اس کی بیٹی..... کتنے دکھ سے روتی تھی باپ کے گلے لگ لگ کر۔ چالیسویں کے بعد جب وہ اپنے گھر جانے لگی تھی۔ تو پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور اسے ایک گونا اطمینان مل رہا تھا۔ کہ مریم کا غم سننے میں وہ اکیلا نہیں..... اس کے بچے اس غم کو بانٹ رہے ہیں۔ یوں غم کا بوجھ کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔

”میں اکیلا نہیں ہوں..... میں اکیلا نہیں ہوں۔“ اس نے سر کو ادھر ادھر ہلکے ہلکے جھٹکے دیتے ہوئے مستحکم آواز میں کہا۔ ”میرے بیٹے، میری بیٹی۔ میرے آٹھ پوتے، پوتیاں، میرا داماد..... سائنہ نمی اور گلو..... ان سب کے ہوتے ہوئے میں اکیلا نہیں ہوں..... یہ..... یہ سب میرے اور مریم کے وجود کے حصے ہیں۔ اداسی کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں ان سب میں بٹ کر بکھر گیا ہوں۔ میں ان سب کو اکٹھا کروں گا۔ اپنے وجود اپنے جسم اور اپنی شخصیت کے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کروں گا۔ ان کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنا حماقت ہی ہے۔ مریم ان سب کے وجودوں میں زندہ ہے۔“

خیالات کے اس پلٹے پر اس نے اپنی روح میں تازگی اترتی محسوس کی۔ سوچ کا انداز بدل جانے سے اسے سکون مل گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پلنگ میں نیچے ہوتا گیا اس کی آنکھوں میں نیند اترتی گئی۔

اور پھر جھکڑوں..... سوکھے پتوں اور شاں شاں کی آوازوں سے بے خبر ہو کر سو گیا۔

ان کے ہوتے ہوئے دکھ کا احساس اتنا شدید نہیں تھا۔ مریم کی موت نے تو ان سب کو اس کے بہت قریب کر دیا تھا۔ تین بیٹے ایک بیٹی اور ان کے چودہ پندرہ بچے۔ حویلی میں کتنی گہما گہمی تھی۔ اور پھر سب اس کا خیال بھی کتنا رکھتے تھے۔ سہارا دے کر کمرے سے باہر لاتے۔ بیٹھنے کے لئے لپک کر کرسی پیش کرتے..... کھانے کا خیال رکھتے۔ دل بہلانے کا سامان کرتے۔ بعض اوقات تو اسے یوں لگتا جیسے وہ چھوٹا بچہ ہے۔ جو شفقت مادری سے محروم ہو گیا ہے۔ اور سب اس شفقت کا مداوا کر رہے ہیں۔

اس کا جی چاہا۔ کہ سب پھر یہاں اکٹھے ہو جائیں۔ مریم کے ہونے اور نہ ہونے کی باتیں کریں۔ اس کے اندر خاردار جھاڑیوں کی طرح پھیلنے والی تنہائی کو کاٹ پھینکیں اس کی اداسی کو دور کر دیں۔ اس کی ذات میں پورے خلوص سے جھانکیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے بچے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود کتنے سعادت مند ہیں۔ ہر بیٹے نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کس شدت سے کی تھی۔ لیکن وہ اپنا نشیمن چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بھرا پر اگھر تھا۔ اس کی ذاتی چیزیں تھیں..... بہوؤں کے فالتو سامان سے کمرے پٹے پڑے تھے۔ سب کو نوکروں کے حوالے کیسے کر سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ کہ اس کے گھر کے درو دیوار اپنے تھے..... فضا اپنی تھی..... ماحول اپنا تھا۔ یہاں اس نے زندگی کے کتنے بھرپور دن گزارے تھے۔ وہ بیٹوں کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا۔

”لیکن یادوں سے لپٹ لپٹ کر کئی ماہ گزار کر اس کے اندر سونے پن سے ویرانی ہونے لگی تھی۔ کاش مریم نہ ہوتی..... یا وہ ہی اس کا ساتھ دے سکتا۔ مریم کے ساتھ دکھ سکھ کے ایام کس آسودگی سے گزارے تھا۔

اپنا ناتواں سا سوکھا ہوا ہاتھ اس نے اپنے جھریوں زدہ چہرے پر پھیرا۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے۔ بڑھاپے کا اندوہناک احساس اسے اندر ہی اندر دہلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا اپنا وجود لہرا گیا۔ تو مند..... جوان اور آرزوؤں سے بھرپور خوبصورت وجود..... مومی سی مریم..... خوبصورت بچے.....

آئیڈیل

اور مصروف زندگی..... اور اب..... وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ مریم کی بیماری کے آخری تین سالوں میں اس کی جو ہیئت تبدیل ہو گئی تھی۔ سب اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

اور اس کا دل دکھنے لگا۔ قدرت کی حسین ترین تخلیق کا اتنا بد صورت انجام۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کئی لمحے یوں ہی پڑا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ اپنے سب بچوں کو بلا بھیجے گا۔ حویلی میں سب اکٹھے ہوں گے۔ رونق ہلچل اور گہما گہمی ہوگی..... اس کے بچے اس کا تنہائی کا کرب بانٹ لیں گے۔ وہ تنہا نہیں رہے گا سب! سب! اس کے پاس ہوں گے۔ وہ پریشان اسی لئے ہے۔ کہ اپنوں سے کٹ گیا ہے۔ کئی ماہ سے کٹا ہوا ہے..... اس کے مونٹس و نمگسار بچے آ جائیں گے۔ تو اکیلے پن کی ویرانی خود بخود ختم ہو جائے گی..... وہ اتنا پیار دیں گے۔ کہ بڑھاپے کی بد صورتی اور تنہائی کا احساس حرف کی طرح مٹ جائے گا۔

سوچوں کے اس انداز نے اسے سکون بخشا۔ اور وہ بستر میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا جلد ہی نیند نے آیا۔

صبح اس نے پہلا کام اپنے بیٹوں اور بیٹی کو خط لکھنے کا کیا۔ عید قریب آرہی تھی۔ اس نے سب کو یہ عید حویلی میں منانے کا تاکید ا لکھا۔ پوتے پوتیوں کو اسے، ونواسیوں کو اصرار سے بلایا.....

گہما گہمی کے تصور ہی سے اسے سکون ملا۔ وہ اب ان سب کی آمد پر حویلی میں رچ بس جانے والی رونق ہی کا سوچتا رہتا۔ اس کے بچے اسے پیار کرتے تھے۔ عزت و احترام کرتے تھے۔ اس کے دکھ میں سانجھ تھی۔ اس کے غم کے شریک تھے۔

ہفتہ بھر پہلے اس نے حویلی کی صفائی کروائی۔ کمرے ٹھیک کروائے۔ ضرورت کی چیزیں ان کمروں میں رکھوائیں..... بڑی بہو ہمیشہ اوپر والے کمرے میں ٹھہرا کرتی تھی۔ منجھلی نیچے والے بیرونی کمرے میں۔ اور چھوٹی بائیں کے کمرے میں۔ اس کی بیٹی ہمیشہ اس کی اپنی خوابگاہ کے دائیں ہاتھ والے بڑے کمرے میں قیام کرتی تھی۔ جس طرح مریم ان سب کی آمد پر تیاری کیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے بھی سب کچھ

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے کسی کی کو بھی محسوس کریں۔

ان دنوں مریم اسے بے طرح یاد آتی۔ اپنا آپ کھوکھلا کھوکھلا لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے تصویر کائنات میں رنگ محض مریم ہی کے دم سے تھا۔ اپنی بھرپور زندگی کے چالیس سالوں کے کئی عکس اس کے ذہن میں لہرا لہرا گئے۔ ہر آن ہر لمحہ اسے یہی محسوس ہوا۔ کہ مریم کی رفاقت سے ٹوٹ کر وہ اس بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔

لیکن

اس نے بڑی سختی سے ہر اس آن اور اس لمحے کو کچل دیا۔ اتنے بھرے پرے کنبے میں اپنے آپ کو اکیلا سمجھنے کی حماقت اب وہ کبھی نہیں کرے گا۔

عید سے دو دن پہلے بھی آن پہنچے۔ کوئی صبح کی گاڑی سے آیا۔ اور کوئی دوپہر کی سے..... بڑا بیٹا نوبے کی فلائیٹ سے پہنچا۔ اور بیٹی اپنی گاڑی میں شام کو آ گئی۔ حویلی میں جیسے بہار آ گئی۔ چھوٹے بڑے چودہ پندرہ بچے۔ بیٹی بیٹے بہوئیں اور داماد و نقیں آباد ہو گئیں۔ بیٹے تپاک سے ملے۔ بہوئیں احترام سے پیش آئیں۔ بیٹی گلے لگ کر سکی..... بچے دادا ابا اور نانا ابا پکارتے ہوئے لپٹ گئے۔

خوشی کی لہریں اسے اپنے وجود میں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ ان انباطی لحوں نے اس کے سونے پن میں اکیلے پن کے جاگتے احساس کو یکسر ختم کر دیا۔ مریم کی بھی کتنی ہی باتیں ہوئیں۔ بیٹوں کی سرد آہیں۔ اور بیٹی کے بہتے آنسوؤں نے ماں کی یاد کو تازہ کر دیا.....

لیکن جلد ہی موضوع بدل گیا۔ سب بہن بھائی ایک عرصے کے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا جانے لگا۔

اور پھر

احوال پرسی کا سلسلہ اس طرح چلا کہ سب ایک دوسرے میں کھو گئے اسے یوں نظر انداز کر دیا گیا۔ جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں۔ اسے اپنے اندر ہی اندر دکھ قطرہ قطرہ ٹپکتا محسوس ہوا۔ لیکن اس نے اپنے اس دکھ پر قابو پا لیا۔ ان سب کی باتوں میں خود بھی حصہ

آئیڈیل

لینے لگا۔ کسی بات پر ہنس پڑا۔ کسی کی پشت پر تھپکا دیا۔ کسی کو ٹوکا کسی کو پیار سے دو بول کہے۔ وہ سب آپس میں ہی لگے رہے۔ گلے شکوے باتیں ہنسی مذاق سبھی کچھ ہوا۔

پھر اس کی بہوئیں اپنے اپنے کمروں میں سامان وغیرہ ترتیب سے لگانے چلی گئیں۔ بچے کمروں میں صحن میں ٹکھر گئے۔ بیٹی اور داماد بازار چلے گئے دونوں بیٹے اپنے دوستوں سے ملنے چل دیئے۔ اور بڑا بیٹا اخبار لے کر وہیں قالین پر لیٹ گیا۔

وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ اس نے بیٹے سے دو ایک باتیں کی تھیں۔ وہ اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ ہوں ہاں کے سوا کچھ نہ کہا۔

تنہائی کی کاٹ کاٹنے کو اس نے بچوں کو پکارا۔ چھوٹے بچے تو کھیل میں مصروف تھے۔ متوجہ نہ ہوئے۔ گلو اس کے پاس آ گیا۔ اور سب گلو کے بلانے پر آ گئی۔

وہ ان سے ان کی پڑھائی اور سکول کی باتیں کرنے لگا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔“

”سکول کیسا ہے۔“

”کیا بننے کا ارادہ ہے۔“

دونوں بڑی سعادت مندی سے جواب دیتے رہے۔ وہ انہیں دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کرنے لگا۔ نصیحتوں کو بور سمجھتے ہوئے گلو اور سب بیٹی بیٹی لگا ہوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے مسکرانے لگے۔ وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی بوڑھی جہاندیدہ نظروں نے نا تجربہ کار بچگانہ نظروں کی عیاری بھانپ لی۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ بچو..... اپنے اپنے کمرے ٹھیک کر لو جا کر.....“

”بہت اچھا دادا ابا۔“ کہتے ہوئے دونوں برابر والے کمرے میں گھس گئے۔

”کوئی بات نہیں بچے ہی تو ہیں.....“ اس نے اپنے من سے اٹھنے والی تنہائی کی گونج کو دبانے کی کوشش کی.....“

آئیڈیل

رات کھانے کے کمرے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ میز پر سب تو پورے نہ آ سکتے تھے۔ کوئی کھڑا تھا کوئی بیٹھا۔ کسی نے مونڈھا گھسیٹ لیا تھا۔ کوئی سائیڈ ٹیبل پر چڑھ بیٹھا تھا۔ ہنسیوں قہقہوں کی کھٹکناہٹ پلیٹوں چپوں کی آوازوں میں مدغم ہو رہی تھی۔

”بڑے دنوں سے اکٹھا ہونے کو جی چاہ رہا تھا۔“

”خدا قسم خود میرا دل بھی چاہتا تھا.....“

”ابا جی نہ بلاتے تو میں خود سب کو گھر آنے کا لکھنے کا سوچ رہا تھا۔“

”سال میں دو بار ایسا اجتماع ضرور ہونا چاہیے۔“

”اور کیا..... یہ نہ ہوا۔ تو سب ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے۔“

”آئندہ پروگرام ہی ایسا بنایا کریں گے۔ آگے پیچھے چھٹیاں لینے سے لطف نہیں

آئے گا..... ایک ایک ہفتے کی چھٹی کی بجائے مہینہ مہینہ چھٹی لینی چاہیے تھی.....“

”آئندہ سہی“

”بہت ضروری ہے“

”ہاں تو..... ورنہ ہمارے بچے ایک دوسرے سے اجنبی ہو جائیں گے۔“

”بالکل بالکل..... اسی لئے تو کہتا ہوں۔ سال میں کم از کم دو دفعہ سب اکٹھے ہوا

کریں۔“

کھانے کے دوران ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سب کی باتوں سے متفق ہو کر

سراشات میں ہلاتا رہا۔ ہاں اس کا دل چاہتا رہا۔ کہ سب یہ بھی کہیں۔ کہ ابا جی کی خاطر

سب سال میں دو بار اکٹھے ہوا کریں گے۔

رات سبھی کمرے میں جمع تھے۔ ایک کونے میں ٹی وی پڑا تھا۔ اور بچے بڑے

انہماک سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اس کی بہوئیں اور بیٹی ٹی وی سے بے نیاز اپنی

باتوں ہی میں گم تھیں۔ دبے دبے قہقہے تھے۔ دلچسپ سرگوشیاں تھیں۔ راز و نیاز کی

باتیں تھیں۔ دونوں بیٹے گاؤ تکیوں کے سہارے اپنی ملازمتوں اور رکی ہوئی ترقیوں کی

باتیں کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا اور داماد ماحول سے بے نیاز ملکی سیاست پر بحث کر رہے

اسے کوئی اپنے کمرے میں بیٹھنے کے لئے بلانے بھی نہ آیا۔ یوں جیسے وہ بڑی ہی غیر اہم شے ہے۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ہو۔ وہ خود ہی اٹھ کر چلا گیا۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والے دکھ کو پھیلنے سے روکنے کا یہی طریق تھا نا۔

”آئیے ابا جی..... ہم سمجھے آپ سو گئے، بڑے بیٹے نے گدے پر ٹھیک سے تکیہ رکھتے ہوئے ان کے لئے جگہ بنائی۔ بہوئیں اور بیٹی چند لمحے چپ ہو گئیں۔“
”آپ آرام ہی کرتے تو اچھا تھا۔“ بڑی بہو نے عقیدت سے کہا۔
”ہاں ابا جی..... صبح سے آپ چل پھر رہے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔“ بیٹی نے کہا۔

”ٹی وی بند کر دوں۔“ چھوٹا بیٹا بولا۔

”نہیں نہیں۔“ بچوں نے دادا ابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شور مچا دیا۔

”دیکھو بھی دیکھو۔“ وہ بڑے بیٹے کے قریب گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ دو چار منٹ سب اس کی طرف متوجہ رہے۔ سرسری سی گفتگو اور پھر سب اپنی اپنی باتوں میں کھو گئے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا..... کبھی ٹی وی پر نگاہ ڈالی کبھی اپنے گرد و پیش۔
”مومی، اکتا کر اس نے آٹھ سالہ پوتی کو پکارا۔

”جی دادا ابا۔“ وہ الٹی لیٹی اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کوئی بڑا جاذب نظر اشتہار تھا۔

وہ چند لمحے کچھ نہیں بولا۔ پھر اس نے شوکی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی.....

”ٹھہریے نا دادا ابا.....“ اس نے بازو تختی سے چھڑا لیا۔ شوکی شوق سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

اس نے جس بچے کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا۔ وہ کسمسا کر ٹی وی میں گم ہو رہا۔ چھوٹی بہو نے دو تین بچوں کو دھیرے دھیرے ڈانٹا بھی..... لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔

وہ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھا اپنے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ سے گھبراتا رہا.....
پھر

شاید

اسے اونگھ آ گئی۔

”ابا جی۔ پلنگ پر چل کر سویئے۔“ بیٹے نے اس کا کندھا ہلایا۔

”چلیئے میں چھوڑ آؤں۔“ بیٹی بولی۔

”تکان سے طبیعت خراب نہ ہو جائے.....“ دوسرا بیٹا بولا۔

”یہاں شور بھی تو بہت ہو رہا ہے.....“ بہو نے کہا۔

”اٹھیئے۔ جائیئے.....“ وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں یہی الفاظ اتر رہے

تھے۔ ان الفاظ میں احترام کی ملاامت تھی۔

وہ نہیں اٹھا..... کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔“ کہتے ہوئے وہ اپنے کرب کو

چھپاتا رہا..... وہ تو ان سب سے گھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی تنہائیوں کو مٹانا چاہتا

تھا۔ ادا سیوں کو نوچ پھینکنا چاہتا تھا۔ آسودگی..... ذہن آسودگی کا خواہاں تھا۔

لیکن کوئی اس کے اندر نہیں جھانک رہا تھا.....

اور جب کئی بار سب کے کہنے کے باوجود بھی وہ نہ اٹھا۔ تو اس نے لہجے کا فرق

صاف طور پر محسوس کیا۔ ابا ”اٹھیئے اور سو جائیئے جا کر.....“ کہنے میں احترام کی ملاامت

کی جگہ غیر محسوس سا کھچاؤ بھی تھا..... وہ کھچاؤ جو کسی ضدی بچے کو ایک ہی بات بار بار

کہنے سے اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے.....

وہ چپکے سے اٹھا..... اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

جب وہ بستر پر لیٹا تو انتہائی بے چین تھا۔

آج جھکڑ چل رہے تھے۔ نہ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ کواڑ بھی نہیں بج

رہے تھے۔ اور شاں شاں کرتی آوازیں بھی نہ تھیں۔ بڑے کمرے میں بہوؤں بیٹی اور

بیٹوں کے چپھانے ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کسی من پسند پروگرام پر بچے

کھلکھلا کر ہنس بھی رہے تھے۔ شور و غل مچا رہے تھے۔ تالیاں بھی پیٹتے تھے۔

لیکن

ان سب باتوں کے باوجود۔ گہما گہمی اور رونق کے باوجود تنہائی کا احساس اسے ڈس رہا تھا۔ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ اداسی کی کٹار اس کے اندر اتر رہی تھی۔ سنائے گونج رہے تھے۔ اور اکیلے پن کا کرب پوری وحشت سے اسے نگل رہا تھا۔

مریم کے خالی بستر پر اپنا ناتواں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑے درد سے سسک

اٹھا.....

”مریم..... میں کتنا اکیلا ہوں..... کتنا اکیلا.....“

☆☆☆



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

خواب گاہ پر آج معمول والی غنودگی طاری نہیں تھی۔ شب بھر کی پوری پوری بیداری کا سماں تھا۔ رنگ و نور کا سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ فضا میں خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔ ہر چیز جگمگا رہی تھی۔ درودیوار سے قہقہے پھوٹے محسوس ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا زندگی کروٹ لے کر جاگ اٹھی ہے۔

آج خواب گاہ جملہ عروسی تھی۔ جو کنواریوں کے خوابناک تصوروں کی طرح بجی ہوئی تھی۔ باذوق ذہنوں اور مشاق ہاتھوں کی کارکردگی اک اک شے سے عیاں تھی۔ رنگ برنگی کاغذی اور قدرتی پھولوں کی جھالروں میں گھری تیج پر وہ زنگار گھڑی بنی بیٹھی تھی۔ نرم و گداز بیڈ پر چمکیلا سرخ بستر اتنا ملائم اور پھسلنا تھا۔ کہ احساس میں گدگدائیں بلا تحریک ہی پیدا ہو سکتی تھیں۔

لیکن

مونا بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ کسی جاندار شے سے کہیں زیادہ اس پر اطمینان و کم خواب اور سونے چاندی کے ڈھیر کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے سینے میں کوئی دلاویز گھبراہٹ نہیں مچل رہی تھی۔ نہ ہی دل آنے والے لمحوں کے سرور سے بہک کر اپنی رفتار بھول رہا تھا۔ وہ تو اس پرندے کی طرح تھی۔ جو پھڑ پھڑا کر بے بس ہو جاتا ہے۔ اور بے دم ہو کر پڑا رہتا ہے۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی بے قراریوں کو

قرار آ گیا ہے۔ اس نے حالات سے مصالحت کر کے سپر ڈال دی ہے۔ اس نے بے بسی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

مونا آج دلہن بنی تھی۔ بھاری کم خواب کے غرارے پر تنگ سی چولی میں اس کا شباب پھٹا پڑتا تھا۔ نئے اور پرانے زیورات اس پر لاد دیئے گئے تھے۔ بیوٹی کلینک سے آئی ہوئی نئے دور کی مشاطہ نے اس کا سنگھار اس انداز سے کیا تھا۔ کہ وہ قاتل حسینہ کا روپ دھار گئی تھی حالانکہ وہ صرف اچھے نقش ونگار کی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا بنا کر موسمی پھولوں کی کلیاں اس میں پرو دی تھیں۔ اس کی پیشانی پر تارے چکائے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں پر مصنوعی پلکوں کی خوبصورت جھالیں گرائی تھیں۔ ہونٹوں پر لپ سنک اس طرح سجائی تھی۔ کہ وہ رس سے بھری پھانکیں بن گئے تھے۔ اتنے ریلے اور ایسے کشش انگیز کہ انہیں دیکھتے ہی جذبات لبالب بھرے پیمانے کی طرح چھلک جائیں۔

لیکن ان ساری محنتوں اور مشقتوں کے باوجود مونا کے دل میں کوئی نیا احساس نہیں جاگا تھا۔ محسوسات پر ایک تنہا بستی ٹھنڈک چھائی تھی۔ اور دل و دماغ کھرے کی پلیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ اس کے نصیب پر اس کی ہم عمر لڑکیاں رشک کر رہی تھیں۔ کئی تو حسد کی پلیٹ میں آ گئی تھیں۔ نصیب قابل رشک ہی تو تھا۔ بے شک وہ بھی کرنل کی بیٹی تھی۔ لیکن عادل کی لاکھوں کی بزنس کے سامنے محدود تنخواہ کی کیا وقعت۔ ماں باپ نازاں تھے۔ عزیز واقارب خوش۔ بیاہی اور بن بیاہی سہیلیاں رشک و حسد کے ملے جلے جذبات لئے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

مونا نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ گھٹن اور جس کا احساس جان لیوا ہوا جا رہا تھا۔ بھاری کندن کا گلو بند اسے گردن پر شکنجے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا اسے نوچ کر اتار دے۔ اس نے ہاتھ گلے کی طرف بڑھایا۔ لیکن گلو بند نوچ نہ سکی۔ اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھا۔ جگمگ کرتی ڈائمنڈ کی انگوٹھی۔ کھٹکھٹاتی چھوڑیاں بازو بند..... کلائی بند..... اسے یوں لگا جیسے سونے کے خول میں لپٹی ہوئی ہو۔

اس نے دھیر دھیر گردن گھمائی۔ سچے سجائے کشادہ کمرے پر نگاہ ڈالی۔ اپنے شوہر کی امارت کا احساس ہر چیز سے ہوا۔ لیکن خوشی و مسرت کی کوئی انجان لہر اسے چھو نہ سکی۔ اسے یہ کشادہ آراستہ اور پیراستہ کمرہ قدیم مصری عالی شان مقبرے کی طرح لگا۔ اور اپنا وجود فرعونی دور میں کوئی حنوط شدہ لاش محسوس ہوا۔

گھبرا کر اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ ایسے انداز کی منفی اور تخریبی سوچیں ذہن سے نکال دینے کا اس نے عزم کیا تھا۔ پر چھائیاں کب پکڑی جاسکتی ہیں۔ ہیولے کب ہاتھ آتے ہیں۔ ایسی حقیقت کو اس نے مان لیا تھا۔ اس لئے تو اس نے ماں باپ کے اصرار پر سر جھکا لیا تھا۔ اور آج دلہن بن کر عادل کے جملہ عروسی پر آ گئی تھی۔

حقیقت کو حقیقت مان لینے کے باوجود وہ بے چین تھی بے کل تھی۔ اس کے کانوں میں مسلسل آواز گونج رہی تھی۔ ”مونا میری دلہن ہے۔“

یہ آواز سولہ سترہ سالوں کے اس پار سے آرہی تھی۔ یہ آواز اس پار جم نہیں گئی تھی۔ یہ تو متواتر اس کا تعاقب کرتی آرہی تھی۔ ہر آن ہر لمحے اس آواز کی ملائمت شیرینی اور گھمبیرتا کو اس نے محسوس کیا تھا۔ یہ آواز مونا کے اندر احساس کی شمعیں جلاتی رہی تھی۔ انتظار اور تلاش کے دیے اسی احساس سے لودے رہے تھے۔ شادی اک پھونک تھی۔ جوان دلوں کو بجھا سکتی تھی۔ لیکن خیالوں میں بے دلوں کی طرح جلتے لوگ کب ان پھونکوں سے مر سکتے ہیں۔

وہ ان دنوں چار پانچ سال کی تھی۔ کہ برابر والے بنگلے میں کوئی نئے کیپٹن آ گئے اسے اپنی امی اور ابو کی طرح یہ خوشی نہ تھی۔ کہ کوئی انتہائی ملنسار اور شگفتہ مزاج جوڑا ان کی ہمسائیگی میں آن بسا ہے۔ اسے تو صرف اس بات کی خوشی تھی کہ ناصی اور مومی آ گئے ہیں جن کے ساتھ کھیلنے کی اسے ہمہ وقت اجازت تھی۔

یوں تو پچھلے بنگلے میں پوچھا۔ آئی تھی۔ دائیں ہاتھ رہنے والی شیربانو اور شہباز خان تھے۔ سڑک کے پار والے بنگلے میں سکھ بھی رہتا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ لیکن مونا کی خوشیوں کا مرکز تو ناصی کی ذات میں سمٹ گیا تھا۔ اور ناصی بھی تو مونا

ہی کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ صبح و شام دونوں اکٹھے نظر آتے۔ کبھی چمن میں کبھی بنگلے کے پچھواڑے۔ کبھی آئیڈیل کے گھر تو کبھی سامنے والے بنگلے میں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے گھومتے پھرتے۔ ناصی سکول جاتا۔ تو مونا اس کے ساتھ جانے کی ضد کرتی۔ پھر وہ بھی سکول داخل ہو گئی۔ ناصی اور مونا کا ساتھ اب ٹوٹ گیا۔ جانے سوتے وقت وہ کیسے اپنے اپنے گھروں میں رہتے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی ایک دوسرے کو دیکھنے کی شعوری خواہش ہوتی۔ کبھی مونا ان کے گھر آ جاتی اور کبھی ناصی مونا کے گھر۔

دونوں کے معمولات کی یکسانیت سے اکثر ان کی مائیں تنگ بھی آ جاتیں۔ کڑکتے جاڑوں میں جب منجھدی ہوائیں چلا کرتیں۔ بند کمروں کو آتش دانوں میں جلنے والی آگ سے گرم رکھا جاتا۔ ان کا یوں بستروں سے نکل باہر بھاگنا مضر بھی ہوتا اور تکلیف دہ بھی۔ لیکن انہیں روک لینا کسی کے بس میں نہ ہوتا۔ مائیں جھڑکتیں اور تھپڑ بھی لگاتیں، سزائیں بھی دیتیں۔ لیکن وہ تو کسی مقناطیسی کشش سے کھینچے چلے جاتے۔ سردی کی پرواہ نہ گرمی کی۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے۔ کبھی بے معنی دوڑیں لگ رہی ہیں۔ کبھی تتلیاں پکڑی جا رہی ہیں۔ کبھی چڑیوں کے گھونسلے اتارنے کی سکیم ہے۔ کبھی اکٹھے بیٹھے بیر بیروں سے توڑنے کی۔ کبھی شادی شادی کھیلنے کی۔

ان کے اور ساتھی بھی ان کھیلوں میں شریک ہوتے۔ بھنگن کے بچوں سے لے کر آس پاس رہنے والے افسروں کے بھی بچے شادی کے کھیل میں شریک ہوتے۔ لیکن ہمیشہ دولہا ناصی بنتا اور دلہن مونا۔

شادی کا کھیل بڑے اہتمام سے کھیلا جاتا۔ گھر بنتے۔ کبھی پچھواڑے کبھی چمن میں تو کبھی کھانے کی میزوں تلے۔ ڈرائیگ روموں میں بھی اور سونے کے کمروں میں بھی سبھی جگہ یہ کھیل کھیلا جاتا۔ گھروں سے بستروں کی چادریں گھسیٹی جاتیں۔ ماؤں کے رنگ دار روپے لائے جاتے۔ لپ اسٹیکس اور پاؤڈر چرائے جاتے۔ گوٹے تلے کے پرانے ہار اکٹھے کئے جاتے۔ پھول توڑے جاتے۔ ٹافیاں بسکٹ اور فرج میں رکھی کھانے پینے کی چیزیں اڑائی جاتیں۔ پھر کہیں جا کر شادی کا ہنگامہ ہوتا۔

مونا کو رنگین دوپٹے گھگھرے بنا کر پہنائے جاتے۔ سر پر لال دوپٹہ اوڑھایا جاتا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں اسے سنگار کرتیں۔ لپ اسٹیک اور پاؤڈر کا بے دریغ استعمال ہوتا۔ آئیڈیل سے آنکھیں خوفناک حد تک کالی کر دی جاتیں۔ پھر گوٹے تلے کے ہاروں سے زیور بنتا چوڑیاں انگوٹھیاں ہار گلو بند مگھر نیلے ہر چیز بن جاتی..... مونا آنکھیں جھکائے سر پہوڑائے گھنٹوں دلہن بنی بیٹھی رہتی۔ ناصی مڑے مڑے ہاروں کا چند لڑیوں والا سہرا سر پر جمائے شان سے سینہ تانے رہتا۔ دولہا بننے کے تقاخر سے وہ اپنے آپ کو اور سب بچوں سے الگ تھلگ محسوس کرتا۔

اور

الگ تھلگ تو وہ تھا بھی..... گورا چٹا شربتی آنکھوں اور صحت مند جسم والا ناصی سب بچوں میں نمایاں ہوتا..... وہ جب سب سے کہتا مونا میری دلہن ہے۔ تو اس کی آواز میں اک انوکھا سا سرور ہوتا۔ یہ سرور غیر محسوس طریق سے مونا کے رگ و پے میں اتر جاتا.....

کبھی کبھار سکویا شہباز یا کوئی اور مونا کا دولہا بننے کی ضد کرتے۔ تو ناصی مرنے مارنے پر تل جاتا..... چیخ چیخ کر گلا بٹھالیتا۔

مونا کو اب بھی یاد تھا۔ کہ ایک بار سکوز بردستی دولہا بن بیٹھا تھا۔ وہ کیا بنا تھا۔ اس کی امی نے اس کی ضد پوری کرنے کو سب بچوں کو کہا تھا۔ کہ آج اسے دولہا بنائیں۔ ناصی بھلا کیونکر برداشت کرتا۔ اس نے بنا بنایا گھر درہم برہم کر دیا۔ سکوز کے پیٹ میں اتنے گھونے مارے کہ وہ بے حال ہو گیا۔ اور جب دنگا فساد دیکھ کر سب کی مائیں آ پہنچیں۔ اور سکوز کی امی نے ناصی کو ڈانٹا..... قصور وار ناصی کی امی نے اس کے کان کھینچے۔ تو وہ جیسے پاگل سا ہو گیا۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ دیوانہ وار نگر میں مارتے ہوئے چیخا گیا۔ ”مونا میری دلہن ہے۔ مونا میری دلہن ہے۔“

مائیں بچے کی ضد سمجھ کر ہنسی گئیں..... ناصی کی امی نے اسے جھنجھوڑا..... معاملہ سنجیدہ اس وقت ہوا..... جب ناصی کے ماتھے سے خون کی دھار بہہ نکلے۔ اور مونا نے

آئیڈیل

تڑپ کر دلہن کا سنگار نوچ ڈالا۔ کپڑے اتار پھینکے..... اور ناصی کے گلے میں بانہیں ڈال کر زور زور سے چیختے ہوئے رونے لگی..... ”میں تمہاری دلہن ہوں ناصی۔ میں تمہاری دلہن ہوں۔“

پھر کئی دن بچوں کی سرگرمیاں بند رہیں۔ ناصی کے ماتھے پر پٹی لگتی رہی۔ اور مونا اس کے سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی۔

ناصی کے ماتھا پھوڑنے کا قصہ کئی دنوں تک ماؤں کی زبان پر رہا۔ ”ہائے ہائے کتنا ضدی بچہ ہے.....“

”جھگڑا لو ہے۔ ماں باپ پر گیا ہی نہیں.....“

”ڈھیٹ ہے اپنی منوا کے رہتا ہے.....“

”جنگلی ہے..... بالکل.....“

”بے جا لاڈ پیار نے بگاڑا ہے.....“

جو کچھ بھی تھا اس کے بعد کسی بچے کو مونا کا دولہا بننے کی جرأت نہ ہوئی۔ مونا ناصی کی جیسے ملکیت ہی تسلیم کر لی گئی۔ ناصی کو اگر اس ملکیت پر فخر تھا۔ تو کچھ کم خوش مونا بھی نہ تھی.....

وقت گزرتا چلا گیا۔

پانچ سالہ مونا آٹھ سالہ ہو گئی۔

اور تیسری جماعت کا طالب علم ناصی چھٹی جماعت میں آ گیا۔

اب شادی کا کھیل اس باقاعدگی سے تو نہ کھیلا جاتا تھا۔ لیکن ملکیت کا احساس اب بھی جاندار تھا۔ اور مونا کے معصوم ذہن میں تو ناصی دولہا کی علامت بن کر چپک گیا تھا۔

انہی دنوں مونا کے ابو کا تبادلہ ہو گیا۔ پروموشن ہو گئی تھی۔ نئے سٹیشن پر جانے کی تیاریاں خوشی خوشی ہونے لگیں..... مونا بھی خوش تھی۔

”ہم پنڈی جا رہے ہیں۔“ اس نے ناصی کو خوشخبری سنائی تھی۔

آئیڈیل

”میں بھی جاؤں گا۔“

”تم کیسے جا سکتے ہو۔“

”کیوں؟“

”تمہارے ابو تو یہیں رہیں گے۔“

”میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں انکل سے کہوں گی۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہی بھیج دیں۔“

اور پھر اس نے واقعی انکل سے سفارش کر دی۔ ناصی ضد کرنے لگا۔ بچکانہ باتوں پر بڑے بے ساختہ ہنس دیئے۔

چھڑنے کے کرب کا احساس مونا کے ذہن میں آج بھی تازہ تھا۔

پھر کوئی سات آٹھ سال گزر گئے۔ مونا نے اگر ناصی کو یاد نہیں کیا۔ تو بھلایا بھی نہیں۔ جہاں کہیں دلہن دیکھی۔ دلہن کے بارے میں کچھ پڑھا۔ دلہن کا لفظ کہیں لکھا دیکھا۔ اس کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی..... وہ بے اختیار ہو کر ناصی کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کے کئی تصورات پیکرنگا ہوں میں بکھر گئے۔

جانے وہ کیسا ہوگا۔ کتنا بڑا ہو گیا ہوگا۔ اس کی شکل و صورت کیسی ہوگی۔ انجینئر بن رہا ہوگا۔ یا ڈاکٹر..... ہو سکتا ہے فوج میں کمیشن لے لی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ تعلیمی سلسلے میں بیرون ملک چلا گیا ہو۔ اسے جب بھی ناصی کا خیال آتا۔ یہ قیاس آرائیاں ذہن میں ابھرتی تھیں۔

ناصی صرف بچپن کے خواب ہی ہوتا۔ تو شاید وہ اس خواب کو بھول جاتی۔ لیکن سات آٹھ سال بعد اس نے پھر اسے دیکھا۔

وہ مری کی ایک حسین سلونی سی شام تھی۔ دھواں دھواں بادل اٹھ رہے تھے دور نیچے بادلوں کے سینے میں بجلیاں بھی لہرا رہی تھیں۔ کوئی دم میں بارش آ جانے کا امکان تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں خالہ سارہ عظمیٰ نجی اور امی کے ساتھ کشمیر پوائنٹ کا چکر کاٹ کر ڈاک خانے کی طرف آ رہی تھی۔ کہ لوگوں کے ہجوم میں اسے ناصی نظر آ

آئیڈیل

گیا۔ سترہ اٹھارہ برس کا ناصی یوں تو شاید پہچانا نہ جاتا۔ لیکن اس کی شکل اپنے ابو سے ہو بہو ملتی تھی۔ یہ شبیہ مونا کے ذہن میں تھی۔

”امی..... امی..... وہ دیکھیں ناصی..... اس نے ڈاک خانے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے نو عمر لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ امی نے ”کون ناصی؟“ کہتے ہوئے ادھر دیکھا۔ مونا نے ایک ہی سانس میں انہیں یاد دلایا۔

”ہاں..... وہی لگتا ہے۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔“ امی تجسس سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں۔ وہ ان لوگوں کو پہچان نہیں پایا تھا۔ لیکن امی کی چند باتوں ہی سے اس کے ذہن کے درتچے کھل گئے۔ اور وہ بڑے اشتیاق سے مونا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اتنی سی تھیں جب تو“ ”تم بھی تو اتنے سے ہی تھے۔“ امی ہنس دیں..... اور پھر وہ اس کے امی ابو کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ اس کے ابو امی ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔ اور وہ کچھ دوستوں کے ساتھ اتوار منانے مری آیا ہوا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں بتائیں۔ بڑا ہنس مکھ اور باتونی تھا۔ تیز و طرار بھی بہت تھا۔ امی سے تو بڑی سعادت مندی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن مونا کی جانب جن نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ مونا کے رگ و پے میں گدگدائیں تیر جاتیں..... مونا کو اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نظریں کہہ رہی ہوں۔ ”تم میری دلہن ہو۔“ اس لئے وہ شرمائی جا رہی تھی۔

اس نے ان سب کو سمیٹ کر چائے کی دعوت دی۔ امی ہنس پڑیں۔ ”چائے کی دعوت تم دے رہے ہو..... میں بڑی ہوں..... آنٹی ہوں تمہاری.....“

”کیا فرق پڑتا ہے آنٹی.....“ وہ ہنس دیا۔ امی نے سب بچوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اس سے بولیں۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں بھی ٹھہر نہیں سکتی۔ آج پنڈی سے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ تم سب مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ گھر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو ہم کچھ دیر اور رک جاتے۔ امی ابو کو خط لکھو تو ہمارا سلام لکھنا.....“

آئیڈیل

یوں وہ زندگی میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آ کر نکل گیا۔ مونا کے لئے اب پھر وہ وقت سے بچھڑا ہوا لمحہ تھا۔ لیکن یہ لمحہ ایسا تھا جس سے عمر بھر چٹ جانے کو جی چاہا۔

مونا کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ ناصی ایک آئیڈیل تھا۔ جو ذہن میں جم گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ اسے کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔ اس کی زندگی کی تکمیل ہی اس ملن میں ہوگی۔ اس کے من میں ہر وقت ہلچل سی مچی رہتی۔ اور انتظار کی کیفیت اس کی آنکھوں میں ٹوٹی رہتی۔

دو سال کا چکر چلتا رہا..... مونا نے بی اے کر لیا۔ ایم اے میں داخلے کی ماں نے مخالفت کی..... امی تو اس کے بیاہ کا ارمان سینے میں لئے بیٹھی تھیں۔ کہیں سے بھی رشتے کا پوچھا جاتا۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگتیں۔

لیکن

ایسے میں مونا کی ذہنی حالت خطرے کی حدود کو چھونے لگتی۔ ناصی کے بغیر وہ کسی کو اپنا دولہا تصور کرنے پر خود بھی قادر نہ تھی۔ وہ تو اس کی رگ رگ میں رنج بس چکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تھا۔ اس کے تصورات کا حسن تھا۔ اس کے خوابوں کی رنگینی تھا۔ مری میں وہ اسے نہ ملتا تو شاید اس کے خواب ایسے رنگین اور تصورات اتنے بھرپور نہ ہوتے لیکن اب تو وہ بے بس تھی۔ زنجیریں تھیں نہ ڈوریاں پھر بھی وہ اس سے بندھی ہوئی تھی۔

عادل کا رشتہ نعمت غیر مترقبہ تھا۔ والدین کی خوشی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی تھی۔ ایک لڑکی کا نصیب اس سے بڑھ کر کہاں یا اور ہو سکتا تھا۔ لیکن مونا بھڑک اٹھی۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ سمجھانے کا الٹا اثر لیا۔ بھوک پیاسی پڑی سکتی رہی۔ صاف صاف انکار کر دیا..... اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی.....

امی پریشان ہو گئیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا۔ کہ صاحبزادی کہیں دل کا سودا کرنے کا سودا کر بیٹھی ہیں۔ مجبور ہو کر عظمیٰ کے ذریعے اسے کریدا۔ اس کے متعلق پوچھا۔ جس

کے لئے اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔
لیکن

وہ کیا بتاتی۔ پر چھائیاں۔ سراب۔ ہیولے۔ انہیں کون پکڑ سکتا ہے۔ ماضی گھٹا
ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک لاکھ شے کو حاصل کرنے کی تگ و دو
دیوانے پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ کتنے سالوں سے وہ انتظار کے دیئے جلائے اس کی راہیں
تک رہی تھی۔ کہاں کہاں اسے نہیں ڈھونڈا تھا۔ کس کس چہرے میں اسے تلاش نہیں کیا
تھا۔

اس کی سوچوں میں فرزاگی کی کوئی رمتی باقی تھی شاید..... اسے اپنی ضد بے معنی اور
اپنی تلاش بے ہودہ لگی تھی۔ اور پھر حقیقت کو تسلیم کر کے اس نے والدین کی رضا کے
سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

اور

یوں مونا ناصی کی دلہن بننے کی بجائے عادل کے پہلو میں آ گئی۔
سحر انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ شبی سویرا اتر رہا تھا۔ خواب گاہ کی چکا
چوندروشنیاں نیلی روشنی میں بدل گئی تھیں۔ خوابناک ساما حول تھا۔
عادل شب عروسی کی ساری رنگینیاں لوٹ کر تکیے میں منہ دیئے اونڈھالینا سکون کی
نیند سوراہا تھا۔

مونانے اپنی بے سکون آنکھوں سے اسے دیکھا۔ کوئی آسودگی۔ کسی قسم کی طمانیت
کوئی تسکین اس کے ٹوٹے بدن سے پھوٹ نہ رہی تھی۔ اپنا وجود اسے لٹے ہوئے
قافلے کی طرح لگ رہا تھا۔ ضمیر پر اتنا بوجھ تھا۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے جرم کی مرتکب
ہو چکی ہے۔

دن نکلا

اور پھر رات ڈھل آئی۔

رات روز ہی آ جاتی۔ اسے تو اب رات سے خوف آنے لگا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کے

احساس کے سوا اس نے ان راتوں سے اور پایا ہی کیا تھا۔
وہ چند دنوں ہی میں گھبرا گئی..... عادل جتنا اس کے قریب آتا۔ ٹوٹ کر چاہتیں
نچھاوڑ کرتا۔ اتنا ہی اسے ناصی یاد آتا۔

ناصی جو یقیناً عادل سے بہت زیادہ خوبصورت تھا۔ اور جس کے گرداگرد مونا
نے بھرپور شخصیت کی ساری خوبیوں کا ہالہ بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھی تو مونا کا دل چاہتا کہ اس
گھر کو اس خوبصورت قفس کو توڑناڑ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ اور شاید پس پردہ یہی
خواہش تھی۔ اس نے کراچی جانے کی ضد کی..... وہ اپنی امی کے پاس جانا چاہتی تھی۔
عادل اولین فرصت میں اسے کراچی لے گیا۔

اکھڑی اکھڑی مونا بھائی بہنوں ماں باپ اور ملنے ملانے والوں میں آ کر کچھ پھیل
ہی گئیں..... کبھی کسی سیہلی سے ملنے چلی جاتی..... کبھی کوئی انکل آنٹی آ جاتے۔ کبھی
عادل ہی کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے نکل جاتی۔ یہاں دل کی کک کو بہلانے کے
بہت مواقع تھے۔

اس دن وہ بہت سی شاپنگ کر کے دکان سے نکلی۔ تو اک جانی پہچانی سی صورت
دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ صورت جانی پہچانی ہونے کے باوجود وہ ایک دم نہ جان
سکی۔ کہ یہ کون ہے.....؟

”مونا تم.....“ کہتے ہوئے وہ صورت بے تابانہ خوشی سے اس سے لپٹ گئی۔
تب مونانے اسے پہچانا..... وہ شہناز تھی۔ اس کی میٹرک کی کلاس فیلو۔ لیکن جب
اور اب کی شہناز میں جو فرق تھا مونا ششدر سی اسے تنگے لگی۔

”یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے شہناز۔ پیار سی ہو کیا...؟“ مونانے اسے اپنے سے الگ
کرتے ہوئے اس کے سراپا پر ایک تشویشناک نگاہ ڈالی۔ مومی سی لڑکی شمع کی طرح
پکھل گئی تھی۔ بے داغ چہرے پر کالے کالے دھبے پڑ گئے تھے۔ اور روشن چمکتی
آنکھیں جیسے گڑھوں میں اتری ہوئی تھیں۔

شہناز کے ہونٹوں پر پنچا تبسم تھا۔ وہ مونا کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کو اسی کی

خیر خبر پوچھنے لگی۔ نئی نئی بیاہی مونا کو شادی کی مبارک دیتے وقت اس کی آنکھوں میں حسرتوں کے طوفان تھے۔

”تمہاری شادی کب ہوئی۔“ مونا نے پوچھا

”شادی نہیں..... بر بادی کہو مونا۔“

”کیوں؟“

شہناز نے پھیکے سے تبسم سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی تھی۔

”تم..... خوش نہیں لگتیں.....“ مونا نے اس کے کندھے پر بے صبری سے ہاتھ

رکھا۔ ”کیا بات ہے۔؟“

اور پھر مونا نے ایک ہی سانس میں اس کی شادی جسے وہ بر بادی کہہ رہی تھی کے متعلق کئی سوال کر ڈالے۔

”کسی دن میرے گھر آنا۔ ساری روئید اسناؤں گی۔ میرا اپنا دل بھی کسی غمگسار

کے سامنے کھل جانا چاہتا ہے مونا..... میں بہت دکھی ہوں.....“

وہ شاید رو دینے کو تھی..... مونا اسے سہارا دے کر گاڑی تک لے آئی۔ اس کی

کہانی سننے کو وہ بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔ اپنے گھر جانے کی بجائے وہ شہناز کے ساتھ اسی کے گھر آ گئی۔

شہناز نے دکھی لہجے میں اپنی پتا سنائی تو مونا کانپ کانپ گئی۔ شہناز کا شوہر

پاسپورٹ آفیسر تھا۔ جائز و ناجائز آمدنی بے حساب تھی۔ لیکن دولت سکھ دینے کی

بجائے دکھ دے رہی تھی۔ اس کے شوہر کے لئے شراب اور عورت زندگی کا لازمی جزو

تھے۔ آج ایک کی سنگت کل دوسری کی۔ کبھی بیاہی ہتھے چڑھی ہے اور کبھی بن بیاہی.....

انسان نہیں جانور بھیڑ یا تھا وہ تو۔ شہناز سے بھی اس نے پسند کی شادی کی تھی۔ لیکن

کردار کی قلعی چند دنوں ہی میں کھل گئی۔ شہناز اس کی کسی بات کی بھی مخالفت کرتی..... تو

وہ مرنے مارنے پر تل جاتا..... طلاق تو ہر لڑائی کی دھمکی تھی۔

شہناز کے والدین حیات نہیں تھے۔ اور دو بھائیوں کی نیم رضامندی سے یہ شادی

ہوئی تھی۔ اسی لئے وہ طلاق کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گھٹ کر سسک سسک کر زندگی گزار رہی تھی۔

”حالات سے بچک آ کر میں طلاق تو نہیں لوں گی۔ البتہ کسی دن خودکشی ضرور کر

لوں گی۔“ شہناز نے اتنے دل فگار لہجے میں کہا کہ مونا کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے اپنے حالات کا موازنہ شہناز کے حالات سے کیا۔ تو اپنے ناشکرے پن

کا احساس کر کے وہ کانپ گئی.....

شہناز کا جی تو مونا سے باتیں کر کے کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ہاں مونا بے حد پریشان ہو

رہی تھی۔ بار بار شہناز کی طرف دیکھتی اور گہرے گہرے سانس لینے لگتی۔

”مونا.....“ شہناز ہونٹوں پر پھیکا سا تبسم لاتے ہوئے بولی۔ ”میری باتوں نے

تمہیں پریشان کر دیا ہے.....“

”واقعی شہناز..... تمہارے ساتھ کتنی ٹریجڈی ہوئی ہے۔“

”تھک ہار کر انسان قسمت ہی کو کوستا ہے..... خیر یہ میرا نصیب ہی ہے۔ میں تو

اب عادی سی ہو گئی ہوں.....“

کتنا کرب تھا۔ اس کے لہجے میں۔ کتنا دکھ تھا اس کی آواز میں۔ مونا کو اس پر اتنا

ترس آیا کہ بے اختیار ہو کر اس کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں..... اس کے بدکردار

بدقماش اور آوارہ شوہر کے لئے اس کے دل میں نفرتوں کے طوفان امنڈنے لگے۔

مونا ان نفرتوں کا اظہار کرنے لگی۔ تو شہناز ہنس پڑی۔ ”ویسی کی ویسی جذباتی سی

لڑکی ہو۔ تم میں تو شادی کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو..... یہ

بتاؤ چائے پیوگی یا سکولیش میں تو باتوں میں الجھ کر بھول ہی گئی..... میرے خیال میں

چائے پیئیں۔ کیوں؟“

شہناز اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ مونا نے ایک گہرا اور دکھ بھرا سانس چھوڑتے

ہوئے اپنا وجود صوفے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ صوفے کی پشت پر سر ڈالتے ہوئے اس نے

ڈریسنگ روم کا سرسری جائزہ لیا..... ساری چیزیں خوبصورت بھی تھیں اور قیمتی بھی۔

لیکن ایک نامعلوم سی بے ترتیبی کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ شہناز جس طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکی تھی۔ گھر کی سجاوٹ بناوٹ میں اس کا کرچی کرچی وجود کس طرح حصہ لے سکتا تھا مونا کو اپنی دوست کے ایسے بھیانک انجام کا سوچ کر جھر جھری سی آگئی۔

وہ صوفے پر پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے اس نے رخ دائیں جانب پھیرا۔

اور

اچانک

اس کی نظریں کوٹنے میں سٹینڈ پر رکھی اس تصویر پر انک گئیں۔

جو

جو

کسی طور اس کے لئے انجان نہ تھی۔ بے اختیارانہ تڑپ سے وہ اٹھی۔ اور تصویر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

یہ یقیناً نہیں حقیقتاً ناصی تھا..... شک کی گنجائش یوں نہ تھی۔ کہ اس کی پیشانی پر بچپن کا وہ داغ بھی موجود تھا۔ جو اس نے برآمدے کے ستون سے ٹکریں مار مار کر ماتھا پھوڑنے پر بنایا تھا..... داغ نہ بھی ہوتا۔ جب بھی وہ اسے پہچان لیتی۔ اپنے من میں پورے استحکام سے استادہ بت کو کیونکر نہ پہچان پاتی۔ مونا کے ہاتھ اس کے دل کی طرح کانپ رہے تھے۔ کچھ پالینے کا انبساطی لمحہ اس کی گرفت میں تھا.....

لیکن یہ لمحہ ایک لمحہ میں بیت گیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ چہرے پر مردنی چھا گئی آنکھیں شدت کرب سے پھٹ سی گئیں۔ اس کا سارا وجود زلزلے کے شدید جھٹکوں سے جیسے لرز رہا تھا۔

”کہیں یہ..... کہیں یہ شہناز کا شوہر ہی تو نہیں۔“ یہ خیال برقی رو کی طرح اسے چھو گیا۔ اس نے زور زور سے سرنمفی انداز میں ہلایا۔ اس کا آئیڈیل اور یہ ساری

کراہتیں“

وہ پلٹ کر جانے کیا کرنے کو۔ کیا کہنے کو تھی۔ کہ شہناز مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تصویر کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“

”یہ.....؟“

”ناصر.....“

”ناصر!“

”ہاں میرے خدائے مجازی..... جنہیں پیار سے سب ناصی کہتے ہیں۔“ شہناز بڑے طنزیہ مزاج میں مسکراتے ہوئے بولی۔

مونا کے کانپتے ہاتھوں سے تصویر گر کر ٹوٹ گئی۔ چھن سا چھنا کا ہوا۔

شہناز ہنستے ہوئے جھک کر ٹوٹی ہوئی تصویر اٹھانے لگی۔ کرچیاں چنتے ہوئے بولی ”تمہیں تو ضرورت سے زیادہ ہی غصہ آ گیا میرے میاں پر۔ نفرت کا اظہار یوں کیا کہ تصویر ہی توڑ ڈالی۔“

مونا کچھ نہیں بولی۔ وہ تو چھن سے ٹوٹنے کی آواز کے متعلق ہی غور کر رہی تھی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا۔

کہ

یہ آواز تصویر کے ٹوٹنے کی ہے۔ یا اس بت کے پاش پاش ہونے کی۔ جو برسوں سے اس کے اندر بڑے استحکام سے استادہ تھا۔

☆☆☆

پھٹی پھٹی آنکھوں میں جہنم کی بھٹیاں سلگ اٹھیں۔ پھر وہ خونخوار سے ہو جاتے۔ اماں سے ٹوٹو میں میں ہوتی پھر گالیوں پر اتر آتے۔ یوں کام بنتے نہ دیکھ کر ٹھنڈوں سے تواضع کر دیتے۔ گھر کی فضا سہم جاتی۔ بھائی کام کرتے رُک جاتے۔ بہن کھیلتے کھیلتے جامد سی ہو جاتی۔

اسے کچھ پتہ نہیں تھا، کہ یہ کھیل اتنے تواتر سے کیوں کھیلا جاتا ہے۔ ابا کی مالی پریشانیوں کا رد عمل ہے یا اماں کے کسی قصور کا نتیجہ..... دادی اور پھوپھیوں کی لگائی بھائی ہوتی ہے۔ یا کوئی اور بات، اسے تو صرف اتنا پتہ تھا کہ ابا امی سے جھگڑتے جھگڑتے ٹھنڈوں پر اتر آتے تھے۔ اور جب اماں زوروں سے رونے لگتیں تو الٹی ہتھیلی سے ہونٹوں کا کف صاف کرتے ہوئے گالیاں بکتے جھکتے باہر نکل جاتے ہیں۔

لیکن اس کھیل کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جو اکثر شام کو سامنے آتا تھا۔ جس دن ابایوں لڑ جھگڑ کر جاتے، اکثر شام ڈھلے گھر لوٹا کرتے تھے۔ اس دن اماں سارا وقت منہ لپیٹے چار پائی پر پڑی رہا کرتیں۔ روز کی طرح نہ رگڑ رگڑ کر برتن مانجھتیں، پیتل اور تانبے کے برتن اماں اس طرح چمکایا کرتی تھیں۔ کہ چم چم کرنے لگتے تھے۔ نہ ہی معمول کی طرح گھر کی صفائی کیا کرتیں۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا گھر اماں بڑی لگن اور محنت سے سنوارا کرتیں۔ لوہے کے صندوقوں پر پرانے لٹھے کے تکلون تکلون جھالریں لگا کر بنائے ہوئے کپڑے ڈالا کرتیں۔ ان کپڑوں کو انہوں نے کبھی میلا نہ ہونے دیا۔ اور کیا مجال جو یہ کپڑے کبھی آڑے ترچھے پڑے ہوں۔ کمروں اور چھوٹے سے صحن کی اینٹیں دھو دھو کر گھسا ڈالی تھیں۔ سرخ سرخ اینٹوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا فرش بہت اچھا لگتا تھا۔ صبح و شام فرش دھونے پر دادی اماں ان سے لڑا بھی کرتیں۔ اُن کا خیال تھا کہ پانی یوں پڑتا رہے تو مکان کی بنیادیں خراب ہو جاتی ہیں۔ لیکن شاید اماں نفاست پسند تھیں۔ جھاڑو اور پانی کی بالٹی ہاتھ میں لئے پانچے اوپر کئے گھر میں جل تھل کئے رہتیں۔ وہ تو چھت کا فرش کچا تھا۔ ورنہ اماں وہ بھی روزانہ دھویا کرتیں۔ میڑھیاں روز ہی دھلتیں۔

پیار

ایک.....

دو.....

تین.....

ابا کے ٹھنڈوں کے ساتھ اماں دوہری تہری ہو کر پیڑھی سے لڑھک گئیں۔ گالیوں کی بو جھاڑ پڑ رہی تھی..... اماں دوپٹے میں منہ چھپائے زوروں سے رو رہی تھیں۔ اور وہ اپنے دو بڑے بھائیوں اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

بک جھک کر ابا باہر نکل گئے۔ اور اماں وہیں کھسک کر پیڑھی پر ہو بیٹھیں۔ کتنی ہی دیر وہ زیر لب بد دعائیں دیتے ہوئے روئے گئیں۔ کسی بچے کو ماں کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چھوٹی بہن تو دیوار سے لگی لگی رونے لگی۔ اور بھائی ادھر ادھر کھسک گئے۔ پر وہ اماں کا آنسوؤں سے تر سرخ ہوتا چہرہ دور سے کھڑی سہمی دیکھتی رہی۔ وہ بے چین تھی۔ اس کے اندر ہلچل تھی۔ شام کا انتظار اسے شدت سے تھا۔ جب سے اس نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تھا، یہ تماشا دیکھتی آئی تھی..... ابا غصے سے باؤ لے ہو جاتے۔ ان کے جڑے خوفناک طریق سے حرکت کرتے ہونٹوں کے کونوں میں سفید سفید کف جمع ہو جاتی۔ سانولا چہرہ تپ کر پرانے تانبے کی رنگت اختیار کر لیتا۔

آئیڈیل

باورچی خانہ ہمیشہ صاف ستھرا ہوتا۔ قرینے سے ہر چیز اپنی جگہ رکھی ہوتی۔ چولہے کی لیپا پوتی تو روز کا معمول تھا۔ وہ تو جب سے اباسولہ بیویں والا تیل کا چولہا لے آئے تھے۔ مٹی کے چولہے کا دھیان چھٹ گیا تھا۔ لیکن ہفتے میں ایک بار اماں ضرور اس پر لیپا پوتی کر ہی دیتیں۔

گھر کا سارا کام اماں ہی کے ذمے تھا۔ اماں خوشی خوشی یہ کام کیا کرتیں۔ اور کپڑے بھی دھوتیں۔ اور لوہے کی کونکوں والی استری تپا کر سارے کپڑے استری بھی خود ہی کیا کرتیں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ گھر میں کبھی کسی نے بنا استری کپڑے پہنے ہوں، ہاں جس دن ابا لڑ جھگڑ کر جاتے اس دن اماں قسم کھا لیتیں شاید۔ کسی بھی کام کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ دادی اور پھوپھیوں کو ہی اس دن کام کرنا پڑتے۔ وہ بڑ بڑ کرتے کام تو کرتیں، لیکن جو ترتیب اور نفاست اماں کے ہاتھوں ہوتی وہ ان کے ہاتھوں کبھی نہ ہو پاتی۔ برتن اور کپڑے صحن میں بکھرے رہتے۔ چار پانیوں کے بستر کبھی ترتیب سے نہ لگتے..... اور ہانڈی تو اس دن کسی ڈھنگ کی پکتی ہی نہ تھی۔

سارا گھر بے مزگی سے دو چار ہوتا۔ بھائی بڑ بڑ کرتے۔ پھوپھیاں جلی کٹی سناتیں۔ اور دادی کبھی ابا کو کوستیں اور کبھی ماں کو برا بھلا کہتیں۔

ایک وہ تو تھی کہ اس سارے ہنگامے پر کچھ بھی نہ کہتی تھی۔ بد مزگی اور بے کیفی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ وقتی طور پر سہم ضرور جاتی۔ لیکن اس کے ذہن میں آنے والی شام کا تصور بڑا کیف زا ہوتا۔ جانے یہ شام اسی روز آ جاتی تھی۔ جس دن ہنگامہ ہوتا تھا۔ یا کئی دن گزرنے کے بعد آتی تھی۔ لیکن آتی ضرور تھی۔

اس دن ابا گھر میں داخل ہوتے تو مجرموں کی طرح سر جھکائے۔ کھانا بھی نہ کھاتے۔ دادی بہتیرا کہتیں۔ پھوپھی بھی چنگیر میں روٹی اور مٹی کے پیالے میں سالن ڈال کر لے آتی۔ لیکن ابا سر نہ ہواڑائے بیٹھے رہتے۔ اماں سر لیٹے اپنے کمرے میں چار پائی پر پڑی ہوتیں اور جب شام پوری پوری تاریک ہو جاتی۔ دادی اور پھوپھیاں اپنے اپنے بستر وں میں گھس جاتیں۔ بھائی اپنی چار پائیاں صحن سے اٹھا کر دادی کے

آئیڈیل

کمرے میں ڈال لیتے، تو ابا چپکے چپکے اپنے کمرے میں آ جاتے۔ وہ اپنی چھوٹی سی پلنگڑی پر اپنی چھوٹی بہن سے لپٹی ہوتی۔ ابا دھیرے سے دروازہ بھیڑ کر کنڈی چڑھا دیتے۔ پھر کچھ دیر کمرے میں ایسے ہی ٹہکتے رہتے۔ کبھی اپنی چار پائی پر بیٹھ جاتے۔ کبھی چھت کو دیکھتے ہوئے چت لیٹ جاتے، پھر گردن موڑ کر اماں کی طرف دیکھتے۔

اماں مٹی کے بے جان ڈھیر کی طرح پڑی رہتیں، ہلتی نہ جلتی۔

”اے۔“ ابا اکثر ایسی ہی آواز نکال کر اماں کے منہ پر لپٹا کپڑا کھینچتے۔

اماں چار پائی کے دوسرے سرے تک جا پہنچتیں۔

ایسی دو چار آوازوں کے بعد ابا اٹھ کر اماں کی چار پائی پر آ بیٹھتے۔ اماں دوسری پٹی تک تیزی سے کروٹ لے کر تانا ہوا کھیس اور سر کے نیچے دبالتیں۔ ابا پہلے تو آہستہ آہستہ سرگوشی کے انداز میں اماں کو پکارتے پھر چڑی چڑی باتیں کرنے لگتے۔

بھئی..... دیکھو نا..... غصے میں ایسا ہو گیا..... تم ہی چپ ہو جایا کرو۔ بھئی آئندہ نہیں ماروں گا..... معاف کر دو اب..... تم سے لڑ جھگڑ کر مجھے کتنی پریشانی ہوتی ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں۔ اب اتنی خبیث عادت ہے اپنی۔ مجبور ہو جاتا ہوں.....“

اماں دم رو کے سنتی رہتیں۔ ابا باتوں کا جواب نہ پا کر زور سے کپڑا کھینچتے۔ ”بس ہو گیا نہ غصہ۔ اب جانے بھی دو معافی مانگ رہا ہوں۔ تم سے خفا رہ ہی نہیں سکتا۔ جانتی ہو میری عادت.....“

وہ کھیس وغیرہ اماں کے منہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ جاتے اب اماں کے منہ سے بھی کبھی کبھی آواز نکلتی۔

”نہ کرو“

”ہٹو جی۔“

”ہائے اللہ پرے بھی ہٹو۔“

لیکن اماں جتنا ابا کو پرے دھکیلتی وہ اتنا ہی ان پر جھکتے جاتے۔ پٹی پر بیٹھے بیٹھے اپنا

بازو اماں کے وجود کے اوپر لے جاتے ہوئے دوسری پٹی کو پکڑ کر اماں کو جیسے زرخے میں لے لیتے۔ اماں سر ادھر ادھر مارتیں۔ وہ بار بار جھکے جاتے۔ اماں کا کبل یا کھیں ان کی گرفت میں آ جاتا۔ تو پورے زور سے کھینچ کر پرے ہٹا دیتے۔ اماں اپنا ننگا چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیتیں۔

پھر کتنا ہی وقت گزر جاتا۔ کھینچنا تانی ہوتی رہتی۔
کبھی اماں کی ہائے فضا میں بکھر جاتی۔

اور

کبھی ابا کا پر مسرت ہلکا سا سرگوشی تہقہ پھسل جاتا۔

اس کھینچنا تانی میں اماں کچھ نرم پڑ جاتیں۔ کبھی ہنس پڑتیں۔ اور یوں بھی ہوتا کہ سسکیوں سے رونے لگتیں۔ ابا بچھے ہی جاتے۔ دن میں گالیاں دینے اور ٹھڈے مارنے والے ابا یکسر بدلے ہوتے۔ سراپا انکسار و محبت اور شفقت ہوتے۔

اپنی پلنگزی پر لیٹے لیٹے اسے یوں لگتا جیسے پوری کائنات محبت و مسرت سے بھری ہوئی ہے۔ کتنا لطف آتا اسے۔ کتنی مسرت ہوتی۔ ہنگامے کے وقت اعصاب پر چھایا ہوا سہم یوں دھل جاتا۔ جیسے بارش سے دھول۔

اماں صبح سویرے غسل کر کے گیلے بال چادر میں چھپائے، باورچی خانے میں چولہا جلاتیں۔ تو اسے اماں سردیوں کی چمکیلی دھوپ کی طرح نکھری نکھری لگتیں۔ ان کے چہرے پر پھولوں کی سی شادابی ہوتی، آنکھوں میں گھلا ہوا مسرتوں کا خمار ہوتا۔ بات بات پر ہنستی۔ ابا کے لئے بڑے اہتمام سے چائے بناتیں۔

اس دن ابا بھی حمام میں غسل کرنے جاتے۔ کبل لپیٹے واپس آتے تو بٹکل میں لیپٹے حلوہ پوری کا لافہ ضرور ہوتا۔

اسے اس دن عید کا احساس ہوتا۔ ہر سو خوشی و مسرت کی چہکاریں سنائی دیتیں۔ پیڑھی پر بیٹھی اماں کے وجود کے گرد اگر دغور و تفاخر کا ہالہ سا ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کسی بہت بڑی مملکت کی مہارانی بیٹھی ہیں۔

خوشی کا جانفزا اور وجد آفرین، کیف اسے اپنے رگ و پے میں اترتا محسوس ہوتا۔ یوں کئی دن مسرتوں کے ہنڈولے جھولتے گزر جاتے۔

اور جب بہت دن گزر جاتے تو اسے اپنے اندر اک بے نام سی خلش محسوس ہوتی۔ طبیعت ڈانواں ڈول ہونے لگتی۔ بے چینی کا احساس ہوتا۔ لگتا کچھ کھو گیا ہے..... کوئی بچھڑ گیا ہے۔ پڑمردگی اور بے قراری و اداسی اس پر مسلط ہونے لگتی۔
لیکن

جب

پھر وہی کھیل کھیلا جاتا، تو اس کی کھوئی ہوئی مسرتیں اسے پھر مل جاتیں۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔

لطف و انبساط کا تجربہ اس کے رگ و پے میں رچ بس گیا۔ اب اس ہنگامے میں زیادہ زیادہ وقفہ آنے لگا تھا۔ شاید ابا کی مالی پریشانیاں کچھ کم ہو گئی تھیں۔ یا اماں ہی اولاد کے جوان ہو جانے سے کچھ سمجھدار ہو گئی تھیں۔ بہر حال وقفہ زیادہ سے زیادہ آ رہا تھا۔ ہنگامے میں وہ شدت بھی نہ رہی تھی۔ ٹھڈے تو اب ابا کو بھول ہی گئے تھے۔ گالیوں میں بھی پوچھاڑ کی کیفیت نہ رہی تھی۔ پھر بھی کھیل علامتی سہی..... ان کی ذہنی تسکین ضرور ہو جاتی۔

دونوں بڑے بھائی خوب کماؤ ہو گئے۔ مکان کی حالت یوں بدل گئی کہ چھت پر ان کے لئے الگ الگ کمرے بن گئے۔ دادی فوت ہو گئیں۔ دونوں پھوپھو بھائیوں کا بیاہ ہو گیا، اور ان کے کمرے میں وہ اپنی بہن کے ساتھ آ گئی۔ کتنی مدت تو اسے الجھن ہوتی رہی تھی۔ اس کمرے میں اس کا دل ہی نہ لگا۔ لوری بغیر نیند نہ آنے والے ذہن کی طرح پریشان رہتی۔

پھر بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ذہنیں آ گئیں۔ ان کے جہیزوں سے گھر بھر گیا۔ اماں ابا تو جیسے بچھڑے ہوئے راستے ہو گئے۔ اور وہ بے چین بے چین رہنے لگے۔

آئیڈیل

بڑا بھائی فرمانبردار قسم کا شوہر تھا۔ اس کی بیوی سدا ہی مسکراتی رہتی..... اپنے شوہر کی الفت و چاہت کے بڑے ہی قصے سناتی۔

اور

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس کے ذہن نے الفت و چاہت کی داستان کو ہمیشہ ہی مفروضہ سمجھا..... کسی کھیل..... کسی ہنگامے کے بغیر بھی کبھی محبت کا اتنا بھرپور احساس ہو سکتا ہے؟؟

ہاں چھوٹی بھابی اور چھوٹے بھیا کی محبت اسے لازوال لگتی۔ وہ بھی کچھ اماں اور ابا کی طرح تھے۔ جس دن بھی بھابی تڑکے غسل خانے سے باہر نکلتیں۔ تو اسے وہ سردیوں کی نکھری نکھری دھوپ کی طرح لگتیں۔ پیار و محبت کا بھرپور اظہار ان کے گیلے گیلے وجود سے ہو رہا تھا۔

تسکین و طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ وہ خوش خوش نظر آنے لگتی۔ پھر اس کی بھی شادی ہو گئی۔

مضبوط قد و قامت اور اچھی خاصی کمائی والا مجید جب اسے بیانے آیا۔ تو گلی محلے والوں اور شہ داروں نے اس کی تقدیر پر رشک کیا۔ ایک اکیلا لڑکا، دس مرلے کا دو منزلہ پکا مکان، گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود۔ ڈھیر سارا سونا تو بری میں لایا۔ ایسے ایسے خوبصورت کپڑے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اور پھر ٹوٹ کر چاہنے والا۔

نئی دنیا حیران کن تھی۔ وہ اس دنیا میں کھو گئی۔ مجید کے پیار میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے منہ سے بات نکلتی اور وہ پوری کر دیتا۔ چلتی تو نگاہیں بچھاتا۔ بات بات پر تصدق ہوتا۔ پروانہ وار فدا تھا۔

وہ تو اس پجاری کی طرح تھا، جس کا ایمان دیوی کی پوجا کرنے میں ہوتا ہے۔

اس کی سہیلیاں، اس کی بھابیاں، اس کی ملنے جلنے والیاں اس کے نصیب پر رشک کرتی تھیں۔ حسد بھی آتا تھا۔ وہ نہ تو ایسی حسین و جمیل تھی۔ نہ ہی اتنی امیر کبیر کہ شوہر

آئیڈیل

حسن و امارت سے مرعوب ہو گیا تھا۔
لیکن

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسے اپنے اندر کسی کمی کا خلا شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ نئی دنیا کی ہر چیز سے مانوس ہو کر اس کا جی اب بھر گیا تھا۔ طبیعت بے چین اور ڈانواں ڈول رہنے لگی۔ پڑمردگی..... محرومی اور اسی اس کے اعصاب پر مسلط ہونے لگی۔

مجید کی تو جیسے جان پر بن آئی۔ پروانہ ہزار جان سے فدا ہونے لگا۔ اسے نگاہوں میں بھرتا دل میں سموتا۔ پیار و محبت کے جتنے اظہار ممکن تھے، کر بیٹھا۔
لیکن

وہ خوش نہ ہو سکی..... بے چینی دور نہ ہوئی نہ بے قراری۔ مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا اکثر بدتمیزی پر بھی اترنے لگی۔ اس کی سیدھی باتوں کو الٹا مفہوم دے کر تڑتڑ جواب دینے لگی۔

مجید بہت و استغفال سے اس کی ہر زیادتی برداشت کرتا رہا..... پیار و محبت کے انبار میں اس نے بغل سے کام نہیں لیا۔

لیکن وہ جتنا اس پر مر مٹ رہا تھا۔ وہ اتنا ہی اس سے کھنچ رہی تھی۔ چڑچڑاپن تنفر اور بیزاری کی حدوں کو چھونے لگی..... اب تو یوں ہونے لگا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں دبوج کر سینے میں چٹالینے کی کوشش کرتا۔ تو وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپے لگتی۔ وہ پیار سے ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیتا، تو اسے یوں لگتا جیسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ وہ دھکے دے کر اسے پرے ہٹا دیتی۔ ہانپتی ہوئی پلنگ پر اوندھی گر جاتی۔ اور پھر دکھ سے رونے لگتی۔

مجید پریشان ہو ہو کر اسے پیار سے دلاسا دینے، بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتا تو وہ اسے بے نقط سا ڈالتی۔

مجید انسان تھا۔

انسان بھی مرد۔

کب تک برداشت کرتا۔ بلاوجہ اس کی اتنی زیادتی کوشش کے باوجود برداشت سے باہر ہوگئی۔

کسی ایسے ہی دن جب اس کے بے پناہ پیار، دلا سے اور بہلاوے کے باوجود وہ بدتمیزی پر اتر آئی۔ تو مجید جھنجھلائے ہوئے شیر کی طرح غرایا ”تمہیں ہوتا کیا ہے آخر.....“

دوسرے لمحے مجید کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ دن میں تارے ہی تو نظر آ گئے۔ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر وہ ششدر سی اسے دیکھنے لگی۔ مجید بھٹایا ہوا باہر نکل گیا۔ اور وہ بستر پر اوندھی پڑی رہی..... تھپڑ زدہ گال میں جلن ہو رہی تھی وہ کتنی ہی دیر گال سہلاتے ہوئے روتی رہی۔

اس دن اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ جمعدارنی سے صفائی بھی نہیں کروائی۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر کھانا بھی تیار نہیں کیا۔ بس چادر سے منہ سر لپیٹے بستر پر دبی پڑی رہی۔ مجید دو پہر کھانا کھانے بھی نہیں آیا۔ ملازمہ نے اسے کھانے کو کہا، لیکن وہ بھی بھوک پڑی رہی۔ احتجاج کے طور پر کھانا نہیں کھایا۔ حالانکہ اس کی آنتیں مروڑ کھا رہی تھیں۔ ملازمہ نے کھانا کھالیا۔ اور باورچی خانے کی صفائی کر کے بند کر دیا۔ اس نے شام کی چائے بھی نہیں پی۔ رات کے لئے کھانا بھی ملازمہ نے اپنے ہی انداز سے بنا لیا۔

شام ڈھلے مجید گھر میں داخل ہوا۔ تو جرم کے احساس کے ساتھ اپنی زیادتی کا احساس اسے صبح سے ہو رہا تھا۔ آج اس نے ہاتھ اٹھایا تھا۔ عورت پر ہاتھ عورت جسے وہ بڑی مقدس اور بڑی عظیم شے سمجھتا تھا۔ اپنے وحشیانہ رویے پر اسے شدت سے ندامت ہو رہی تھی۔ کفِ افسوس بار بار مل رہا تھا۔ صحن میں بے قراری سے ادھر ادھر ٹہلنے ہوئے ملازمہ سے اس کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ ندامت بے صبری میں ڈھل رہی تھی۔

ملازمہ نے کھانے کے لئے پوچھا تو بولا ”تم اب جاؤ ہم خود ہی کھالیں گے۔ ملازمہ اپنا کھانا لے کر چلی گئی۔ تو باہر کا دروازہ بند کر کے وہ اندر آ گیا۔ چادر کا کونا ذرا سا ہٹا کر اس نے دیکھا، مجید سر نہیوڑائے دروازے میں کھڑا تھا.....“

وہ بے رخی سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ کبل کھینچ کر اس نے منہ سر لپیٹ لیا۔ مجید دھیرے دھیرے متاسف اور نادام اندر آ گیا۔ وہ چند لمحے بے تابی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کھنکھارا۔ لیٹا۔ اٹھ بیٹھا اور پھر گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ کبل کی اوٹ سے چشم نیم باز سے مسلسل اسے تک رہی تھی۔ وہ ایک دم اس کے پلنگ پر آ بیٹھا۔ اس پر جھکتے ہوئے بڑی میٹھی آواز میں اسے پکارا۔

”معاف کر دو..... مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے۔ واللہ..... معاف کر دو۔ میں اپنی زیادتی پر سخت پشیمان ہوں..... میری جان مجھے معاف کر دو..... میں شرمندہ ہوں.....“

وہ کچھ نہیں بولی..... اور وہ التجائیں کرتا رہا..... پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کبل کھینچا۔ کھینچا تانی میں وہ ہار گئی..... مجید ہنس پڑا..... اور وہ رونے لگی، کئی لمحے گزر گئے۔ پھر اس کے ننگے چہرے کو اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر اس کی روئی آنکھوں، اس کے بھیکے لبوں، اور اس کے متمائے گالوں پر بڑی وحشیانہ دیوانگی سے پیار کیا۔ مردانہ ہونٹوں کی تپش اس نے اپنے رگ و پے میں اترتی محسوس کی۔

روٹھنے منانے کا کیف زار اور وجد آفرین کھیل کتنی ہی دیر جاری رہا۔ اور اس کے ذہن کے بند بند گوشے کھلنے لگے۔ خوشی و مسرت کی چپکاریں گونجنے لگیں۔ سکون اور طمانیت کا احساس طاری ہونے لگا۔ اسے اپنا کھوکھلا وجود یوں لگا جیسے لبالب بھر گیا ہے۔

جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اور کھیل تو انائی اور شدت کے کس کس مرحلے سے گزرا۔

پھر رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ وہ دونوں ہنستے مسکراتے باورچی خانے میں گھسے تھے۔ مجید نوالے اس کے منہ میں ڈال رہا تھا۔ اور وہ مسرت سے بے حال اس کے پہلو سے لگی کھانا کھا رہی تھی۔

صبح صبح جب وہ نہاد ہو کر سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے یوں لگا۔ جیسے وہ سردیوں کی سنہری سنہری چمکیلی دھوپ ہو۔ اپنی آنکھوں میں مسرتوں کا گھلتا ہوا غماز اور وجود میں ڈھلتی کیف و مسرت کی لہریں اس میں غرور و تفاخر کا ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔ سکون طمانیت اور آسودگی کا احساس فرحت بخش تھا۔

اور جب

پچھے سے چپکے چپکے مجید نے آ کر اپنے گرم گرم ہونٹ اس کی گردن کے انتہائی حساس حصے پر رکھ دیئے تو جوش مسرت سے بے قابو ہو کر وہ پلٹی اور اپنے بازو والہانہ انداز میں مجید کے گلے میں ڈال کر سر اس کے سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کے بعد آج پہلی دفعہ اس نے محبت کا حقیقی احساس پایا تھا۔

پیار کی لذت سے سرشار ہوئی تھی۔

اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بے چینی بے قراری اور اضطراب پوری طرح سکون پا گئے تھے۔

☆☆☆

دشمن

سریگ کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ کیمپ نمبر اٹھتر کے مکینوں نے فرار کی سکیم بنائی تھی۔ دشمن کی قید سے رہا ہونے کی سکیم۔ نگلی سنگینوں، راتفلوں، شین گنوں، برین گنوں اور جانے کیسی کیسی گنوں کے حلقے توڑ کر نکل بھاگنے کا خیال ہی خود کشی تھا۔ ہاں سریگ کے ذریعے سے نکل بھاگنے کی جدوجہد قابل عمل تھی۔ اس سکیم میں تین سو سے زیادہ جوان شریک تھے۔ آفیسر بھی تھے۔ اور سپاہی بھی..... سچی لگن سے کام ہو رہا تھا۔ اعتماد اور اتحاد کا اتار روح پرور نظارہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

یہ کیمپ جنگی قیدیوں کی چھوٹی سی اپنی دنیا تھی۔ اس دنیا میں ان کی اپنی سوچیں تھیں۔ اپنے ضابطے تھے۔ اور اپنی راہیں تھیں۔ سب ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے۔ کہ اخوت اور بھائی چارے نے اپنا اصلی مفہوم پالیا تھا۔ کوئی طبقاتی فرق تھا نہ سیاسی تفرقہ..... اونچ تھی نہ نیچ..... سب ایک ہی سطح پر تھے۔ ملک و ملت سے کٹ کر اپنوں سے بچھڑ کر سب نے یہ دنیا بسالی تھی۔

سب کے دل تقریباً ایک جیسے جذبات ہی سے معمور تھے۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی تمنا ٹپ بن گئی تھی۔ دشمن اور دشمن ہو گئے تھے۔ اور وطن کی حرمت پر کٹ مرنے کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ غلامی کی یہ تضحیک ان کی برداشت سے باہر

آئیڈیل

ہوتی جا رہی تھی۔ یہ قید ایک مسلسل ذہنی اذیت تھی۔ وہ اس دشمن کے شکنجے میں آ گئے تھے۔ جسے کبھی درخور اعتنا ہی نہ سمجھا تھا۔ ان کی ملی غیرت لمحہ بہ لمحہ چیلنج بنتی جا رہی تھی احساس خفت و ندامت بڑھتا جا رہا تھا۔ خاص کر جب وہ اپنے ساتھ خواتین اور بچوں کو بھی کیمپ میں ذلت آمیز زندگی جھیلے دیکھتے۔ تو ان کے سینے پھٹنے لگتے۔ اور وہ اپنے ساتھ ان عناصر کو بھی کو سننے لگتے۔ جو اس ذلت کے ذمہ دار تھے۔

پھر بھی وہ: صلّوں کی شکست سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ لگن اور ہمت اور تقویت پا گئی تھی..... اجتماعی شعور بیدار ہو گیا تھا۔ اور قید کے طویل اور اذیت دہ تجربے سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وطن مذہب اور ملت کے لئے ان کے دل میں بڑے پرجوش اور بلند عزائم بیدار ہو گئے تھے۔ ذات کے بند خولوں سے وہ پھٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ گھر بار بیوی بچے بہن بھائی ماں باپ سب ثانوی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ وہ تو پھیل کر کھل بن گئے تھے۔ اور یہ سب چیزیں اس کھل کے معمولی جزو تھے۔

بیس بائیس سالہ اشرف بھی اسی کیمپ کا مکین تھا۔ دو تین سال پہلے جب اس کی پوسٹنگ ایسٹ پاکستان ہوئی تھی۔ تو اپنے گھر والوں سے پچھرتے ہوئے اس کا دل رو رہا تھا..... بیزاری اور کوفت اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ وہ صرف اپنے اور اپنے گھر والوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لیکن گھر سے ہزاروں میل دور سلہٹ میں رہ کر اس نے اپنی انفرادی سوچ کو اجتماعی بنا لیا تھا۔ اور پھر جب جنگ شروع ہوئی تھی۔ تو اس نے اپنے آپ میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی تھی۔ جوش جذبہ اور ولولہ اس کی ذات میں قدرتی چشموں کی طرح پھوٹ پڑا تھا۔ وطن کی آبرو و حرمت کے لئے جان کی بازی لگا کر اس نے شجاعت اور بہادری کی وہ بے مثال داستانیں رقم کی تھیں۔ جنہیں سن کر انسانی ذہن کے لئے تسلیم کرنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔

وہ خود بھی کہتا..... میں سویا ہوا تھا۔ جنگ کے دھچکے نے مجھے بیدار کر دیا..... یہ بیداری قوم کے لئے ایک روشن چراغ تھی۔

ہتھیار ڈال دینے کی روح فرسا خبر اس نے سنی تھی۔ تو جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔ اس

آئیڈیل

کا ذہن یہ بات قبول کرنے ہی کو تیار نہ تھا۔ بے دست و پا ہو کر دشمن کے رحم و کرم پر پڑ جانے سے تو اپنی کینٹی پر گولی داغ لینا کہیں زیادہ سہل تھا۔

لیکن ہونی ہو کر رہی..... چند افراد کی غلطیاں کوتاہیاں لغزشیں قوم کو وقت کی سب سے بڑی ذلت سے ہمکنار کر گئیں۔ جس دن اس کی رجنٹ سے ہتھیار رکھوائے گئے اس دن وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔

قید میں وہ ایک لمحہ کو بھی کم حوصلہ نہ ہوا۔ ایک ایک کٹھن گھڑی اور ایک ایک خون آلود لمحے نے اسے وطن کی محبت اور ملت کی حرمت کا درس دیا۔ اس کا وہ اپنا آپ جو آج تک خود اس کی نظروں سے بھی اوجھل تھا۔ اس کے سامنے آ گیا۔ یہ اپنا آپ دشمن کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ ہر وقت اس شکست کا اس ذلت کا انتقام لینے کی تدابیر سوچتا رہتا۔ وہ برق بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے تصورات میں ڈوب رہتا..... وہ دشمن کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے متعلق سوچتا رہتا..... شعلہ بن کر اپنے حریف کو خس و خاشاک کی طرح بھسم کر ڈالنے کی عملی راہیں تیار کرتا رہتا۔

اور یوں آزاد ہو کر اپنے وطن پہنچ جانے کی تڑپ اور بڑھ جاتی۔ اپنا وطن جہاں پہنچ کر آزادی کی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے وہ ذلت اور شکست کا انتقام لینے کی سوچتا رہتا.....

سریگ کا منصوبہ مشترک تھا۔ لیکن وہ سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ سریگ کھودنا کون سا آسان کام تھا۔ انسانی عقل بھی اس عمل پر دنگ رہ جائے دشمن کی کڑی نگرانی..... اور ہلاکت کے ہر آن خطرے سے دوچار ہوتے ہوئے بغیر کسی اوزار یا ہتھیار کے یہ کام کرنا اتنا بڑا کارنامہ تھا۔ کہ ان دلیروں اور شیروں کا نام تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔

چائے کے چچوں اور سالن سے نکالی ہوئی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں سے سرنگیں کھودنے کا کوئی تصور بھی کر سکتا؟ لیکن کیمپ کے قیدی سچے جذبے سے یہ کام کر رہے تھے۔ اور جذبے کبھی شکست نہیں کھاتے۔ کھودی ہوئی مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر غسل خانوں میں پانی

آئیڈیل

میں تحلیل کر کے بہائی جاتیں۔ پتلونوں کی جیبوں میں مٹی ڈال کر ایکس راز اور پریڈ کی جاتی۔ پھٹی ہوئی جیبوں سے مٹی اچھلنے کو دے اور پریڈ کے درمیان ضائع ہوتی رہتی۔ منوں مٹی کو کھانے کے طریق بھی ان اولوالعزم لوگوں نے سوچ لئے تھے۔

وہ دن بھی اپنی نوعیت کا آپ تھا۔ سرنگ مکمل ہو چکی تھی۔ اور فرار کا منصوبہ تکمیل پانے کو تھا۔ تیرہ و تار رات کے اونگھنے لحوں میں نکل بھاگنے کا پروگرام تھا ہر دل کیف مسرت سے لبریز تھا۔ جوش اور ولولے کو مستور رکھنے کی شعوری کوشش کی جا رہی تھی۔ منزل اتنی قریب آ رہی تھی کہ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو لینا ممکن ہو گیا تھا دل دھڑک رہے تھے آنکھیں پھیلی جا رہی تھیں اور دماغ ان انتہائی حساس لحوں کو چھو کر جیسے سن ہوئے جا رہے تھے۔

لیکن

وہ لمحہ قیامت کا لمحہ تھا۔ جب فرار ہونے والوں نے دیکھا۔ کہ سرنگ کے عین دہانے پر مسلح بھارتی سپاہی ہلاکت کا نشان بنے کھڑے ہیں۔

پھر سائرن بج اٹھے۔ افراتفری مچ گئی۔ اور گولیوں کی بوچھاڑیں آنے لگیں کئی جوان زخمی ہو گئے..... زمین پر تڑپنے والے زخمیوں کو دیکھ کر حراست میں آنے والوں کے دل خون ہونے لگے۔ یہ اسیری میں اسیر ہونے کا ایک اور نیا تجربہ تھا۔

اشرف بھی ان سرکردہ کارکنوں میں سے ایک تھا۔ جس پر دشمن نے مظالم کی انتہا کر دی۔ کئی دن اور راتیں اسے کرسی پر بٹھائے رکھا گیا۔ سونے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کی آنکھیں شدت کرب سے پھٹنے لگیں۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اور جب اس پر غشی طاری ہو گئی تو اسے اپنے جرم کی پاداش میں سیل میں بند کر دیا گیا۔ اور پھر اس پر ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اور پھر اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن اشرف سیلاب بلا کے سامنے موٹے کی چٹان بن کر اس طرح ڈٹ گیا۔ کہ ظلم کرنے والے بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

چند فٹ کی کوٹھڑی دھوپ کی براہ راست زد میں تھی۔ جون جولائی کی جھلسا دینے

آئیڈیل

والی گرمی جس اور گھٹن میں اسے صبح و شام صرف ایک ایک بوتل پانی کی دی جاتی۔ اور جب وہ وقفوں کے بعد آدھا آدھا گھونٹ حلق سے اتارتا اسی سے خشک ہونٹ تر کرتا۔ اور ہتھیلی پر ڈال کر چہرے اور گردن پر ڈالتا۔ تو اسے یوں لگتا۔ جیسے یہ آب حیات ہے اور اسے ان قطروں سے ابدی حیات مل رہی ہے۔ اس ابدی حیات کو ایک ایک لمحہ وہ دشمن کو نیچا دکھانے میں صرف کرنے کا تہیہ کر لیتا۔ کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوتی۔ وہ تو انتہائی سہل پسند تھا آسودگی کا ہر آن متمنی..... آسائش کا متلاشی..... یہ کیا شے تھی۔ جو اس کے اندر بیدار ہو گئی تھی۔ کہ آسودگی و آسائش کو بھلا کر کوفت و اذیت میں بھی لذت کا ساماں پیدا کر رہی تھی۔

اسے یاد پڑتا کہ سلہٹ آنے پر اس کے جذبات کسی طور صحت مند نہ تھے۔ وہ بڑبڑایا بھی تھا۔ اور الجھا بھی تھا۔ ڈر و خوف بھی اپنے رگ و پے میں اترتا محسوس کیا تھا۔ لیکن جب وقت پڑا تھا۔ تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی مسکرایا تھا۔ ہر سختی خندہ پیشانی سے جھیل رہا تھا۔ ہر وار اس میں سرکشی اور ماحول سے بغاوت کے جذبات بڑھا رہا تھا۔

رہائی اور وطن پہنچنے کی لگن اور بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کا ذہن تیزی سے منصوبے بنانے لگا..... کبھی کبھی تو وہ انہونی باتیں سوچنے لگتا۔ اس کا جی چاہتا..... موٹی موٹی آہنی سلاخیں پوری قوت سے اس طرح دھکیلے کہ وہ موم کی طرح پگھل جائیں..... کبھی وہ اس موٹے سے لوہے کے تالے کو توڑنے کا سوچتا جو اندر نہیں باہر لگا ہوا تھا..... سلاخوں سے ہاتھ نکال کر اس نے کئی بار کوشش بھی کی۔ لیکن اپنی کوشش پر ہنسی بھی آئی۔ اور رونا بھی۔

وہ سلاخوں کے پیچھے پابند اور مجبور تھا۔ سامنے والے سیلوں پر اس کی نظر پڑتی تو اسے یوں لگتا..... جیسے وہ سب جانور ہیں۔ جنہیں موٹی موٹی سلاخوں کے پیچھے تنگ کوٹھڑیوں میں محبوس کیا گیا ہے۔

لیکن

آئیڈیل

اس تخریبی سوچ کو وہ ذہن سے جھٹک کر نکال دیتا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلانے لگتا۔ کہ وہ جانور نہیں بہادر انسان ہیں۔ ان کی بہادری سے خائف ہو کر ہی تو دشمن نے ایسے اقدام کئے ہیں۔ اگر دشمن خائف نہیں تو ذرا چھوڑ کر دیکھیے؟

اس کی پہرہ دیتے ہوئے سنتریوں پر نظر پڑتی۔ تو اکثر ان کا منہ چڑا دیتا..... وہ خوفناک آنکھوں سے اسے گھورتے تو یہ قہقہے لگاتا..... کتنا مزہ آتا تھا اسے اس شرارت میں.....

لمحوں کو دھکیلنے کے لئے اب اس نے اپنی توجہ قرآن پاک کی طرف منتقل کر لی۔ وہ بڑے انہماک سے آسمانی صحیفے کی تلاوت کرتا اور پھر ترجمہ اور تفسیر پڑھتا..... اسے کتنا سکون ملتا..... کیسا اطمینان نصیب ہوتا۔ اندھیروں کے سارے غبار چھٹ جاتے اور چاروں طرف نورانی روشنی کا احساس ہونے لگتا۔ ہر نماز اور تلاوت کے بعد وہ بڑے خضوع و خشوع سے ملک و ملت کی عظمت کی دعائیں مانگنے کے بعد اپنی معجزانہ رہائی کا بھی اللہ میاں سے طلب گار ہوتا۔

اب اس نے سنتریوں کا منہ چڑانا چھوڑ دیا۔ اس کے ذہن میں کسی نئے منصوبے کے خطوط وضع ہو رہے تھے۔ سپاہی چرن داس جو اس کا کھانا لاتا تھا۔ اور رام نرائن جو بندوق کندھے سے لگائے قفل آلود سلاخوں کے باہر پہرہ دیتا تھا۔ اس سے کچھ کچھ بے تکلف ہو گئے تھے۔

چرن داس جب مٹی ملی۔ چپاتی نما کوئی چیز اس کے آگے پھینک دیتا۔ تو وہ مسکرا کر کہتا..... ”چرن داس میرے دیس کی چکیلی گندم دیکھی ہے کبھی؟.....“

چرن داس وارڈ کے خوف سے جلدی سے پرے ہٹ جاتا۔ قیدیوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی گفتگو کی انہیں اجازت نہ تھی..... لیکن چرن داس کے اندر کا انسان بے چین ضرور ہو جاتا۔

اور اسی طرح جب وہ نرائن کو مستعدی سے پہرہ دیتے ہوئے دیکھتا تو ہنس کر کہتا ”تم کتنے بے وقوف ہو میرے دوست۔ اتنی اتنی موٹی لوہے کی سلاخیں۔ ادھر سے ایسا

آئیڈیل

بڑا قفل..... جب بھی پہرہ دیئے جا رہے ہو۔ کس بات کا خطرہ محسوس کرتے ہو..... تم لوگ ڈرتے ہو کہ ہم بھاگ جائیں گے۔ دیکھو تو سہی یہاں سے بھاگا جاسکتا ہے.....“

رام نرائن ٹھک سے اپنا وزنی بوٹ زمین پر مارتا اور راقفل کندھے سے لگا کر فوجی قدم اٹھاتا۔ اور مستعدی سے پہرہ دینے لگتا..... لیکن اس کا دل بھی اس نوجوان کی طرف کچھ نہ کچھ جھکتا جا رہا تھا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ رام نرائن اور چرن داس کے رویے میں قدرے چلک آ گئی تھی۔ اب چپاتیاں جلی ہوئی نہ ہوتیں۔ اور رام نرائن جب اسے نہانے دھونے کے لئے ٹل تک لے کر جاتا۔ تو راقفل کے بٹ سے دھکے نہ دیتا۔ گو ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے وہ اب بھی اس سے ترش کلامی سے پیش آتا تھا۔

اشرف اپنے ذہنی خاکے کو عملی شکل دینے کے لئے کوشاں رہا۔ اس کے ساتھ والے سیلوں کے قیدی جانے کیا کیا منصوبے بنا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو خبر کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔ ہاں کبھی کبھی دوسرے ساتھیوں کو زور زور سے آوازیں دے لیتا۔ اور کبھی یا علی مدد کا فلک شکاف نعرہ لگاتا..... ان باتوں پر اسے کئی دفعہ وارننگ بھی مل چکی تھی۔

رام نرائن اس کے نعرہ حیدری سے بڑا بدکتا تھا۔ اس لئے جب بھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دوسرے ساتھیوں کو دلانے کے لئے زور سے نعرہ لگاتا۔ تو رام نرائن سلاخوں پر بندوق کا بٹ مارتے ہوئے اُسے ڈانٹ دیتا۔

”تم بہت خبیث ہو.....“ رام نرائن گھور کر کہتا۔

”تمہاری لغات میں اپنے مذہب اور وطن سے محبت کرنے والے کو خبیث کہتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے سلاخوں کے پیچھے سے بولتا۔

رام نرائن پرے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا۔

لیکن

اس نے رام نرائن سے دوستی بڑھا ہی لی۔ وہ رام نرائن کے اندر کے انسان کو

بیدار کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ اندر کا انسان جو ہندو تھا نہ مسلمان۔ سکھ تھا نہ عیسائی صرف انسان تھا۔

اور

اس انسان نے اسے حدود کے اندر تھوڑی تھوڑی مراعات دینا شروع کر دیں۔ جب گرمی حد سے گزر جاتی تو وہ اسے تولیہ گیلہ کر کے چپکے سے پکڑا دیتا۔ کبھی کبھی کہیں سے برف بھی لے آتا اور اندھیری راتوں میں جب برسات کے سیاہ بادل امنڈ امنڈ کر اندھیروں کو اور گہرا کر دیتے وہ سلاخوں کے ساتھ چپکا اس سے ڈھیروں باتیں کرتا رہتا۔

وہ تیرہ و تار رات تھی۔ کبھی کبھی بجلیوں کے خنجر بادلوں کے سینے میں لہرا جاتے تو ایک چکا چونڈی پیدا ہو جاتی..... اور پھر احتجاج کے طو پر گھٹائیں گڑا جاتیں..... ہوا بالکل بند تھی۔ اور کوٹھڑی میں جس گھٹن بنتی جا رہی تھی۔

”رام نرائن“ اس نے سلاخوں کے ساتھ ماتھا ٹکاتے ہوئے کہا۔

”ہوں“

”آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔“

”کیا ہے؟“

”پیٹ میں بار بار مروڑ پڑتا ہے۔“

”کب سے؟“

”سارا دن ہی گزر گیا۔“

”پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”سوچا تھا آرام آ جائے گا۔“

”سک رپورٹ کر دوں۔“

”نہیں.....“

”تو پھر.....“

”مجھے باتھ روم تک لے چلو۔“

رام نرائن ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ یوں جیسے کہیں بھوت نظر آ گیا ہو۔ گھبرا کر بولا

”یہ وقت نہیں ہے.....“

وہ کراہتے ہوئے ہنس پڑا..... پھر پیٹ پکڑتے ہوئے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا

”یار ایسے بے رحم تو نہ بنو۔“

”لیکن“

”لیکن کیا..... اتنا اندھیرا ہے..... دو منٹ میں فارغ ہو کر آ جاؤں گا۔“

رام نرائن چپ رہا۔

”حد ہو گئی..... ڈرتے کیوں ہو۔ بھاگ تو نہیں جاؤں گا۔ اتنی کڑی نگرانی اور

زبردست پہرے میں بھی تمہیں شک ہوتا ہے..... کہ بھاگ جاؤں گا.....“

رام نرائن تذبذب میں تھا۔

وہ شدت درد سے دوہرا ہو گیا..... جب ذرا سنبھلا تو رام نرائن کا جذبہ ترم بیدار

تھا۔

”یار..... کچھ تو خدا کا خوف کھاؤ..... رائفل تمہارے پاس ہے۔ بھاگنے کی

کوشش کی تو گولی داغ دینا۔ وسل بجا دینا.....“

”نہیں بھاگ کہاں سکتے ہو..... ہمارا پہرہ سنگین ہے۔“

”تو پھر“

رام نرائن چند لمبے چپ رہا پھر آگے بڑھا اور قفل کھول دیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی

رام نرائن نے رائفل کا منہ اس کی طرف کر دیا.....“

اور

وہ پشت پر دونالی بندوق کے سرے کو محسوس کرتا غسل خانے میں چلا گیا۔

لیکن دروازہ بند کرتے ہی ایک دم کھول کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ”رام

نرائن“

”کیا ہے۔“ وہ بندوق تانے بولا.....“

”غسل خانے کی.....“

”کیا ہوا.....“

”دیوار کس نے توڑی ہے..... کوئی نکل بھاگا ہے ادھر سے“ گھبراہٹ میں تیزی سے اس نے کچھ اس طرح کہا..... کہ رام نرائن نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دیوار کو دیکھا۔

یہی

وہ لمحہ تھا۔ جو اشرف کو جان کی بازی لگا کر میسر آیا تھا۔ اس کے پاؤں میں اپنا پاؤں پھنسا کر اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں رام نرائن کو پہنچی دی تھی۔ وہ اوندھا گرا.....

اور

برق کی سی تیزی سے وہ اس کی پشت پر سوار اس کا منہ ہاتھ سے بند کئے رانفل چھین چکا تھا۔ ”آواز نکالی تو۔ گولی تمہارے سینے سے پار نہیں ہوگی۔ میرے ہاتھ تمہارا گلا اس طرح گھونٹیں گے کہ دوسرا سانس نہ لے پاؤ گے۔“ پھراتی عجلت سے کہ اس کا تصور بھی نہ کیا جاسکے۔ اس نے رام نرائن کے کپڑے اتارے منہ میں کپڑا ٹھونسا اس کے پشت پر ہاتھ باندھے۔ اور ایک طرف ڈال کر جلدی جلدی وردی پہن لی۔

جب وہ غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے نکلا تو وہ رام نرائن تھا۔ اس کی وردی میں۔ اس کی رانفل کندھے سے لگائے اسی کے انداز میں قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ اس کی چال ڈھال دنوں سے نوٹ کر رہا تھا۔ گفتار کا انداز بھی اپنا لیا تھا۔

گھر آنے والے بادل اب ٹکرا ٹکرا کر پھٹ رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی..... اندھیرا چھایا ہوا تھا..... قدرت شاید اس کی مدد خود کر رہی تھی۔ آج صبح اس نے نماز کے بعد دعا بھی تو کچھ اس انداز سے مانگی تھی۔ وہ سجدے میں گڑ گڑایا تھا۔ ”میرے

سچے رب۔ آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ میں اس کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں حق پر ہوں۔ تو اس حق کی مدد فرما۔ اگر آج میں بچ کر نکل نہ سکا۔ تو میں تجھ سے باغی ہو جاؤں گا۔ تیری قدرتوں اور کرشموں سے انکاری ہونے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھوں گا..... لیکن میرے مولا میں نہیں چاہتا کہ میں باغی اور سرکش ہو جاؤں..... تو اپنی رحمت کا سایہ مجھ پر اپنی شان کے شایاں کر دے۔ مجھے دشمن کی قید سے رہائی دلا دے۔ کہ میں انسان ہوں۔ اور اب میری قوت برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں جو جسمانی سے زیادہ ذہنی ہیں۔ جھیلنے کی تاب نہیں رہی۔ مجھے دشمنوں کے پنجرے سے نکال کر مقدس سرزمین پر پہنچا دے۔ میں اپنے وطن کے دشمنوں کے درمیان رہ کر نہیں جی سکتا..... نہیں جی سکتا۔“

کیمپ سے نکل جانا اب اتنا مشکل نہ تھا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آریا پار ہو جانے کا جب دل میں جذبہ بیدار ہو جائے تو ڈر و خوف دم توڑ دیتے ہیں۔

کیمپ سے نکل کر بھی پاکستان پہنچنے کا مرحلہ کچھ کم نہ تھا۔ فرار کی اطلاع ملتے ہی ملک کے طول و عرض میں اس کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس لئے وہ سنبھل سنبھل کر ہر قدم اٹھا رہا تھا۔ یہ بھی اک ہو شر باداستان تھی۔

وہ کیمپ سے نکل کر جب بڑی سڑک پر آیا۔ تو چار بج چکے تھے۔ اسے سمتوں کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن بادل ابھی گھرے ہوئے تھے۔ اس طرح ستاروں سے بھی سمت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔ وہ سڑک پر چند لمحے کھڑا رہا۔ اور پھر اللہ کا نام لے کر قدم اٹھائے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ اس کی جیب میں ستانوے روپے تھے، اس نے بمبئی جانے والی گاڑی اسٹیشن پر کھڑی دیکھی۔ ذہن میں بجلی سی کوندی۔ پاکستان کی طرف آج جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ الٹی طرف جانے میں مصلحت سمجھتے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھا۔ اور یہاں سے تیسرے اسٹیشن کا ٹکٹ لے لیا۔

بڑے اعتماد سے اس نے ناشتہ کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ سفر کے دوران وہ آئندہ کے لئے لائحہ عمل سوچنے لگا۔

یہ شہر بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن اسے اس سے کیا۔ اس نے تو ایک جوڑا کپڑا خریدا تھا..... پتلون اور قمیض خریدی۔ اور سٹیشن کے ویٹنگ روم میں کپڑے تبدیل کئے۔ شام کی گاڑی سے اس نے امرتسر کا ٹکٹ خریدا..... اور اطمینان سے سفر شروع کر دیا گو خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ لیکن اپنی کوشش پر اعتماد اور خدائے بزرگ و برتر کی ذات سے امید..... یہی دونوں چیزیں اس کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

امرتسر سے چند میل ادھر ہی وہ گاڑی سے اتر گیا۔ کسی چھوٹے سے سٹیشن کا سگنل نہ ہونے سے گاڑی رکی تھی..... اس کا اندازہ تھا کہ اب تک اس کے فرار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہوگی۔ اور ممکن ہے سٹیشن پر ناکہ بندی ہوئی ہو۔ اسی لئے وہ یہاں اتر گیا۔

پھر کئی راتیں وہ پیدل چلا..... دن چھپ چھپ کر گزارے۔ ہلاکت کی تلوار ہر آن سر پر لٹکتی رہتی..... لیکن اس کا عزم نہیں ڈگ گیا..... بھوکا پیاسا وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے لگا رہا۔

اور

جب وہ پاکستان کی سرزمین پر پہنچا۔ تو اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ خوشی کی انتہا اور تھکان کی زیادتی تھی۔ وہ ایک درخت تلے لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر تشکر.....

وہ دشمنوں کے زرنغے سے نکل آیا تھا۔ ان کی زد سے باہر تھا۔ پاک وطن کی پاک سرزمین پر تھا۔ کبھی اس پر رقت طاری ہو جاتی۔ اور کبھی مسکرانے لگتا۔

یوں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

وہ سکون و اطمینان کی نیند جانے کتنے گھنٹوں سویا رہتا۔ کہ اسے کمر میں بوٹوں کی مسلسل ٹھوکریں محسوس ہوئیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو دیکھا دو سپاہی جیسے اس کا

محاصرہ کئے ہوئے تھے۔

یہ رہنجز تھے اور اسے سمجھ سمجھ رہے تھے۔

یہ بات اسے اتنی مضحکہ خیز لگی۔ کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا..... "یہ پاکستان ہی ہے نا!" اس نے ہنسنے کے بعد ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

اور

جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے پوری روئیداد انہیں سنا ڈالی۔ رہنجز بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جان چھڑانے کو ایسی باتیں گھڑ لینا ان کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی.....

وہ ان کی تقریباً حراست میں لاہور آیا..... اور متعلقہ آفس میں جا کر رپورٹ درج کرائی.....

قوم کے اس جانباز انسان کی روئیداد عقیدت سے سنی گئی۔ تحسین و آفرین کے کلمات سے نوازا گیا..... اس کی بہادری کو سراہا گیا.....

اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

ساری کارروائیوں سے فارغ ہو کر اسے اپنا گھریا د آیا۔ ماں باپ بھائی بہن سب یاد آنے لگے..... ان کی خوشیوں کا احساس کر کے وہ جھوم سا گیا۔

اپنی آمد کی اطلاع دیئے بغیر وہ گھر روانہ ہو گیا۔ وہ اچانک پہنچ کر سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دینا چاہتا تھا۔

کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا اور جب اسے پکڑ پکڑ کر چھو چھو کر سب اطمینان کریں گے۔ تو وہ لمحہ کتنا پُر مسرت ہوگا۔ سارا راستہ وہ سوچتا رہا.....

گھر کوئی دور نہیں تھا۔ بڑی سڑک سے کچی سڑک اترتی تھی۔ اسی پر چند گز کے فاصلے پر ان کا چھوٹا سا مکان تھا..... آدھا کچا آدھا پکا..... یہیں اس کے ماں باپ

رہتے تھے۔ دو بھائی اور تین بہنیں رہتی تھیں..... کچی سڑک پر اترنے سے پہلے وہ چند لمحے رکا۔ اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ اپنی غیر موجودگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا

شاید اندازہ کر رہا تھا۔

سب کچھ وہی تھا۔ کچھ خاص تبدیلی نہ آئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی دو کانیں بن گئی تھیں۔ اور سڑک پار والی کوٹھی جس میں شاید کوئی جشن ہو رہا تھا۔ بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ پرانا لبادہ اتار کر جیسے اس نے جگمگا تالباں پہن لیا ہو..... اسے کچھ کچھ ذہنی کوفت بھی ہوئی..... جس قوم کے ہزاروں افراد بدترین دشمن کے چنگل میں ہوں۔ اسے جشن منانے کا حق پہنچتا ہے۔

وہ سوچتا ہوا کچی سڑک پر اتر گیا۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

اپنے گھر کے باہر وہ چند لمحے رکا۔ کیا ایک دم اندر جا کر سب کو متحیر کرنا چاہیے۔ یا کچھ اور کرنا چاہیے؟

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ دروازہ کھلا اور کوئی ادھیڑ عمر آدمی اندر سے نکلا یہ صورت اجنبی تھی۔ دماغ پر زور دینے پر بھی مانوسیت کا احساس نہ ہوا۔

اسے چپ کھڑے دیکھ کر اس معمر شخص نے پوچھا ”آپ کو کسی سے ملنا ہے“

”جی رحمت صاحب سے“

”رحمت صاحب سے“ معمر آدمی نے اسے سر تاپا دیکھا۔

ان نظروں سے وہ کانپ گیا۔ کہیں ابا..... کو کچھ..... وہ اتنا ہی سوچ سکا۔

”آپ لگتا ہے..... اجنبی ہیں۔ یادیر سے آئے ہیں“

”کیا مطلب“

”بھی انہیں تو یہ مکان بیچے سال بھر ہو رہا ہے“

”مکان بیچے“

”ہاں“

”کہاں گئے مکان بیچ کر.....“

”یہ جو بڑی سڑک پر سامنے ہی کوٹھی ہے نا..... وہ خرید لی تھی انہوں نے“ بھی وہی سامنے والی کوٹھی۔ جہاں بہت سی بتیاں روشن ہیں..... ”معمر آدمی نے قدرے آگے

ہوتے ہوئے بے شمار چمکتی روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ کوٹھی.....“

”کوٹھی؟“

”ہاں برخوردار تمہیں اچنچا ہو رہا ہے شاید.....“

”کوٹھی کیسے خرید لی.....“

”بہت اونچے لوگ ہو گئے ہیں وہ..... لاکھوں کے پھیر ہیں لاکھوں کے۔ پارٹیاں

دعوتیں معمول ہے۔ آج بھی شاید بہت بڑی دعوت ہے ان کے ہاں.....“

وہ ششدر سا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس کا باپ امیر آدمی تھا نہ بھائی پھر یہ

دولت کہاں سے آگئی۔ شاید معمر آدمی کو مغالطہ لگا ہو..... اس نے زور دے کر کہا۔

”میں ان رحمت صاحب کا پوچھ رہا ہوں۔ جو اس گھر میں رہتے تھے..... جن کا

ایک بیٹا جنگی قیدی بھی ہے۔“

”ہاں بیٹا انہی کا تو میں نے بتایا ہے.....“ اس آدمی نے کہا۔ ”تمہیں یقین کیوں

نہیں آ رہا.....“

”لیکن.....“

”معمر آدمی مسکرایا۔

”ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی۔“ وہ بے صبری سے بولا۔

معمر آدمی بڑے طنز سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”تم اجنبی ہو شاید۔ بھئی دولت؟

جن کے گندم کے بھرے ٹرک انڈیا کو سمگل ہو رہے ہوں۔ ان کے پاس.....“

وہ اس سے آگے اور کچھ نہ سن سکا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دماغ

چکرا گیا۔“

اور

جب

وہ

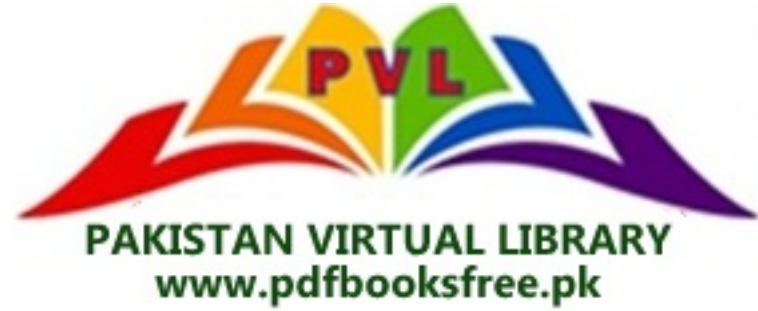
اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کے درمیان بیٹھا تھا۔
تو

اسے سمجھ نہ آرہی تھی۔
کہ

وہ دشمنوں کے زرخے سے نکل کر آیا ہے۔

یا
دشمنوں کے زرخے میں آ گیا ہے۔

☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

ادارہ خدمت خلق

آج ممبران ادارہ خدمت خلق کی میٹنگ بیگم سجاد کے ہاں تھی۔

ممبران وقت مقررہ پر پہنچ گئی تھیں اور اب بیگم سجاد کے آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ان کے نئے فرنیچر کی تعریف کر رہی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں اور قہقہے پھوار کی طرح برس رہے تھے۔ آسودہ ہنسیاں ترنم بن کر بکھر رہی تھیں۔ کمرے کے سیاہی مائل سرخ غبار میں بیگمات کے خوش نما لباسوں کے نیلے پیلے زعفرانی اور ارغوانی رنگ لہریں لے رہے تھے۔ کادانی کام چمک رہے تھے۔ ساڑھیوں کے بارڈر قمیضوں کے گلے میکسیوں کے دامن اور فلپروں کے پانچے سیاہی مائل خوابناک غبار کو جلا بخش رہے تھے۔ رنگ برنگے زیورات چمک رہے تھے۔ انگلیوں میں ڈائمنڈ کی موٹی موٹی انگوٹھیاں باتیں کرتے ہوئے ہاتھوں کے اشاروں سے چمکتی لہریں سی لہرا رہی تھیں۔

طلائی چوڑیوں کی کھنک فضا میں ترنم بکھیر رہی تھی۔
بیگم سجاد کے نئے فرنیچر کو سراہتے ہوئے سب مبارک باد کہہ رہی تھیں۔ چونتیس پینتیس سالہ بیگم سجاد بھی جا رہی تھیں بیگم سجاد اپنی دوستوں میں خاصی مقبول تھیں اپنی آرتھک نیچر کی وجہ سے ان کا مقام خاصا بلند تھا۔ میک اپ کے لئے تو ہر دوست ان سے رائے لینے میں فخر محسوس کرتی تھی۔

انہوں نے نیا فرنیچر بنوایا تھا، فرنیچر کی ساخت ان کی جدت طبع کا نتیجہ قرار دی جا

آئیڈیل
 رہی تھی۔ یہ جدت طبع کم اور نیو یارک، لندن، پیرس اور مشرق وسطیٰ میں دیکھی ہوئی چیزوں کا ملغوبہ زیادہ تھی۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ تھا کہ اس ملغوبے کو انہوں نے کاوش سے یہ رنگ دیا تھا۔ فرنیچر واقعی قیمتی خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ یوں بھی یکسانیت سے طبعیت الجھ جاتی ہے۔ فرنیچر کا نیا پن آنکھوں کو بھار ہا تھا اور یہ سب بیگمات اس نئے پن سے مرعوب ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی تعریف کر رہا تھا۔ بالکل ہی نئی ساخت کے صوفے باریک تاروں اور شیشے کی میز جنگلی جانوروں کی صورت کے سٹینڈ اور ان پر رکھے نایاب اور قیمتی ڈیکوریشن پیس دیواروں پر منقش اور لکڑی کی جالی بنے فریموں میں فرانسیسی اور ڈچ مصوروں کے نادر شاہکار۔ کون بے ذوق ہوگا جو تعریف نہ کرتا بد ذوق اور بے ذوق تو ان کی تقدیر میں بٹی ہے جن کے وہم و تصور میں بھی یہ چیزیں کبھی نہ آئی ہوں۔ یا آئی بھی ہوں، تو تصور ہی کا حصہ بن کر رہ گئی ہوں استطاعت نے منہ کی کھائی ہو۔ یہاں تو یہ معاملہ نہ تھا۔ میک اپ سے شگفتہ چہروں مصنوعی پلکوں اور قیمتی وگوں سے بالوں کے نئے نئے اسٹائل بنانے والی خواتین شہر کے متمول تاجروں کی بیگمات تھیں تعریف وہ نہ کرتیں۔ سرائیں وہ نہ اور کون بھلا سراہ سکتا تھا تعریف کر سکتا تھا۔

بیگم سجاد شان تغاخر سے مسکراتے ہوئے جھک جھک کر شکریہ ادا کر رہی تھیں کورنش بجالا کر محظوظ کر رہی تھیں۔ موسی پھلوں اور مشروبات سے نوازر رہی تھیں۔

کافی وقت یونہی مہکتی چہکار کی نظر ہو گیا۔ بیگم رفیق مصر تھیں کہ وہ بھی ایسا ہی صوفہ بنوائیں گی۔ بیگم ارشد کو افسوس تھا کہ مہینہ بھر پہلے ہی انہوں نے اخروٹ کی لکڑی کا کھدائی کے کام کا صوفہ کیوں بنوالیا۔

بیگم صبیحہ عرفان تو ہنستے ہنستے کہہ رہی تھی۔ ”یہ سٹینڈ تو میں چوری کر کے لے جاؤں گی۔“

سب کھکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور بیگم سجاد نے اس کی کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ سٹینڈ بے شک چوری کر کے لے جاؤ لیکن ڈیزائن چوری کرنے نہیں دوں گی جناب۔

آئیڈیل
 ”چڑی اور دودو۔ انہیں اور کیا چاہیے۔“ بیگم ظفر نے اپنے ہونٹوں پر لگی کس پروف اسٹک کو ننھے سے دستی رومال سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”بیگم سجاد جانتی ہیں نا۔ کوئی ایسے تھوڑا ہی اٹھا کر لے جائے گا۔ اسی لئے اتنی فراخ دلی سے کہہ دیا۔“ نفیسہ نے اپنے موٹے سے کرل کو انگلی سے چھوا۔

”تم ٹھیک سمجھیں نفیسہ، بیگم سجاد ساڑھی کا جھلملاتا پلو کندھے پر جماتے ہوئے مسکرائیں۔

”اچھا تو ایک اور بات؟“ بیگم شفیق نے سب کو ہاتھوں سے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا.....“ ایک کی جگہ کئی زبانیں ہلیں۔ اور ہر آنکھ ان کی طرف اٹھ گئی۔ اشتیاق سے سب ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ بیگم شفیق ساختہ ادا سے سر کو جھٹک کر بیگم سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائیں، پھر بشارت سے بولیں ”ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمیں نہ تو یہ فرنیچر چوری کرنے دیں گی۔ اور نہ ہی ڈیزائن چرانے۔“

”بالکل“ فوم کاشن پہلو تلے دبائے بیگم سجاد اٹھلائیں۔

”تو پھر سزا کے طور پر ہم میں سے ان ممبران کے لئے جو فرنیچر بنوانے کی خواہش مند ہیں۔“ وہ جان بوجھ کر رکی۔

”ہاں ہاں“ سبھی نے جلدی سے کہا۔

”ان کے لئے“ وہ ایک ہاتھ کی انگشت شہادت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر چبا چبا کر بولی۔ ”تو ان کے لئے سزا کے طور پر آپ نئے نئے ڈیزائن تیار کریں۔ جو بیشک آپ کے ڈیزائن کا چربہ نہ ہوں نئے ہوں انوکھے ہوں۔“

”بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔“ سبھی نے کہا۔ بیگم رفیق کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ہنسی باتوں اور قہقہوں کی پھوار پھر برسنے لگی۔

”جی ہاں ضرور“ بیگم سجاد ہنسیں ”میں آپ سب کو بیکار نظر آتی ہوں نا“ ”ہم

معاوضہ دیں گے۔“ بیگم شفیق نے سب کی طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھا۔
”کیا دیں گی۔؟“ بیگم سجاد مسکرائی۔

”انٹرکون میں شاندار دعوت۔“ بیگم شفیق نے کہا۔ اور جب بہت خوب بہت خوب کے ساتھ تالیاں بجا کر ان کو داد دی گئی۔ تو وہ بازو پھیلا کر سر جھکانے لگی۔

”منظور ہے۔“ بیگم سجاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک شرط؟“

”دعوت اکیلے اکیلے نہیں۔ اپنے اپنے صاحب بھی ساتھ ہوں گے۔“ بیگم سجاد

نے کہا۔

”وہ تو ہوں گے ہی۔“ تائید میں بہت سی آوازیں آئیں۔

اور جب زمانے بھر کی باتیں ہو چکیں۔ چائے پی جا چکی تو بیگم سجاد اس میٹنگ کے انعقاد کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔

ادارہ ”خدمت خلق“ ان سب ممبران کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ جس مقصد کے لئے یہ ادارہ وجود میں آیا تھا۔ وہ بیگم ارشاد کے یہاں سے تبدیل ہو کر چلے جانے کے بعد فوت ہو چکا تھا۔ بیگم ارشاد ایک سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ پہلو میں اک درد مند دل رکھتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر نوازش ان پر بارش کی طرح برسائی تھی وقت بھی تھا۔ دولت بھی۔ رفاہی کاموں میں جوانی کیا بچپن ہی سے دلچسپی لیتی تھیں۔ جب بچوں کی طرف سے بھی فارغ ہو گئیں تو انہوں نے دیانتداری سے خدمت خلق کا بیڑا اٹھایا۔ گھر میں بیٹھنے والی بیکار دولت مند خواتین اور گھریلو زندگی کو کلبوں ہوٹلوں کی نذر کرنے والی ناسمجھ متمول عورتوں کو انہوں نے اس کا رخ میں شریک کیا۔ ادارے کی تخلیق کی غرض و غایت تعمیری تھی بیگم ارشاد جیسے سلجھے ہوئے ہاتھ اسے چلا رہے تھے۔ ادارہ بہت جلد مقبول ہو گیا کئی غرض مند یہاں آئے کئی بیواؤں کو کام ملا۔ کئی یتیم بچیوں کی شادیاں ہوئیں۔ کئی مریضوں کو ہسپتالوں میں داخلے دلوائے گئے.....

لیکن بیگم ارشاد اور ان کے دست راست حمیدہ بانو کے چلے جانے سے ادارے کا تخلیقی کام ٹھنڈا پڑتا گیا۔ تعمیری کام میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے وہ

غرض و غایت ماند پڑ گئے جن کے لئے ادارہ عالم وجود میں آیا تھا۔ اور اب تو یہ خالص تجارتی قسم کا ادارہ بن چکا تھا۔ اس کی ممبران تاجروں کی بیگمات تھیں۔ جو اپنے شوہروں کی ترقی کے لئے اس ادارے کو زندہ رکھے ہوئے تھیں اب یہ ادارہ بڑے بڑے سرکاری افسروں سیکرٹریوں اور وزیروں کی بیگمات سے رابطہ رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔ ان تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھا۔

ادارے کی میٹنگ اب کبھی عمارت میں نہ ہوتی تھی جس پر ادارہ خدمت خلق کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور جہاں بوسیدہ سی دریوں اور ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر بیٹھی غریب لڑکیاں اور عورتیں کام کیا کرتی تھیں۔ زیادہ تر کام وہ خود ہی اکٹھا کر کے لاتیں اور یہاں بیٹھ کر ایک دوسرے کی مدد کر کے مزدوری کے پیسے بانٹ لیا کرتی تھیں اب میٹنگ ہمیشہ کسی نہ کسی ممبر کے ہاں ہوتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن سب ممبران جمع ہوتیں۔ تقریب بہر ملاقات والی بات تھی۔ نئے نئے کپڑوں کی نمائش نئے خریدے ہوئے زیوروں کی نمائش اور تفریحی دوروں کی روئیداد سنانے کا اس سے اچھا موقع بھلا کیسے میسر آ سکتا تھا۔ کچھ چندہ دیا جاتا۔ کچھ گھر کے فالتو بے مقصد اور فرسودہ کپڑے اور برتن جمع کئے جاتے۔ اور جب یہ شاک کافی ہو جاتا تو چھوٹا سا جلسہ کیا جاتا۔ کسی بڑے افسر سیکرٹری یا وزیر کی بیگم کو مدعو کیا جاتا غریبوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی ہوئی تقریریں پڑھی جاتیں۔ اور پھر معزز بیگم کے ہاتھ جمع شدہ کپڑے برتن اور تھوڑی بہت نقدی غرباء میں تقسیم کی جاتی۔ اس جلسے میں فوٹو گرافر کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ اور کسی نہ کسی اخباری نمائندے کی بھی گنجائش نکالی جاتی۔

اور اس ساری کارروائی کے بعد بیگم موصوفہ کو شاندار چائے دی جاتی۔ رسی کارروائی کے بعد گفتگو دوستانہ ماحول میں ڈھل جاتی اور یوں بیگم سے رابطے کی راہیں کھل جاتیں اور جب رابطہ قائم ہو جاتا۔ تو پھر دعوتیں پھیل جاتیں۔ ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع ملتے۔ بیگم صاحبہ کے نامدار شوہر سے اپنے شوہر کو ملوایا جاتا اور یوں کئی رے کام چل نکلتے۔ پرمٹ لائسنس امپورٹ ایکسپورٹ کے کئی چکر بخیر و خوبی

آئیڈیل

چل جاتے۔ حصہ پتی ایمانداری سے رکھا جاتا۔ کام کا معاوضہ جرم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ رشوت تو اسے سر پھرے لوگوں نے قرار دیا ہے جہاں تا جبر لاکھوں کا فائدہ کمائے وہاں افسر نے اگر ہزاروں پیدا کر لئے تو حرج کس بات کا معاملہ خوش اسلوبی سے چلتا جائے تو ترڈ کیا؟

ممبران کی ایک خصوصیت قابل ذکر تھی اور وہ تھا کہ ان کا اتحاد جس بیگم کے شوہر کو جس افسر سے ملنے میں دشواری ہوتی اور اس کی بیگم کے ذریعہ قائم کرنے کی توقع یقینی ہوتی اسے موقع فراہم کیا جاتا۔ اسی کے گھر میں جلسہ نمائندگان بلائی جاتی اور زیادہ سے زیادہ مراعات اسے ہی دی جاتیں۔

ان دنوں سجاد کاروباری سلسلہ میں کچھ پریشان و سرگرداں تھے۔ نیا سیکرٹری صنعت و تجارت آ گیا تھا۔ سجاد کا سارا کام ہی تلپٹ ہو گیا۔ کیونکہ نیا ڈائریکٹر بیوقوفی کی حد تک ایماندار تھا۔ رشوت تو ایک طرف وہ تو کسی قریبی اور عزیز ترین دوست کی سفارش بھی نہیں مانتا تھا۔ سجاد بہتیرے حیلے وسیلے کر چکے تھے۔ لیکن کام نہیں بن رہا تھا۔ بیگم ان کی پریشانی کا حل ڈھونڈ چکی تھی ادارہ خدمت خلق کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا تھا۔ اور سیکرٹری کی بیگم سے روابط پیدا کرنے کی ترکیب بنائی گئی تھی۔

”سامان کافی جمع ہو چکا ہے۔ چندہ بھی تقریباً پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔“ بیگم سجاد نے کھل کر اپنے مقصد کی وضاحت کرنے کے بعد کہا ”یہ سامان اور چندہ بیگم نصیر احمد کے ہاتھوں تقسیم کروایا جائے۔“

”رفیق کا کام بھی محض ان ڈائریکٹر صاحب کی مہربانی سے رکھا ہوا ہے۔“

بیگم رفیق نے منہ بنایا۔

”بہت سخت گیر قسم کا افسر ہے۔“ بیگم ارشد بولیں ”ارشد بتا رہے تھے۔“

”اسے تبدیل کروانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے آخر ہمارے تعلقات پہلے سیکرٹری کی بیگم سے بھی تو ہیں۔“

”وہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ یہ چکر چلایا بھی جائے۔ تو وقت لگے گا۔“ بیگم سجاد ہنسی

آئیڈیل

جب تک ہمارا تیا پانچا کر دے گا کم بخت۔“

”وہ تو ہے۔“ نفیسہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔“

”اس پیر کو مدعو کر لیں انہیں۔“

”ضرور ضرور“ بیگم رفیق بولی نیکی اور پوچھ پوچھ رفیق کو تو ہزار ہفتہ وار نقصان ہو

رہا ہے۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں سجاد کا تو کام ہی بند ہے“ ایک طرح سے بیگم سجاد نے تفکر کا

اظہار کیا۔

”کام بند ہے اسی لئے ہزاروں روپے اس ڈرائنگ روم کی نذر کر دیئے“ صبیحہ

ہنسی۔

”یہ سب تو چلتا ہی ہے۔“ بیگم سجاد نے خفت سے کہا۔

”ویسے بتادوں کہ فرنیچر کا آرڈر اس سیکرٹری کم بخت کے آنے سے پہلے کا دیا ہوا

تھا۔ آپ تو جانتی ہیں ان کی وجہ سے وارے نیارے تھے۔“

”ایک دفعہ مڈل ایسٹ اور ایک دفعہ کونٹینٹ کا ٹور بھی لگ گیا“ بیگم شفیع نے طنزیہ

مذاق کیا۔

”ہاں ہاں۔ بالکل انہی کی وجہ سے ورنہ جانا کوئی آسان تھوڑا ہی ہے بہت اچھے

تھے وہ سیکرٹری صاحب ہمارا باہر کا ٹور لگا۔ اور انہیں چار کنال زمین مل گئی۔“ سب ہنسنے

لگیں۔“ ہمارا کام بنان ان کے بھی تو وارے نیارے ہو گئے۔

پھر باتیں شروع ہو گئیں چنانچہ طے پایا کہ پیر کی شام بیگم نصیر احمد کو غربا میں چندے

کی رقم اور جمع کئے ہوئے کپڑے اور برتن وغیرہ تقسیم کرنے کے لئے مدعو کیا جائے۔

”پانچ سو“ بیگم شفیع نے سوچتے ہوئے کہا بہت کم رقم ہے۔ نئی بیگم صاحبہ پر پرانے

ادارے کی کارکردگی کا رعب ڈالنا ضروری ہے یوں بھی سنا ہے میاں بیوی قوم کے درد

سے صبح و شام بیتاب رہتے ہیں۔

”ہاں سننے میں یہی آیا ہے“ نفیسہ بولی۔

آئیڈیل

”غریبوں کے لئے تو تڑپتے ہیں کہ کسی طرح ان کی حالت سدھر جائے۔“ بیگم رفیق نے تمسخرانہ کہا، ”میری ایک ملنے والی ان کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔“ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں پانچ سو روپے کم ہیں۔“ بیگم شفیق بولیں۔

سبھی سوچنے لگیں۔ واقعی رقم کم تھی۔

آخر کار بیگم سجاد بولیں ”یوں کرتے ہیں۔ ہم سب ممبران سو سو دو دو سو روپیہ دیتے ہیں۔ تین چار ہزار کی رقم ضرور ہونی چاہیے۔“ ”سو سو دو دو سو سے اتنی بنے گی۔“ بیگم سجاد نے کہا۔ ”جتنی رقم زیادہ ہوگی اتنا ہی اچھا ہوگا۔ ہماری رقم کونسا ڈوب جائے گی۔ پانچ چھ ہزار ہو جائے تو اچھا ہے۔“ سب ہنس پڑیں۔

”نو کروں کو پہلے سے پکا کر دینا ہوگا۔“ بیگم رفیق نے کہا۔

”وہ تو ہو گا ہی۔ پچاس پچاس ان کو دے دیں گے باقی واپس لے لیں گے۔“

بیگم سجاد نے کہا ”ہزار ہزار یا پانچ پانچ سو بیگم نصیر احمد کے ہاتھوں دلادیں گے۔“

”ٹھیک ہے تقریباً سبھی نے تائید کی۔“ نام بھی ہو جائے گا۔ وہ مرعوب بھی ہوں گی۔ اور انشاء اللہ بگڑے کام بھی بن جائیں گے۔ مختلف آوازیں ایک ہی قسم کے کلمات کہہ رہی تھیں۔

ہر بات پوری پوری طرح طے کر لی گئی۔ بیگم نصیر چونکہ غریب نواز تھیں ایماندار تھیں۔ دل میں قوم کا درد بسائے تھیں۔ اس لئے ان کی انہی صفات کو پیش نظر رکھ کر پروگرام مرتب کیا گیا۔

بیگم سجاد نے اپنی سکیم سے سجاد کو بھی آگاہ کیا۔ ان دنوں وہ واقعی پریشان تھے۔ کئی طریقے آزما چکے تھے۔ لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ بیگم کی بات سنی تو کچھ زیادہ خوش نہ ہوئے۔

”مشکل ہی ہے۔“ وہ مایوسی سے بولے۔

آئیڈیل

”کچھ مشکل نہیں ہے۔“ ہم پری شیشے میں اتار لیں گے۔“ بیگم سجاد بڑے فخر سے اترائی ”اچھے اچھے بیگموں سے مات کھا جاتے ہیں۔“ ”سب میری طرح نہیں ہوتے“ سجاد نے مسکراتے ہوئے بیگم کو چھیڑا۔ لیکن اسے اپنی کامیابی کا پختہ یقین تھا۔

پیر کا دن طلوع ہوا۔ بیگم سجاد کی مصروفیات دید کے قابل تھیں سارے گھر میں لٹو کی طرح گھوم رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کی سج دھج پہلے ہی کیا کم تھی اسے نوک پلک سے نئے سرے سے سنوارا، پر تکلف چائے کا انتظام کیا چمن میں قنات لگوائی کرسیاں منگوائیں سٹیج بنوایا۔ لاؤڈ سپیکر کا بندوبست کیا فوٹو گرافروں کو فون کیا۔

اخباری نمائندے کو اطلاع بھیجی۔

اور پھر اس نے بیگم نصیر کو دوستی کے ٹوکن کے طور پر دینے کے لئے وہ نفرتی گلدان بھی نکالے جو وہ اردن سے لائی تھیں۔

اپنی ملنے جلنے والیوں کو وہ پہلے ہی مطلع کر چکی تھیں ایک ایک دو دو نوکر گندے کپڑوں میں ساتھ لانے کا بھی کہہ دیا تھا۔ کچھ باضابطہ غریبوں کو بھی بلوایا تھا۔ انہیں کپڑے اور برتن دینا تھے جنہیں پانچ پانچ سو کی رقمیں دلوانا تھیں وہ ان کے اور ان کے ممبروں کے بیروں خانسا ماؤں کی بیویاں تھیں یہ بات پہلے ہی سے متفقہ طور پر طے پا چکی تھی۔

آج بیگم سجاد نے ہلکے فیروز کی رنگ کی سادہ سی ساڑھی پہنی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ بالوں کی ویک بھی نہیں لگائی اور ہیرے کی بڑی بڑی انگوٹھیاں بھی اتار کر رکھ دیں۔

وقت مقررہ سے پہلے ہی لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ نوکروں کے ٹولے اور غریب و نادار عورتیں اور بچے آس کی شمعیں آنکھوں میں جلانے کرسیوں اور سٹیج کے درمیان چھوڑی ہوئی جگہ بھرنے لگے۔

ممبران بھی آ پہنچیں آج سادگی کو شعار بنایا گیا تھا۔ میک اپ بھی سادہ سادہ تھا۔

بہروپ کے باوجود امارت منہ سے بول رہی تھی اور قیمتی پرفیوم فضا کو مہکاتے ہوئے اس بہروپ کا تسخراڑ رہی تھیں۔

بیگم نصیر احمد وقت مقررہ پر آ گئیں۔ سپید سادہ سی ساڑھی میں جب وہ اپنی فوکس وگن سے نکلیں تو استقبالیہ قطار میں کھڑی خواتین نے ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ بیگم سجاد نے اپنی مرسدیز بھیجوانے کی فون پر آفر کی تھی۔ لیکن اس نے ملائمت سے شکر یہ کہہ کر گاڑی بھیجنے کی تکلیف نہ دی تھی۔ بیگم نصیر تیس سالہ انتہائی سادہ لیکن شائستہ سی خاتون تھی۔ اس نے سفید لٹھے کی شلوار پر نیند قمیض اور اس کے ساتھ کاسنی پھولوں کا ہم رنگ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ چہرہ مصنوعی پلکوں فاؤنڈیشن کریموں مسکaroں اور آئی لائٹروں سے بے نیاز تھا۔ ہلکی سی لپ اسٹک کے سوا اس نے کوئی زیبائشی چیز استعمال نہ کی تھی وہ انتہائی پروقا نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس پر بیگم ہونے کا کسی طور گمان نہ گزرتا تھا۔

وہ سب سے بڑے خلوص سے ملی۔ سبھی نے محسوس کیا کہ اس کے باتیں کرنے کا اندازہ انتہائی دلنشین ہے۔

ممبران اسے جلو میں لئے ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ رسمی رسمی باتیں ہونے لگیں بیگم سجاد مشروبات پیش کرنے کو اٹھ گئیں اور وہ باقی ممبران سے باتیں کرنے لگی سب کا تفصیل تعارف ہوا۔

بڑی خوشی کی بات ہے۔ ”بیگم نصیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ آپ جیسی بیگمات کے متعلق عوام میں عام طور پر غلط سا تاثر ہوتا ہے مجھے خوشی کے ساتھ تعجب بھی ہے کہ آپ سب خدمت خلق کے جذبے سے اس قدر سرشار ہیں۔ اور ٹھوس بنیادوں پر کام بھی کر رہی ہیں قوم کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ سب خدا کے فضل سے مالی طور پر مستحکم ہیں۔ پیسے سے بھی خدمت کر سکتی ہیں اور وقت بچا کر بھی رفاہی کاموں میں صرف کر سکتی ہیں۔

وہ واقعی ان سب سے بے حد متاثر و مرعوب نظر آ رہی تھی ایسی بیگمات تو موٹر ہوٹل

اور کلب کے چکروں ہی سے نہیں نکل پاتیں اور یہ سب.....

بیگم سجاد مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کرنے آ گئیں مہمان خصوصی کو کولڈ ڈرنک پیش کی گئی۔

”یہ تکلف ضروری تھا کیا!“ بیگم نصیر احمد مسکرائی۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ بیگم سجاد نے ہنس کر کہا۔

”برانہ منائے گا۔ یہی پیسے بہتر ہوتا آپ چندہ میں جمع کروادیتیں۔“ بیگم نصیر نے ہنس کر کہا۔

”بری بات ہے بیگم نصیر صاحبہ۔“ بیگم شفیق بولیں ”آپ پہلی دفعہ تو آئی ہیں۔“

”میں جس مقصد کے لئے آئی ہوں۔ اس کے تقاضے سے کہہ رہی ہوں۔ ذاتی طور پر مہمان بن کر آتی۔ تو اور بات تھی۔“ بیگم نصیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اتنی بے تکلفانہ گفتگو سے بیگم سجاد کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا۔ ”ذاتی طور پر بھی آپ ضرور تشریف لائیں گی۔ ہم اب آپ کا پیچھا تھوڑا ہی چھوڑیں گے۔“

”شکریہ۔“ بیگم نصیر نے کہا۔ ”مجھے یقیناً آپ سب سے مل کر خوشی ہوگی۔ مخلص لوگوں کا اس دور میں قسط ہے۔ آپ سے مل کر خدمت خلق کرنے سے بے حد خوشی ہوگی۔“

خدمت خلق پر بیگمات نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراہٹوں کے دل فریب تبادلے کئے۔ کوک سیون اپ اور شیزان جس کے من پسند جو چیز تھی اٹھالی گئی اس کے ساتھ اعلیٰ قسم کے بسکٹ چپس اور خالص کشمیری خطائیاں پیش کی گئیں۔ بیگم نصیر کو تکلفات کا یہ بہاؤ قطعاً پسند نہیں تھا۔ نہ ہی وہ وقت ان لوازمات کی نذر کر سکتی تھیں۔ خالی بوتل لوٹاتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ ”وقت کافی ہو گیا ہے۔ کارروائی شروع کی جانی چاہیے۔ میرے خیال میں آپ نے بندوبست باہر کیا ہوا ہے۔“

”جی ہاں۔“ بیگم سجاد بولیں۔ وہ فی الحال بیگم نصیر کو کمرے ہی میں روکنا چاہتی تھیں۔ ابھی فوٹو گرافر نہیں پہنچا تھا۔ وہ بیگم نصیر کے ساتھ اپنے خوبصورتی اور نفاست

سے سب ڈرائنگ روم میں تصویر اتروا کر اخبار میں بھیجنا چاہتی تھیں۔

دس منٹ اور بھی انتظار کیا گیا لیکن وہ نہیں پہنچا بیگم نصیر وقت کے زیاں سے کچھ ناراض سی ہو گئیں۔ ان کے اصرار پر سب کو اٹھ کر باہر آنا پڑا۔

انہیں ادارے کے قواعد و ضوابط بتائے گئے۔ کارکردگی کا بڑھ چڑھ کر ذکر کیا گیا۔ کئی بیواؤں کو کام مہیا کرنے کا مستحسن فعل بتایا گیا۔ کئی مریضوں کو ہسپتال میں داخلہ دلانے کی جدوجہد کی باتیں لی گئیں، بیگم موصوفہ ان کی باتیں شوق سے سنتی گئیں۔

ہر بیگم نے بڑھ چڑھ کر خلوص نیک نیتی اور عقیدت کا اظہار کیا۔ سب باتیں کرتیں سٹیج پر آ پہنچیں کرسیوں پر گردا گرد کی کوشیوں سے بلائی گئی مہمان خواتین براجمان ہو گئیں اور گھاس پر پچھی درمی پر نوازے جانے والے غرباء بیٹھ گئے۔

سٹیج پر کرسیاں تھیں۔ درمیان میں میز رکھی تھی۔ دائیں ہاتھ کی طرف کپڑوں اور برتنوں کا اک ڈھیر سا تھا۔ آج سب بیگمات اپنے ساتھ کپڑے اور برتن حصہ بقدر جشہ کے مصداق لے کر آئی تھیں۔ بیگم سجاد کے ہاتھ میں وہ لفافہ تھا۔ جس میں چھ ہزار پانچ سو کی رقم تھی۔ اور جسے پانچ پانچ سو کر کے ان کے اپنے ہی نوکروں چاکروں کی بیویوں میں بانٹا تھا۔

تلاوت کے بغیر ہی جلسے کی کارروائی کا آغاز بیگم سجاد نے کیا۔ تو بیگم نصیر نے اسے ٹوک دیا۔ ”بیگم صاحبہ خدا کے نام سے شروع کیجئے۔“

بیگم سجاد شرمندہ سی ہو کر رہ گئیں۔ تلاوت کے لئے بلایا تھا۔ اس نے بیگم شفیع سے تلاوت کو کہا۔ بیگم شفیع نے نفیسہ کو، نفیسہ نے بیگم ارشاد کو، کوئی شرما رہی تھی کسی نے پڑھا نہیں تھا۔ کوئی باوضو نہ تھی بیگم نصیر احمد نے بڑے تاسف سے انہیں دیکھا اور جب بیگم سجاد کو اپنی بچی کی آیا اماں سعیدہ کا خیال آیا۔ تو بیگم نصیر احمد نے خود ہی تلاوت سے آغاز کیا۔ کچھ خاموشی اور کچھ بیگم نصیر احمد کی خوشی الحانی۔ ایک سماں بندھ گیا۔ بیگمات نے سر جھکا لئے جانے احتراماً یا ندامت سے۔

جلسے کی باضابطہ کارروائی تو کبھی ہوئی تھی نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا تھا۔ لیکن آج

اصول پسند بیگم کی..... موجودگی میں ان بیگمات کو خاصی دشواری پیش آرہی تھی جلسہ اچھا خاصا جنجال بن گیا تھا۔ بیگم سجاد کی امیدیں بھی۔ سرد پڑتی جا رہی تھیں کہ جھنجھلاہٹ ان کے اعصاب پر سوار تھی۔ اور وہ فوٹو گرافر کم بخت بھی ابھی تک نہ آیا تھا۔ اخباری نمائندے کے لئے کارروائی تو خود بھی لکھی جاسکتی تھی لیکن تصویریں۔

جملہ کارروائیوں کے بعد پیسے کی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ بیگم سجاد نے جنہیں یہ روپیہ دینا تھا۔ ان کی فہرست اور پیسے اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔

کیا یہ لوگ واقعی امداد کے مستحق ہیں۔ بیگم نصیر احمد نے پوچھا۔ ”جی۔“ بیگم سجاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ان میں سے کسی کی بیٹی کی شادی ہے کسی کے باپ کا چہلم کسی کو بیٹے کے ختنے کرنا ہے۔ آخر ان لوگوں کو بھی تو کوئی خوش دیکھنے کا حق ہے۔“

لیکن بیگم نصیر اس بات سے اختلاف کر گئیں ملک جن حالات سے دوچار ہے ان فضول رسوں پر یہ خرچ کرنا بھلا کہاں کی عقل مندی ہے اتنی بڑی رقم اور بقول ان بیگمات کے گھر گھر جا کر دو دو چار چار روپے کر کے جمع کی ہوئی یہ رقم کسی بہت بڑے کام میں خرچ کرنا چاہیے اور اس وقت ملک کے دفاع سے بڑھ کر اور کونسی بڑی ضرورت ہو سکتی ہے۔ قوم و ملک کو پیسے پیسے کی ضرورت تھی۔ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ تو ظم اتنے بڑے بحران سے دوچار تھی اور یہ بیگمات کاوش سے جمع کی ہوئی رقم فضول رسوں کی نذر کر دینے کو تیار تھیں۔ کیوں نہ یہ رقم دفاعی فنڈ میں دے دی جائے۔

بیگم نصیر احمد نے اپنی تجویز پیش کی، تو بیگمات کے چہرے میک اپ کے باوجود بدرنگ ہو گئے سب ہراساں ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ بیگم نصیر احمد نے مختصر سی تقریر کی۔ ملک اور قوم جن حالات سے دوچار تھی اس کا نقشہ کھینچا۔ ذاتی اغراض اور فرسودہ رسوم کو توڑ کر اس وقت اپنی بہادر افواج کی پشت پناہی کرنے اور ملک کے لئے دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسہ پیسہ جمع کرنے کا احساس دلایا۔ اس نے تقریر کے خاتمہ پر ان لوگوں سے جو کرائے کے ضرورت مند تھے پرسوز آواز میں

آئیڈیل

پوچھا۔ ”کیا آپ اپنی ذاتی اغراض کو قوم اور ملک کے لئے پس پشت نہیں ڈال سکتے کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ یہ پوری کی پوری رقم دفاعی فنڈ میں دے دی جائے۔“

غریبوں کے دلیوں بھی احساس درد سے کانپ جاتے ہیں۔ اتنی دردمندانہ اپیل کا جواب کیونکر نہ دیتے۔ سب با آواز بلند چخے۔ ”ہمارا رواں رواں ملک و ملت کے نام پر قربان ہونے کو حاضر ہے۔ یہ رقم فنڈ میں دے دی جائے۔“

اور جب بیگم نصیر نے ان سب کی قربانی کو سراہتے ہوئے بیگ سے رسید بگ نکالی۔ تو بیگمات کے چہرے لٹک گئے تھے اور ان کی آنکھوں کی روشنیاں بجھ گئی تھیں کسی نے سر تھام لیا تھا تو کسی نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا بیگم سجاد تو بار بار خشک زبان ہونٹوں پر پھیر رہی تھی۔

اور جب کپڑے اور برتن تقسیم کرنے کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ تو بیگم نصیر نے گھڑی دیکھی چھ بجنے کو تھے۔

”اب اجازت چاہوں گی۔“ اس نے سب بیگمات کی سرگرمیوں کی تعریف کرتے اور ان کے خلوص اور محبت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”چائے کے لئے چلے۔“ نفیسہ بے دلی سے بولی۔

”شکریہ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔“

وہ مسکرائی.....

”اب تو تیار ہے۔“ بیگم سجاد جیسے ماتم والے گھر میں تھیں۔

مجھے چھ بجے گھر پہنچنا ہے۔ عورتیں میری منتظر ہوں گی۔ میں اپنے گردا گرد کی ناخواندہ خواتین کو آج کل پڑھا رہی ہوں۔ ہماری قوم جب تک علم کی روشنی سے بے بہرہ ہے ترقی نہیں کر سکتی علم کی مشعل ہمارے پاس ہے اس سے دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کا موقعہ دینا چاہیے۔ آپ بہت بڑا کام کر رہی ہیں۔ کچھ وقت ناخواندہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی وقف کر دیجئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے سب سے باری باری ہاتھ ملایا۔

آئیڈیل

”ابھی فوٹو گرافر بھی نہیں آیا۔“ بیگم سجاد نے اسے گاڑی کی طرف جاتے دیکھ کر پریشان لہجے میں کہا۔

”ان تکلفات میں نہ پڑیں۔ خدمت خلق جتنی خاموشی سے کی جائے بہتر ہے میں ایسی چیزوں کے سراسر خلاف ہوں۔ کام معاوضے اور بدلے کی توقع کے بغیر کرنا چاہیے۔“

اس نے خلوص سے مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سب سے الوداعی ہاتھ ملایا سب بیگمات کی جھلاہٹ اور بیزاری تو دید کے قابل تھی بیگم سجاد کا رنگ فق ہونٹ خشک اور حلق سوکھ گیا تھا۔

ساڑھے چھ ہزار کی رقم بنانے کے لئے اڑھائی ہزار تو اس نے سجاد کے پیسوں میں سے نکال کر ڈالا تھا۔

اس کا کیا بنے گا۔؟

اس کا دماغ چکرانے لگا۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

بیماری پر خرچ ہو گیا۔ مکان تک رہن رکھنا پڑا۔“

”ہاں ہاں اب تو تو عمر بھر یہی طعنے دیتا رہے گا مجھے۔“ اماں سر پر ہاتھ رکھ کر مین کرنے لگی۔ ”ان کی جگہ تو مجھے موت آ جاتی۔ خود تو دامن بچا گئے۔ مجھے بہو بیٹے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔“

حامد ہاتھ ملتے ہوئے بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اماں کے رونے دھونے میں صفیہ آپا بھی شریک ہو گئیں۔

آج گھر میں کئی دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔ اماں ابا مرحوم کا چالیسواں اتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں کہ محلے برادری والے دنگ رہ جائیں۔ مرنے والے کی عزت اسی میں تھی۔ ورنہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ کنگال ہو کر مرا۔

حامد بے چارہ سمجھاتے سمجھاتے عاجز آ چکا تھا۔ محدود آمدنی میں تو ان دنوں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل تھا۔ اور پھر جو کچھ پاس تھا۔ بیماری کی نظر ہو گیا تھا۔ تین مہینے کی مسلسل بیماری آنے جانے والوں کا تانتا اور پھر اماں اور صفیہ آپا کی جھوٹی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے شاہانہ خرچ..... وہ چپ چاپ برداشت کئے گیا تھا۔

صالحہ سچ مچ کی صالحہ عورت تھی۔ منہ سے اف تک نہ کی..... حامد جس طرح خرچ کرتا تھا، علاج معالجے کے لئے پیسے اکٹھے کرتا رہا، وہ شاکہ نہیں ہوئی۔ باپ کی خدمت فرض تھی۔ تنگی ترشی میں گزارا کر کے اس خدمت میں کوتاہی نہیں کی لیکن اماں کو تو بہو کا کیا دھرا کبھی نظر ہی نہ آیا۔ ہمیشہ نقص ہی نکالے۔ باتیں ہی بنائیں زیادہ شہ انہیں صفیہ آپا دیا کرتی تھیں۔

”ماں باپ ساری عمر پالتے پوتے آخر کس لئے ہیں۔ اب ابا چار پائی پر پڑ گئے۔ تو بہو بیٹے ہی کا فرض ہے نا..... میرے سر بیمار پڑے تھے تو ہم دونوں میاں بیوی ان کی چار پائی سے الگ نہیں ہوئے۔“

اور پھر سر کی خاطر انجام دی ہوئی خدمات کا وہ یوں تذکرہ کرتی کہ اماں کو صالحہ کا کیا دھرا نظر ہی نہ آتا۔

داد یا بیداد

”اے ہے اماں“ ایسا غضب، چالیسواں نہیں ہو گا ابا کا۔ برادری میں کیا منہ دکھائیں گے۔ ملنے جلنے والوں سے کیا کہیں گے۔ آپ بھی اس کی باتوں میں آگئیں۔ اسے تو عزت بے عزتی کا خیال ہی نہیں۔“ صفیہ نے چھوٹے بھائی حامد کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ جو سر بہوڑائے کھری چار پائی پر بیٹھی تھی۔

”صفیہ آپا اس میں عزت بے عزتی کیسی؟ فاتحہ دلوالیں گے کیا ضرورت ہے کنبہ قبیلے کو اکٹھا کرنے کی۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ صفیہ آپا نے گال پر انگلی رکھتے ہوئے بھائی کو یوں دیکھا۔ جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔“

”سب ٹھیک ہے۔“ اماں نے سپید دوپٹے کی بکل مارتے ہوئے شاکہ لہجے میں کہا۔ ”چار پیسے لگانے کا وقت آیا۔ تو لگا الٹی سیدھی ہانکنے، مرحوم باپ کی روح تڑپا کرے اسے کیا احساس۔“

”اماں.....“ حامد عاجزی سے بولا۔ ”آپ سمجھتی کیوں نہیں میں اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں۔ جس طرح آپ چالیسواں کرنا چاہتی ہیں اس کے لئے تو ایک ہزار روپے بھی کم ہیں۔ آپ ہی بتائیے میں کہاں سے لاؤں اتنا پیسہ..... جو کچھ پاس تھا وہ ابا کی

آئیڈیل

ابا مر گئے۔ سوئم اور دسواں اماں نے اپنی مرضی سے کیا۔ حامد اور صالحہ نے کچھ نہیں کہا۔ من مانی کرنے دی۔ لیکن اب معاملہ سنگین تھا۔ دو ڈھائی ہزار کا خرچہ حامد کے لئے برداشت کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ ابھی تو کیمسٹ کا آخری بل اس کے ذمے تھا دکاندار سے دھڑا دھڑا سودا آ رہا تھا۔ اس کا حساب چکانا تھا۔ اور پھر مکان بھی تو رہن تھا سر چھپانے کی جگہ تو تھی۔ اسے رہن سے چھڑانے کے لئے بھی تو پیسہ درکار تھا دن رات وہ اسی کے لئے پریشان رہتا تھا۔

خاوند کی پریشانی صالحہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کے پاس تھوڑا سا زیور تھا۔ وہی پیش کر دیا۔

”اسے بیچ کر رہن چھڑوا لیں۔ باقی قرضے تھوڑے تھوڑے پیسے تنخواہ میں سے جمع کر کے اتار لیں گے۔“

حامد بڑا متاثر ہوا تھا، اور چارہ بھی نہ تھا..... زیور بیچنے پر بادل نخواستہ رضا مند ہو گیا۔ چالیسویں کے بعد وہ پہلا کام مکان آزاد کروانے کا کرنا چاہتا تھا۔

”چالیسویں کے بعد دیکھیں گے۔ فی الحال تم یہ زیور رکھو خدا کرے ضرورت نہ ہی پڑے تم رکھ دو ابھی۔“

صالحہ نے زیور سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ فارغ ہونے پر وہ زیور بیچ دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو گئی تھی۔ جانتی تھی اتنی رقم کہاں سے آسکتی ہے کہ قرضے بھی اتر جائیں اور رہن بھی چھوٹ جائے۔

لیکن ماں بیٹی نے تو ایک ہی واویلا مچا رکھا تھا۔ ناک رکھنے کی خاطر چالیسواں دھوم دھام سے کرنا ماں بیٹی کی نظروں میں ضروری تھا۔ حامد سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ صالحہ نے بھی ڈرتے ڈرتے حامد کی تائید کی تھی۔ لیکن ماں بیٹی نے وہ لٹے لٹے کہ بے چاری کو آئندہ اس جھگڑے میں بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اماں اور صفیہ تو اٹھتے بیٹھتے اسے سنانے لگی تھیں۔

”تم تو یہی چاہو گی کہ ناک کٹ جائے ہماری، ابا مرحوم کو سارا زمانہ باتیں کرے

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

کہ مکرراتا بھی نہ چھوڑا کہ چند رسمیں ہی پوری ہو جائیں۔ ہاں بی بی اب تو تمہارا راج ہے، ہم تو محتاج ہیں۔ جو جی چاہے گا کرو گی خاوند کے کان بھرتی رہو گی۔ الٹی سیدھی پڑھاؤ گی اسے، جب بھی تو اتنا برہم ہوتا ہے۔ تم سیدھی راہ پر چلاؤ تو کیا مجال جو چالیسواں نہ کرے۔“

بے چاری صالحہ کان لپیٹے رہتی۔ اب تو تنگ آ کر اس نے حامد کو واقعی مجبور کرنا شروع کر دیا تھا کہ جیسے بھی ہوا اماں کی بات پوری کر دے۔

لیکن وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ اگر کچھ پلے ہوتا تو شاید اس جھگڑے کی نوبت ہی نہ آتی۔ نچلے متوسط طبقے کا آدمی، محدود آمدنی، ہزاروں مسئلے گھیرے ہوئے تھے۔

اس دن صفیہ نے بات بہت بڑھادی۔ اماں تو رونے دھونے میں لگی رہیں وہ آنکھیں پونچھ بھائی کو دیکھ کر غزائی۔

”مجھے اپنے باوا کی عزت پیاری ہے حامد! چالیسواں ضرور ہوگا۔ اور اسی طرح ہو گا جس طرح اماں کہہ رہی ہیں۔“

”لیکن آپا میں اتنے پیسے کا بندوبست کہاں سے کروں۔ آپ کو تو ذرا عقل سے کام لینا چاہیے۔ جھوٹی عزت رکھنے کے لئے آپ اس قدر اصرار کر رہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نہ کہ..... لوگ باتیں کریں گے۔“

”تو یہ کوئی بات ہی نہیں تمہارے لئے۔ اتنی عزت بنی ہوئی ہے، وہ تم چاہتے ہو بھک سے اڑ جائے..... نا بابا..... میں بھی آخر سسرال والی ہوں عمر بھر طعنے سنتی رہوں گی لوگوں کے..... تمہیں پتہ نہیں میرے سسرال والوں کا.....“ صفیہ آ پالال بھبھوکا ہونے لگیں۔

حامد نے سر جھکا لیا، اماں چمک کر بولیں۔

”اے بیٹی تو کس سے مغز کھا رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے..... نہ بہو..... چپ ہی ہو جا۔“

”ناممکن.....“ آپا صفیہ نے غصہ سے کہا..... ”پیسے کا بندوبست میں کر دوں گی۔“

”آپ۔“ حامد نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں..... یہ لو میرے کڑے۔“ آپا نے فافٹ اپنے چہ تو لے کے کڑے اتار کر اس کے سامنے پھینک دیئے۔ ”انہیں گروی رکھ کر پیسہ لے آؤ چالیسواں ضرور ہوگا۔“

”آپا خدا کے لئے جذباتی نہ بنئے“ آپ کے سسرال والے کیا کہیں گے اس طرح بھرم نہ ٹوٹے گا عزت کا۔“

”تمہیں اس سے کیا..... میں جانوں اور وہ..... تم روپے کا بندوبست کرو۔“ صفیہ آپا نے حکم دیا۔ ”دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ لوگ منہ اٹھائے راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب بلاوا آتا ہے۔“

حامد نے آخری کوشش کی، کڑے صفیہ کو واپس دیئے دولہا بھائی کی بلا اجازت ایسا کام کرنے سے منع کیا۔ لیکن اس کے سر پر تو برادری کا بھوت سوار تھا۔ اس کے سامنے ناک اونچی کرنی تھی۔ تعریف و توصیف کے کلمات سننے تھے۔

”ایک بار اماں نے بھی کڑے گروی رکھنے سے صفیہ کو باز رکھنا چاہا۔ لیکن وہ اپنی بات سے پھرنے والی کہاں تھی۔ مصر ہوئی، بھند ہوئی، حامد کو بھی اس کی ضد پرتاؤ آ گیا۔“

”لاؤ ادھر جیسی تمہاری مرضی۔“ کڑے لیتے ہوئے وہ اُبھ کھڑا ہو چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سرکوا ثبات میں ہلایا۔ ”سوچ لیا۔“

”اے سب سوچ لیا۔ دیکھا جائے گا۔ تجھے اتنی فکر کیوں۔ کوئی تیری بیوی کے کڑے تو گروی رکھنے کو نہیں کہہ رہی۔ تو انتظام کر..... بس.....“

صالحہ دوسرے کمرے میں یہ سب باتیں سن رہی تھی..... حامد کڑے لے کر آیا تو اس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

”انہیں رہن سے کیسے جھڑائیے گا۔ صفیہ آپا کی ساس بڑی سخت عورت ہے کہیں.....“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ حامد نے اسے ٹوکا۔ ”آپا اپنی ذمہ دار آپ ہیں۔ میں بھی انہیں ان کی ضد کا سبق دینا چاہتا ہوں۔“

چالیسواں اسی دھوم دھام سے ہوا۔ جس کی ماں بیٹی کو خواہش تھی۔ دو تین سو آدمیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ اور ابا مرحوم کا جوڑا اللہ کے نام پر دیا گیا۔ چھوٹے سے گھر میں اتنے ڈھیروں لوگ..... بیٹھنے بٹھانے کا جو بندوبست تھا درہم برہم ہونا ہی تھا۔ کوئی کھڑے کھڑے نوالے نگل رہا ہے کوئی زمین پر بیٹھا ہے۔ کسی کے حصے دری آئی ہے تو کسی کے چار پائی۔ کوئی کھڑکی میں بیٹھ گیا تو کوئی دروازے کے پٹ پر جگہ بنا رہا ہے۔ ایک عجیب افرا تفری تھی۔ جمع ہونے والے لوگ بھی تو صفیہ آپا اور اماں ہی کی ذہنیت کے تھے۔ میت کا معاملہ بھول بھال لگے باتیں بنانے، کوئی ناک چڑھا رہا ہے کوئی منہ بنا رہا ہے۔

”اے ہے کسی کھلی جگہ انتظام کر لیا ہوتا۔ لوگوں کو سزا دینے بلوایا ہے۔ کھانا بھی کسی ڈھنگ کا نہیں، شور با تو جیسے دیگ ٹل کے نیچے رکھ کر بنایا گیا ہے چاولوں میں بوٹی نام کو نہیں۔ اور یہ دی ہے یا لسی، توبہ بہن..... اور وہ جو جوڑا دیا ہے ہائے ہائے نہ کوٹ نہ ٹوپی، مردہ سردی میں ٹھٹھرتا رہے گا۔ اے بہن سر سے ننگا، کیا لوگ ہیں یہ بھی..... کبھی ٹوپی کے بغیر بھی جوڑا دیا جاتا ہے۔ مردے کا۔“

اماں اور صفیہ لوگوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ ماں بیٹی دونوں صالحہ سے کترار ہی تھیں۔ ان لوگوں پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ لیکن گھر آنے والوں کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھیں۔

ہاں دل ہی دل میں پچھتاوا ضرور آ رہا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا چپکے سے فاتحہ دلوا دیتیں۔ روپیہ پیسہ الگ خرچ ہوا۔ دوڑ دھوپ الگ۔ اور یہ لوگوں کی ایسی دل جلا دینے والی باتیں۔ حامد سچ ہی کہتا تھا۔ لیکن دونوں ماں بیٹی تلخ تجربے کے باوجود سچائی کو برملا ماننے والی نہ تھیں۔ صالحہ نے جب شاکی انداز میں شبو کی ماں کی کی ہوئی نکتہ چینی دہرائی تو وہ دونوں اس کے سر ہو گئیں۔

”ایسے موقعوں پر یوں ہی ہوتا ہے۔ کوئی نرالی بات کہہ دی اس بے چاری نے جو تم چرچا کرنے لگیں۔“

بے چارہ حامد جل ہی گیا۔ لیکن چپ ہی رہا۔ کچھ کہہ دیتا تو زن مرید کا لیبل

چسپاں ہو جاتا۔

چالیسواں کا ہنگامہ گزر گیا۔ تو صفیہ کو اپنی جلد بازی کا احساس ہوا۔ ساس نندیں کڑوں کا تو ضرور پوچھیں گی۔ دل ہی دل میں تو اس نے کئی بہانے گھڑ لئے تھے لیکن جاتے جاتے اماں اور حامد کو رہن جلدی چھڑانے کی تاکید کر گئی تھی۔

وہی ہوا..... جس کا خدشہ تھا۔ نگلی کلاسیاں بھلا کب تک آستینوں سے ڈھکے رکھتی ساس نے پوچھ ہی لیا۔ صفیہ کچھ گھبرائی، لیکن جلد ہی بات بنالی۔

”ابامیاں کا سوگ ہے، کڑے پہنتے اچھی تھوڑا ہی لگتی..... وہیں اس دن اتارے اماں کے پاس پڑے ہیں۔“

ساس نندوں کو کھٹک گئی۔ کئی بار اصرار کیا۔ جب صفیہ سوگ کا بہانہ ہی کئے گئی۔ تو وہ درپے ہو گئیں۔ صفیہ ٹال مٹول کئے گئی۔ ہمسائی کے ہاتھ اماں کو خفیہ پیغام بھی بھیجا، لیکن اتنی جلدی رہن چھٹنے کی صورت ہی کون سی تھی۔

لیکن اس دن تو صفیہ کی گھبراہٹ دید کے قابل تھی۔ اس وقت کو کوس رہی تھی جس وقت جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کڑے گروی رکھنے کو دیئے تھے۔ بات بھی تو ایسی تھی۔ ساس نندوں کو تو ٹال رہی تھی۔ اس دن شوہر نے کڑے مانگے دوست کی بیوی نے کسی شادی میں شریک ہونا تھا۔ اللہ جانے بات سچ تھی یا ساس نندوں نے پٹی پڑھائی تھی۔ بہر حال شوہر نے شام تک کڑے اماں کے گھر سے لانے کو کہا تھا۔

صفیہ گھبرائی گھبرائی اماں کے پاس پہنچی، سارا واقعہ سنایا۔ اچھی بھلی ازدواجی زندگی میں تلخیاں گھٹنے کا سامان پیدا ہو رہا تھا۔ شوہر کے سامنے جھوٹی پڑ کر اعتماد کھودیتی تو زندگی کیسے گزرتی۔ حامد کے پاؤں پکڑ لئے۔

”بھیا خدا کے لئے جیسے بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں سے بھی ہو سکتا ہے۔ شام تک کڑے لا دو۔ ورنہ میری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ میں نادام ہوں خواہ مخواہ تمہیں تنگ کیا۔“ اور پھر رو رو کر اپنے کئے پر پچھتاتے ہوئے وہ حامد کی مٹیں کرنے لگی۔ اماں بھی بیٹی کی طرف داری میں شکست خوردہ اندازہ میں بولنے لگی۔

حامد چپ چاپ سنے گیا، جب چپ ہوئیں تو بے رخی سے بولا۔
”میرے پاس الدین کا چراغ تو ہے نہیں۔ اب اتنے کم وقت میں کہاں سے پیسے کا بندوبست کروں۔ آپ نے اپنی بات تو پوری کر لی تھی۔ اب رہن چھٹنے کا انتظار کریں۔“

صالحہ بھی قریب ہی چارپائی پر بیٹھی تھی، حامد کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بڑے تغاثر سے بولی۔

”بس بہت ہو گیا، بتا دیجئے نا آپا کو! کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ اتنا ہی کافی ہے پچھتا رہی ہیں۔ اپنی غلطی بھی مان رہی ہیں۔“

اماں نے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا اور صفیہ بھی آنکھیں پونچھتے ہوئے صالحہ کو دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ سر کے اشارے سے پوچھتے ہوئے بولی۔
”آپ کے کڑے رہن نہیں رکھے تھے۔ صفیہ آپا۔“ صالحہ نے حامد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

”رہن نہیں رکھے تھے؟“ دونوں ماں بیٹی بیک وقت بولیں۔

”ہاں.....“ صالحہ بولی۔ ”صفیہ آپا کی ساس اتنی سخت ہیں۔ انہیں پتہ چلتا تو بری بات تھی۔ میں نے چالیسویں کے لئے اپنا زیور بیچ دیا تھا۔ کڑے میرے پاس ہی ہیں۔ جائے نکال لائیے۔“

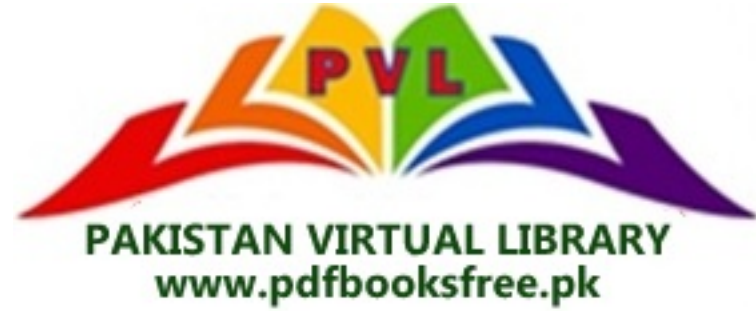
صالحہ نے چابی حامد کو دی اور فخر و غرور سے سراونچا کرتے ہوئے ساس اور نند کی طرف دیکھا۔ حامد اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔

”ہائے میں مر گئی۔“ اماں نے صالحہ کو داد دینے کی بجائے سینے پر ہاتھ مارا۔
”کتنا جگر ہے تیرا بہو تماشا دیکھ رہی تھی میری بچی کا۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی وہ اور تو کتنے مزے سے بیٹھی سن رہی تھی۔ پھر کا دل ہے تیرا پتھر کا.....“

”وہ تو..... وہ.....“ صالحہ بے چاری داد پانے کی بجائے اس بے داد پر بوکھلا گئی

اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ حامد نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔
 ”اے اماں، جانے بھی دو، آخر کو تو بھابی ہی ہے نا..... بہن تو نہیں.....
 جو رونے پر دکھ جاتی۔“ صفیہ نے چمک کر کہا۔ اور.....
 بے چاری صالحہ اس کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

گڈ ورائی

وہ بچپن ہی سے انتہائی شرمیلی کم گو اور حساس تھی حویلی میں درجن بھر بچوں میں اس کا وجود الگ تھلگ تھا۔ سرخ و سفید گول مٹول سی بچی، جس کے بالوں کی رنگت اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ٹوٹے اندھیروں کی سیاہیاں تھیں۔ جو عام بچوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی۔ جو کبھی کبھی چیخ چیخ کر روتی نہ تھی۔ ضد نہ کرتی تھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی نہیں تھی۔ کبھی ایڑیاں نہیں رگڑیں۔ کبھی زمین پر لوٹے نہیں لئے۔ حالانکہ حویلی کے دوسرے بچوں کی یہ جانی پہچانی خاصیتیں تھیں۔ بچوں کا کیا دوش، یہ تو بچپن کے فطری تقاضے تھے۔ لیکن گڈ ورائی منفرد تھی خوش ہوتی تو آنکھوں کی گہری سیاہیوں میں چاند سورج کی چمک اتر آتی۔ اور اداس ہوتی تو گھنگھور گھٹائیں آنکھوں کے اندھیروں میں سمٹ آتیں۔ لیکن یہ گھنگھور گھٹائیں کبھی برسیں نہیں۔ آنکھوں میں جھلمل جھلمل کرتی رہتیں، اور دیکھنے والے کو اس پر بے ساختہ پیارا آ جاتا۔
 گھنگھور گھٹائیں سمٹ آنے کے مواقع اکثر پیدا ہوتے رہتے۔ کوئی بچہ جب گڈ ورائی سے زیادتی کرتا اس کے حصے کی چیزیں اڑا لیتا، اسے کھیل سے نکال دیتا، اس کی سنبھال سنبھال کر رکھی گڑیا کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیتا، تو وہ بس آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتی۔ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو دیکھ کر بڑوں کا دل پسج جاتا۔ اور پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور پوچھتا۔

اور گڈ ورائی آنسو آنکھوں میں پینے کی کوشش کرتے ہوئے اتنی پیاری لگتی کہ بے ساختہ اسے دل میں بٹھالینے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اس کی چیزیں چھیننے والے کی تو بس شامت آ جاتی۔ خاص کر جب عمو بھیا گڈ ورائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیتے..... تو بس بچوں کی خیر نہ ہوتی۔ ان دنوں عمو بھیا ایف اے میں پڑھا کرتے تھے۔ دادی اماں کے سب سے بڑے پوتے ہونے کے ناطے یوں بھی بچوں کی فوج ظفر موج پران کا بڑا رعب تھا۔ اس پر جب گڈ وکی طرف داری ہوتی، تو خدا جانے انہیں اتنا غصہ کیونکر آ جاتا۔ ان کی ایسی ہی حرکات سے تو بچے گڈ وکے بیری سے ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے تو گر بہ مسکین بنے رہتے لیکن جب وہ کالج جاتے یا کہیں باہر گئے ہوتے تو دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

گڈ ورائی بھی تو جان گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے سامنے آنکھیں بھر بھر لاتی وہ صرف یہی پوچھتے۔

”کیا چھن گیا گڈ ورائی؟“

اور بس پھر گڈ ورائی کے منہ سے الفاظ نکلنے کی دیر ہوتی، کوئی نہ کوئی بچہ ان کے ہتھے چڑھ جاتا اور اس وقت تک خلاصی نہ ہوتی، جب تک گڈ ورائی کی آنکھوں میں گھنگھور گھٹائیں چھٹ نہ جاتیں۔ اور ان کی آنکھوں کے اندھیرے چمک نہ اٹھتے۔

وہ تو بچوں نے اس دن خدا کا شکر ادا کیا، جب عمو بھیا نے بی اے کا داخلہ لاہور لے لیا اور پھر تعلیمی سلسلوں میں باہر ہی رہنے لگے۔

وقت گزرتا گیا حویلی کی رونقیں سمٹی گئیں۔ خالد چچا ایران چلے گئے۔ آمنہ پھوپھو کراچی میں آباد ہو گئیں۔ بڑے تایا کا کاروبار پنڈی میں شروع ہو گیا۔ سلیم لاہور آ گئیں۔ حویلی میں دادی اماں اور بڑی چچی ہی رہ گئیں۔ گڈ ورائی بھی اپنے والدین کے ساتھ نوکریوں کے سلسلے میں شہر شہر گھومتی پھری۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں حویلی میں زندگی پیدا ہو جاتی، لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ سارا کنبہ قبیلہ پہلے کی طرح اکٹھا ہو گیا ہو۔

کبھی ایک آیا اور دوسرا چلا گیا، یوں ہی ہوتا رہا۔

اور

دس سال گزر گئے، ننھے منے بچے جوان ہو گئے، چھ سات سالہ گڈ و بھی سولہ سترہ سالہ دوشیزہ کا روپ دھار گئی۔ لیکن عادت اب بھی وہی تھی خوشی اور غم کا تاثر اس کی آنکھوں ہی سے مترشح ہوتا تھا..... کبھی چاند سورج چمک جاتے اور کبھی گھنگھور گھٹائیں اتر آتیں۔

ان دنوں وہ پورے دو ماہ کے لئے دادی اماں کے پاس آئی تھی۔ چھٹیاں یہیں گزارنا تھیں۔ پہلے پہلے تو دل نہ لگا۔ لیکن جب خالد چچا اپنے بھرے پرے خاندان کے ساتھ آ گئے اور سلیمہ آپا بھی اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ پہنچ گئیں تو رونو اور شاداں کی قربت میں وقت خوب گزرنے لگا۔ خالد چچا کا بیٹا عثمان اب چھ فٹ کا گرانڈیل آدمی بن گیا تھا۔ گڈ ورائی کو اب بھی ویسے ہی چھیڑتا تھا جیسے بچپن میں۔

تینوں اکثر بچپن کے ان دنوں کو یاد کیا کرتے تھے عمو بھیا سے پٹائی یاد کر کے عثمان کان پکڑ لیتا۔ ”میرے تو کان ہی لمبے کر دیئے عمو بھیا نے کھینچ کھینچ کر۔“

”آپ کون سا باز آ گئے۔“ گڈ ورائی مسکرا کر کہتی۔ ”اب بھی اسی طرح ستاتے ہو۔“

”عمو بھیا جو نہیں ہیں یہاں، اللہ قسم بچپن کا ایسا خوف دل میں بیٹھا ہے کہ عمو بھیا اب بھی آ جائیں تو ان کے سامنے آپ کو چھیڑنا ستانا تو رہا ایک طرف، میں تو آپ کی طرف دیکھنے کی جرات بھی نہ کر سکوں گا۔“

گڈ ورائی بڑے فخر سے مسکرا دیتی، اور اس کی یادوں میں ننھے منے چراغ جل اٹھتے۔ دھیمی دھیمی لوہیں کتنی فرحت بخش گدگدائیں ہوتیں۔

عمو بھیا کتنے اچھے تھے، ان کی اچھائی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چمک گئی تھی۔ اور لاشعوری طور پر اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ گو انہیں دیکھے مدتیں ہو گئیں تھیں۔ دس سالوں میں بمشکل تین چار بار دیکھا تھا۔ وہ بھی

تھوڑی دیر کے لئے، لیکن وقت اور فاصلے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتے تھے۔

ان دنوں اس کا جی بے طرح چاہتا کہ عمو بھیا آئیں، عثمان اسے ستائے اور وہ اسی اپنائیت سے پوچھیں۔ ”کیا چھن گیا گڈو رانی۔“

اور پھر..... پھر وہ مسکراتے لگتی۔ عثمان کے کان ویسے ہی بڑے بڑے تھے۔ لیکن اسے یوں لگتا جیسے عمو بھیا نے واقعی اس کے کان کھینچ کھینچ کر لیے کر دیئے ہیں۔

گڈو رانی ابھی حویلی ہی میں تھی کہ تائی اماں پنڈی سے آگئیں۔ اور اسے یہ سن کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ عمو بھیا بھی آرہے ہیں۔ یہ نوید اس نے بڑے فخر سے عثمان کو سنائی۔

”عمو بھیا آرہے ہیں ذرا بیچ کر رہیے گا، سمجھے۔“

اور آپ بھی سن لیجئے گا، ان کے سامنے بہت بنے گا نہیں، ورنہ ان کے جانے کے بعد گن گن کر بدلے اسی طرح لئے جائیں گے، جس طرح دس بارہ سال پہلے، سمجھیں۔“

عمو بھیا آگئے، گڈو تو انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی، کچھ یہی حال عمو بھیا کا بھی ہوا۔ چھ سات سالہ بچی، سولہ سترہ سالہ لڑکی کے پیکر میں ڈھل گئی تھی۔

گڈو رانی کا جی چاہتا، بچپن کے بیتے دن پھر سے لوٹ آئیں۔ لیکن اس نے دیکھا عمو بھیا اس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور عثمان بھی اس کے قریب پھٹکتا نہیں تھا وہ تو عمو بھیا سے ڈرتا تھا۔ لیکن عمو بھیا کس سے ڈرتے تھے؟

بھولی بھالی معصوم سی گڈو رانی کو بھلا کون سمجھاتا کہ عمو بھیا تو ان دنوں اپنے آپ سے ڈرنے لگے ہیں۔ اسے دیکھ کر تو وہ عجیب سی کشش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہیں تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے گڈو رانی ان کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔

لیکن اس خواہش کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ اماں اور دادی اماں نے تو ان کی نسبت صوفیہ سے ٹھہرا دی تھی۔ صوفیہ نے اسی سال ایم اے کر لیا تھا۔ اور جو چوبیس سالہ پختہ شعور والی لڑکی تھی۔ عمر تعلیم اور ذہنی ہم آہنگی ہی کی بناء پر عمو بھیا نے چھ ماہ پہلے اس

رشتے کے لئے رضا مندی دے دی تھی۔ اب اماں منگنی کے لئے آئی تھیں۔ صوفیہ کے والدین نکاح کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ اقرار اور اصرار کا سلسلہ چل رہا تھا۔

عمو بھیا کے اندر ہی اندر کوئی جذبہ چیخا تھا۔ انہیں انکار کرنے کے لئے اکساتا تھا۔ لیکن یہ جذبہ خوف کی جن تہوں میں لپٹا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا بھی نہ پا سکتے تھے۔ گڈو رانی ان سے دس سال چھوٹی تھی..... لاشعور میں چھ سات سالہ بچی کا احساس اب تک زندہ تھا..... شعوری اور لاشعوری تقاضوں نے اتنی بے رحمی سے عمو بھیا پر وار کئے کہ وہ بوکھلا گئے۔ گڈو رانی کی معصومیت اور بھولپن نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شعوری تقاضے کا گلا گھونٹ دیں۔ یہ آسان عمل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس سے گزر رہی گئے۔ اس دن انہوں نے اماں سے کہہ دیا۔

”اسی ہفتے نکاح کی تاریخ رکھ لیں اماں، میری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔“

وقت کم تھا، اماں دھوم دھام سے بڑے بیٹے کے نکاح کی رسم کرنا چاہتی تھیں۔ مجبور ہو گئیں۔ گھر کے بڑے بڑے فرد جمع ہوئے..... عمو بھیا دو لہا بنے اور نکاح کی رسم کے لئے چھ سات مردوں اور پانچ چھ عورتوں کے ساتھ صوفیہ کے ہاں چل دیئے۔

سارا دن گہما گہمی رہی۔ لوگوں کا شور شہنائیوں کی گونج اور رنگ برنگے لباسوں کی چمک سے عمو بھیا گھبرا گئے..... سارا وقت یہی احساس ڈستار ہا کہ کوئی غلط قدم اٹھا لیا ہے۔ کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ جب شاد ماں قافلہ لئے پٹے عمو بھیا کے ساتھ حویلی واپس آیا۔ مبارک سلامت سے فضا گونج اٹھی، حویلی کی نوکرائیوں نے گدا ڈالا۔ رفو اور شاداں نے ڈھولک بجائی۔ گیت گائے، اماں اور دادی اماں خوشی سے جھوم جھوم گئیں۔

عمو بھیا سارے ہنگامے سے دامن چھڑا کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آئے تپلے اور پھولوں کے ہار گلے سے بے زاری سے اتارتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئے لیکن وہ دروازے ہی میں ٹھٹھک گئے۔

کمرہ برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا..... اور گڈو رانی ان کی تصویر کے سامنے

کھڑی تھی۔ شاید آہٹ ہوئی، وہ ایک دم پلٹی، عمو بھیا کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر جانے کیا ہوا۔ ایک دم گھنگھور گھٹائیں سمٹ آئیں۔ اور حسین آنکھوں کے سیاہ اندھیرے جل تھل ہو گئے۔

لمحے کے کوئی ہزارویں حصے میں دس سال سمٹ گئے..... عمو بھیا جلدی سے آگے بڑھے اور بے ساختہ بولے۔

”کیا چھن...؟“

لیکن وہ اس سے آگے نہ بول سکے۔ گھنگھور گھٹائیں پھٹ کر برسنے لگیں۔ بھیگا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے گڈورانی کمرے سے باہر بھاگی تھی۔

”کیا چھن گیا گڈورانی؟“ عمو بھیا کیسے فقرہ مکمل کرتے وہاں تو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

عمو بھیا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے کانوں پر رکھ لئے مبادا اپنی ہی چیخ سے کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں۔

☆☆☆

سیلاب

بادلوں کے تیور خوفناک تھے، بدست سیاہ ہاتھیوں کی طرح جھومتے چنگھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ آسمان کی رنگت سیاہ لگتی تھی۔ ان سیاہیوں میں اترتی خنجر نما بجلیاں خوفناک دکھائی دیتی تھیں۔

کئی دنوں سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ زمین جذب کر لینے کو اتنی طاقت کہاں سے لاتی۔ وہ تو اب بوند بھر پانی بھی اپنے میں سمونے سے قاصر تھی جتنا پانی برستا وہ جوں کا توں لوٹا دیتی، پانی نالیوں سے پھوٹ پڑتا، گلیوں میں بہنے لگتا۔ اور آوارہ گردوں کی طرح جدھر منہ اٹھتا بہہ نکلتا، گاؤں کے کچے مکانوں کی کیا بساط، اب تو شہروں کی کچی آبادیاں بھی اس مسلسل پانی سے پناہیں مانگ رہی تھیں۔ مکانوں کی بنیادوں میں پانی دھنس رہا تھا۔ چھتیں ٹپک رہی تھیں۔ اور جہاں جہاں نکاس کی راہیں نہیں تھیں جو ٹر بن گئے تھے۔

”یارب، اب تو معافی دے دے۔“ رحمت دین نے اپنے کچے مکان کے چھپر نما برآمدے میں کھڑے کھڑے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ کونے میں بنے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہنڈیا میں ڈوٹی ہلاتی برکتے نے اپنے شوہر کو بیزارسی نظروں سے دیکھا اور پھر طنز سے بولی۔

”اب کیوں کہہ رہا ہے ایسی بات۔“

”کیوں برکتے“ اپنے رب سے معافی ہی مانگ رہا ہوں اس طوفان کی..... دیکھ تو کتنے کالے بادل امنڈ آ رہے ہیں، برس گئے تو خیر نہیں، یہ گھروندا ٹھہرنہ سکے گا۔ اب کے۔“

”تو تجھے کیا۔ تو تو بے فکر ہے نا، مکان گر بھی گیا تو ماتھے پر بل تھوڑا ہی آئے گا۔“

”تیری تو مت ماری گئی ہے بھلی لوگ، بتا تو بھلا ان بادلوں کو روکنے کی مجھ میں طاقت ہے۔“

”ہونہر۔“

برکتے نے تانبے کی بے قلعی تھالی اپنے دس سالہ بیٹے کے سامنے سرکا دی۔ جو ہنڈیا پکنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

”لے پڑنے لگیں بوندیں۔“ رحمت دین نے موٹی موٹی برستی بوندوں کو دیکھا اور پھر صحن میں پڑی چار پانی کو برآمدے میں گھسیٹ لایا۔

”اے زہری۔“ برکتے نے ہنڈیا چولہے سے اتارتے ہوئے گھبراہٹ میں بیٹی کو پکارا۔

”کیا ہے اماں۔“ زہری بے پٹ کی کھڑکی سے ماں کو جواب دیتے ہوئے بارش کی بوندیں اپنے پھیلے ہاتھوں پر لینے لگی۔

”اے لڑکی کیا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اس کمرے کی چھت ٹپکتی ہے۔ یہ راکھ اوپر ڈال آ۔ رات کو سونے کی جگہ بھی نہ ملے گی۔ اور وہ چار پائیاں بھی تو اٹھالے۔ بستر لگا دے ان پر، توری پر لگن بھی الٹا دے، سارا پانی بھر جائے گا۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بیٹی کو کئی احکامات سنا دیے۔ زہری اچھا اماں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی، پانچ اٹھائے، دوپٹے کی دوہری بکل مارے وہ آدھ کچے صحن میں بھاگ بھاگ کر چیزیں اٹھانے لگی۔ بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ اور ہواؤں میں بھی تندہی آ گئی تھی۔ شرب شرب پانی میں بھاگتی وہ چیزیں اٹھا رہی تھی۔

رحمت دین وہیں بان کی کھری چار پانی پر بیٹھ گیا۔ حقے کی ٹے منہ میں دباتے

ہوئے وہ کالے کالے بادلوں کو دیکھنے لگا جن کے تیور خوفناک نظر آ رہے تھے۔

”شیدا نہیں آیا ابھی۔ برکتے نے متفکر انداز میں ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”اتنی بارش آ گئی، جانے کہاں بھگ رہا ہوگا۔“

”تو نے ہی تو بھیجا تھا بہن کی خبر لینے کو۔“ رحمت دین حقہ گڑ گڑاتے بولا۔ ”آ ہی جائے گا گرمیوں ہی کی بارش ہے، نمک کا تو نہیں بنا جو پکھل جائے گا، جوان ہو رہا ہے۔ اسے سنبھال سنبھال کر نہ رکھا کرو، حالات سے پنپنا اسے آنا ہی چاہیے۔“

”تو تو ہر وقت یہی درس دیا کر، دیکھ نہیں رہا کتنی طوفانی بارش ہے۔ اور رات بھی اتر آئی ہے۔“ ماں کا انداز متفکرانہ تھا..... چودہ پندرہ سال کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ حالات سے پنپنے کی تو عمر پڑی ہے۔“

وہ جانے کیا کیا بکتی رہی۔ رحمت دین حقے کی گڑ گڑاہٹ میں اس کی سنی ان سنی کرتا رہا۔ زہری نے چھوٹے بھائی کو کھانا کھلایا۔ برتن سمیٹ، ہنڈیا تپتی راکھ پر ہی رہنے دی۔ برآمدے میں پڑی ہر چیز اس نے جگہ جگہ رکھ دی، اور پھر ابا کے قریب چار پانی کے ایک کونے پر آ بیٹھی۔ چادروں کی صورت پڑتے پانی دیکھتے ہوئے ابا سے باتیں کرنے لگی۔

”ہائے ابا، اس بارش میں اگر ہمارا مکان گر گیا تو کیا کریں گے۔“ سولہ سترہ سالہ زہری خوف سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

”کرنا کیا ہے بارشیں تھمیں گی تو پھر بنالیں گے.....“ رحمت دین نے امید افزا سکون سے کہا۔ ”اللہ کی رضا یہی ہے، تو پھر ہم اعتراض کرنے والے کون ہیں بیٹی۔“

برکتے اس کے پرسکون انداز سے جل ہی تو گئی۔ ہمیشہ ہی اس کی ایسی باتوں سے جل جایا کرتی تھی۔ ایسا متوکل انسان بھی کیا؟ کبھی تو نصیبوں کا شکوہ کرنا چاہیے۔ کسی وقت تو قناعت کا دامن چھوٹنا چاہیے۔ ہر نقصان پر صبر، ہر مصیبت پر شکر، جانے کس قسم کا آدمی تھا رحمت دین برکتے کو اس کی اسی پرسکون عادت سے بس چڑھتی تھی۔

وہ بھی کوئی جلی کٹی سنانے ہی والی تھی کہ گلی میں لوگوں کے اونچی آواز میں بولنے کی

گھبرائی گھبرائی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”اے پتا تو کرو کیا ہوا ہے۔ بہت شور ہو رہا ہے..... اور سننا کیسی عجیب آوازیں آرہی ہیں.....“ اس نے کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

رحمت دین جلدی سے اٹھا۔ تہبند پر صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ بیٹے سے گرتا لانے کو کہا۔ لیکن اسے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شور واضح ہو گیا تھا۔ اور آوازیں صاف ہو گئی تھیں۔

”سیلاب آرہا ہے پانی چڑھ رہا ہے، نکل چلو.....“ نکل چلو.....“

”ہائے میں مر گئی۔“ برکتے نے سینے پر دو ہتھ مارا۔ زہری بھی خوف سے سپید پڑ گئی۔

”اماں شیدا.....“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

برکتے تھرتھرا کر پنے لگی۔

رحمت دین لپک کر بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ گلی ندی بنی ہوئی تھی اور پانی بیرونی دلیزوں سے اوپر آ رہا تھا۔ سامنے دروازے سے سرداراں سر پر گھڑی اٹھائے نکل رہی تھی۔ اور لوگ بھی تھوڑا تھوڑا سامان سروں پر رکھے پانی میں گھٹنے گھٹنے ڈوبے گھروں سے نکل رہے تھے۔

”اے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ نہر کا بند ٹوٹ گیا ہے پانی تیزی سے آرہا ہے۔ جلدی جلدی نکل چلو، گاڑی کی پٹری اونچی ہے۔ وہاں تک پہنچتے بھی دیر لگے گی۔ پانی تو گولی کی تیزی سے آرہا ہے۔“ لوگ رحمت دین سے کہہ رہے تھے۔

اور جب رحمت دین کندھوں پر اپنے دس سالہ بیٹے کو اٹھائے زہری اور برکتے کے ساتھ گھر سے نکلا۔ تو پانی کے ریلوں میں قیامت کا زور آ گیا تھا۔ زہری کے سر پر رکھی کپڑوں کی گھڑی اس ریلے کی نذر ہو گئی۔ اور برکتے کے سینے کے ساتھ لگی غمر بھر کی پونجی پانی کے تھپڑے سے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ شیدے کا غم الگ، زیور اور نقدی کا غم الگ۔ برکتے تو بوکھلائی جا رہی تھی۔ کمر کمر پانی میں چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ واویلا

کرتی جا رہی تھی۔ رحمت دین اسے زہری کا ہاتھ پکڑنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اسے تو چیزوں کے ڈوبنے کا غم نہیں تھا فکر تھا تو شیدے کا..... یا زہری کا..... دعائیں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے پٹری تک پہنچ جائیں۔

پٹری پر پوری بستی کے لوگ بے سرو سامانی کے عالم میں چیخ و پکار کر رہے تھے۔ کوئی سامان کو رو رہا تھا۔ کوئی بال بچے کو اکٹھا کر رہا تھا۔ بارش اب بھی انہی تیوروں سے پڑ رہی تھی۔ اور بند ٹوٹ جانے پر بہہ آنے والا پانی غصے سے جیسے دیوانہ ہو رہا تھا۔ بڑی عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔ جب کوئی مکان پانی میں گرتا تو ایک ہولناک سا دھماکہ ہوتا۔ پٹری پر بیٹھے لوگ خوفزدہ ہو جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو خاصا کھرام مچایا ہوا تھا۔

برکتے ساری رات شیدے کے لئے تڑپتی رہی۔ تڑپ رحمت بھی رہا تھا لیکن اس کا انداز ہمیشہ کی طرح تھا۔ برکتے تو اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اب رحمت دین کے سکون سے چڑ بھی نہیں رہی تھی۔ بیٹے اور بیٹی کو پہلو سے لگائے وہ رات بھر روتی رہی۔

بارش تھم گئی، ہواؤں کا زور ٹوٹ گیا۔ لیکن پانی کا بے روک بہاؤ تھمنے میں نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ پانی پٹری پر بھی آ جائے گا۔ موت اتنی قریب نظر آ رہی تھی۔ ہر دل سہا ہوا تھا۔ اب تو وہ وقت آ گیا تھا۔ کہ کسی کو مال کی نہ پڑی تھی۔ گھربار بھی یاد نہ آ رہا تھا۔ ساتھ لائی پونجی کا بھی احساس نہ رہا تھا۔ پونلیاں اور گھڑیاں بھی گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ لیکن کسی کو پرواہ نہ تھی۔ سب کی نظریں تو خونخوار پانی پر جمی تھیں..... جو اندھیرے میں اور بھی خوفناک لگ رہا تھا۔ جس میں تندہی آرہی تھی۔ اور جس کی خونی لہریں لپک لپک کر پٹری تک آرہی تھیں۔

لیکن قدرت کو شاید ان لوگوں کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ پانی پٹری سے دو ہاتھ نیچے ہی رک گیا۔ اس کی غراہٹیں بھی کچھ کم ہو گئیں۔ اور شور بھی قدرے تھم گیا، ہاں مکان اب بھی عجیب سی آواز کے ساتھ پانی میں گر رہے تھے۔

رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ اور صبح جب بیدار ہوئی تو لوگوں نے

دیکھا پوری بستی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی، سرخ سرخ پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور گھروں سے بہہ بہہ کر آنے والا سامان تیرتا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو دیکھ کر اندازہ لگا رہے تھے سیلاب کے جو آثار تھے یہی لگتا تھا کہ کسی کا کچھ بھی نہیں بچ سکے گا۔

رحمت دین کا گھر تو سرے سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ سرداراں کے گھر کی ٹٹی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کے مکان کی چھت وغیرہ نظر نہ پڑتی تھی۔

ایک گہری ٹھنڈی آہ بھر کر وہ بے حال برکتے اور سہمی ہوئی زہری کے پاس بیٹھ گیا۔ سیلاب اسی کو تو کہتے ہیں۔ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بچتا۔

لیکن رحمت دین کو یوں محسوس ہوا جیسے سیلاب نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ سب کچھ بچ گیا ہے کچھ بھی نہیں ڈوبا۔ اس نے اپنے شیدے کو جو دیکھ لیا تھا..... شیدا..... اس کا جواں سال بیٹا..... جو رات بچھڑ گیا تھا۔ برکتے بھی اپنے بچے سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔ ایک لمحے کو تو اسے بھی یوں محسوس ہوا۔ جیسے سیلاب آیا ہی نہیں۔

”سارا دن بے سرو سامانی کی حالت میں گزارا۔ تیز چمکتی دھوپ اور پانی کی بھڑاس کچھ کھانے کو نہ کچھ پینے کو۔ ایک حشر کا عالم تھا جیسے..... چاروں طرف پانی ہی پانی..... سیلن ہی سیلن..... اور تھوڑا سا پٹری کا وہ حصہ جو پانی سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اس پر پوری بستی کے لوگ گرے پڑے تھے۔

تیسرے دن پانی اترنا شروع ہوا۔ لوگ کمر کمر تک پانی کو چیرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی خبر لینے دوڑے۔ رحمت دین بھی گیا۔ لیکن اس کے مکان کی دو تین آدھی آدھی دیواریں ہی نظر آئیں۔ چھتیں گر گئی تھیں۔ اور اٹا تھ ڈوب گیا تھا۔

دکھ تو اسے بھی ہوا۔ لیکن حسب عادت صبر شکر کر گیا۔ اور جب برکتے رو رو کر بین کرنے لگی تو وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

”بھلی لوگ خدا کا شکر ادا کر سب خیریت رہی۔“

”خیریت؟“ اس نے قہر آلود نگاہوں سے رحمت دین کو دیکھا۔ ”مکان گر گیا“

کوئی کپڑا بچا نہ بستر برتن رہا نہ کوئی اور شے اور کہہ رہا ہے سب خیریت رہی۔“

”اللہ نے چاہا تو سب کچھ پھر بن جائے گا۔ جانیں بچ گئیں اللہ کا شکر ہے۔ بتلا تو بھلا، خدا نخواستہ شیدے کو کچھ ہو جاتا تو کیا کرتی مولانا نے بچھڑے ہوئے کو ملادیا۔

میرے بچے خیریت سے رہے، تو بچ گئی، میں زندہ رہا..... میں سمجھتا ہوں سیلاب آیا ہی نہیں۔ سیلاب تو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ ہماری دولت تو ہمارے پاس ہی ہے۔ باقی رہی سختی، تو وہ انسانوں پر ہی آتی ہے۔ ہاتھ پیر سلامت رہیں۔ میں پھر نئے سرے سے محنت کروں گا۔ میرا شیدا بازو بنے گا۔ دیکھ لینا بہت جلد تجھے پکا مکان بنوا دوں گا۔“

برکتے کچھ نہیں بولی۔ واقعی اگر شیدانہ ملتا تو وہ کیا کرتی..... زہری ڈوب جاتی یا حمیدا لاپتہ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ شیرے کی ماں کیسے لوٹ رہی تھی۔ پٹری پر شیر سا بیٹا ڈوب گیا تھا..... نسیمہ بھی اپنی خالی گود کو پاگلوں کی طرح تک رہی تھی۔ چھ ماہ کی بچی رات گھر سے نکلتے نکلتے پانی کا نوالہ بن گئی تھی، آج پہلی بار برکتے کو محسوس ہوا تھا، کہ رحمت دین اچھی باتیں کرتا ہے۔ تینوں بچوں اور شوہر کے ساتھ بیٹھی پہلی کا پٹروں سے گرائی جانے والی سوکھی روٹیاں اور اچار کھاتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی بہشتی میوہ کھا رہی ہے۔ اتنی تباہی کے باوجود وہ پرسکون تھی۔ بلکہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شیدا اور حمیدا اچار کے لئے یوں لڑ رہے تھے، جیسے گھر میں بوٹیوں پر لڑا کرتے تھے۔

پانی اترنے کے بعد بھی بستی رہائش کے قابل نہ رہی تھی۔ جا بجا جو بڑ بن گئے تھے۔ مکانوں کے طبلے اور ان کے تلے دبے سامان سے سڑاٹا اٹھتی تھی۔ بدبو ہی بدبو تھی۔ بے سرو سامان لوگوں کو پٹری سے اب بڑی سڑک کے کنارے منتقل کر دیا گیا ہے۔ امدادی پارٹیاں آن پہنچیں۔ لوگوں میں کپڑے، کھانا بستر اور کچھ خیمے تقسیم ہوئے۔

رحمت دین کے ہاتھ بھی ایک خیمہ آ گیا، نگلی زمین اور کھلے آسمان تلے بیٹھا وہ

گھبراتا تو نہیں تھا، ہاں زہری کی وجہ سے فکر مند تھا۔ سرراہ پڑی جوان بیٹی کے لئے پناہ گاہ کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ خیمہ کیا ملا، اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

”اب فکر کی بات نہیں برکتے۔ اس خیمہ کو اب گھر ہی سمجھو۔ تم اطمینان سے رہا کرو اپنی بیٹی کے ساتھ میں، میں اور شیدا، اب بے فکری کے ساتھ محنت مزدوری کے لئے نکلا کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ برکتے نے جواب دیا۔ ”واقعی خیمہ اب اسے گھر ہی کی طرح لگنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی بولی۔

”جلدی جلدی چار دیواریں کھڑی کر لے اپنے گھر کی..... خیمہ بے شک ہے لیکن مجھے تو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ رنگ برنگے لوگ روز روز آتے ہیں۔“

”اے بگلی یہ رنگ برنگے لوگ تو رحمت کے فرشتے ہیں..... لوگوں کو راشن دیتے ہیں، کپڑے لاتے ہیں۔ بستر، برتن انہی لوگوں نے تو دیئے ہیں۔ سر پر آن پڑے تو ہماری قوم تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی ہے۔ سیلاب سے متاثر بے شک ہم لوگ ہوئے ہیں۔ لیکن خدا نے جھنجھوڑا ان لوگوں کو دیا ہے۔ کتنا کام کر رہے ہیں۔ دن رات کی پرواہ کئے بغیر لوگوں کی مدد کرتے پھرتے ہیں۔ اپنے اپنے طور پر سب کام کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ برکتے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”پھر بھی جتنی جلدی ہو گھر کی دیواریں کھڑی کر لے۔“

”وہ تو کر ہی رہا ہوں۔ باپ بیٹے کی مزدوری کافی ہے۔ کھانے پینے کو یہاں سے مل جاتا ہے۔ بس مولانے چاہا تو دس پندرہ دن میں اپنے گھر چلے جائیں گے۔“

برکتے خاموش ہو گئی۔ ان رحمت کے فرشتوں کا ذکر رحمت نے جس اعتماد اور عقیدت سے کیا تھا، وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ ویسے اس کے دل میں دوسو سے زائد تھے۔ وہ راشن تقسیم کرنے والوں میں اونچے سے قد والا بھاری بھر کم سا آدمی جو ہر وقت آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھائے رکھتا تھا۔ اسے کسی طور رحمت کا فرشتہ نہ لگتا تھا..... جتنی دیر وہاں ٹھہرتا اس کی زہری کی طرف رخ کئے رہتا۔ اور پھر جانے اپنے ساتھی کو

انگریزی میں کیا کیا کہتا۔ اس کے چہرے کی شیطانی چمک تو برکتے کو پہلے دن سے ہی کھٹکتی تھی۔ اسی لئے تو وہ چاہتی تھی کہ گھر کی دیواریں ہی اٹھ جائیں۔ تو وہ یہاں سے چلی جائے۔ وہ بار بار اسی لئے رحمت سے کہتی تھی۔ رحمت، جو سیلاب میں گھر کی ایک ایک چیز بہہ جانے سے بھی متفکر نہیں تھا۔ اور جو مکان کے گر جانے سے بھی حوصلہ مند ہی رہا تھا۔ سیلاب کی پھیلائی تباہی کو تباہی سمجھتا ہی نہیں تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ حوصلے سے مصیبتوں سے نپٹ رہا تھا۔

بچپس چھبیس دن گزر گئے، سیلاب آیا اور گزر گیا تھا۔ زندگی کی تگ و دو پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ لوگ گھروں کے بلے سمیٹ رہے تھے بھیگی ہوئی چیزیں نکال رہے تھے۔ خشک کر رہے تھے۔ زندگی مسلسل حرکت کا نام ہی تو ہے۔ حرمت دین نے پھر گھر کی دیواریں اٹھائی تھیں۔ بس دو ایک دن میں وہ بال بچوں کو گھر لے جانے والا تھا۔ اس دن وہ شیدے کے علاوہ حمیدے کو بھی ساتھ کام پر لے گیا۔ چار پیسے فالٹو مل جانے کی توقع تھی۔ اور برکتے نے بھاگڑ مچا رکھی تھی کہ گھر جلدی بنے۔

دو پہر ڈھل رہی تھی، زہری برتن وغیرہ دھو کر خیمے سے باہر نکلی، ماں کتنی دیر سے راشن لینے گئی تھی۔ اب تک نہ آئی تھی۔ اسے تشویش ہوئی، کسی کو بھجوا کر پتہ کروانے کا سوچا۔ لیکن سبھی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مرد تو تقریباً سبھی اپنے اپنے کاموں پر گئے تھے۔ عورتیں کچھ راشن لینے گئی تھیں، کچھ کاموں میں مصروف تھیں۔ چند بچے درخت تلے کھیل رہے تھے..... وہ ان کی طرف بڑھی۔

لیکن بچوں تک پہنچنے سے پہلے ایک آدمی نے اسے اپنی طرف بلایا۔

”کیا ہے؟“ اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ یہ آدمی اس نے کئی بار راشن والوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

”تمہاری ماں نے تمہیں بلایا ہے۔ راشد زیادہ ملا ہے۔ اس سے اکیلے اٹھایا نہیں جاتا، بلار ہی ہے۔ وہ سامنے درخت کے پار جو دیوار نظر آ رہی ہے نا وہاں چلی جاؤ۔“

وہ اسی سیدھ پر چل دی۔

برکتے تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔ زہری کو خیمے میں نہیں پایا۔ راشن کونے میں رکھ کر باہر آ گئی۔ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے بیٹی کو دیکھا، پاس والوں سے پوچھا۔ عورتوں سے بچوں سے، کبھی سے پوچھتی پھری۔ وہ کہیں بھی نہ تھی۔ اسے یونہی خیال آ گیا کہ کہیں گھر دیکھنے نہ چلی گئی ہو۔ بھگم بھاگ وہ پڑی تک پہنچی..... ہانپتی کانپتی گھر تک آئی۔ زہری کہیں بھی نہ تھی۔ وہ دھڑکتے دل کو تھامتے واپس آئی۔ زہری کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ کچھ بچوں نے اسے بتایا کہ وہ درخت کے اس طرف دیوار کی طرف گئی تھی..... برکتے ادھر ہی دوڑ پڑی۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھکے ہارے قدموں سے وہ واپس آئی۔ تو رحمت کپڑے سے اپنا پسینہ سکھا رہا تھا۔ شیدا لوٹے میں پانی بھر کر پاؤں دھو رہا تھا۔ اور حمید باپ کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہا تھا۔

”کہاں کی سیریں کر رہی ہو ماں بیٹی“ رحمت دین آج پیسے زیادہ ملنے پر بہت خوش تھا۔
لیکن

جب برکتے نے زہری کے متعلق بتایا تو وہ چونک گیا۔ کپڑا ہاتھ میں لئے وہ برکتے کی طرف آیا۔

”کیا کہہ رہی ہو اس نے جانا کہاں ہے، یہیں کہیں ہوگی۔“
برکتے زمین پر بے حال ہو کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ”میں اسے ہر جگہ ڈھونڈ آئی۔ کہیں نہیں ملی، بچوں نے بتایا کہ اسے کسی آدمی نے درخت کی اس طرف والی دیوار کی طرف بھیجا تھا۔“

”کب؟“ رحمت دین کا سانس اکھڑ سا گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے برکتے کو دیکھنے لگا۔

اور پھر گھر کے سبھی افراد زہری کی تلاش میں اٹھ دوڑے۔ راہ گیروں سے پوچھتے پھرتے۔ ویرانوں میں ڈھونڈتے پھرتے۔ جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا،

تلاش کیا۔

لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

تھک ہار کر سب واپس لوٹے تو برکتے سینے پر پریشانی کے عالم میں دو ہتھ مارتی جا رہی تھی۔ اور رحمت دین تو یوں جھک کر چل رہا تھا جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی ہو۔ پھر بھی دل کو تسلیاں دیئے جا رہا تھا۔ برکتے کو داویلا کرنے سے اس نے جھڑک کر روکا۔ لیکن وہ چپ نہیں ہوئی۔ روتے روتے اپنے شک کا اظہار کر دیا۔
”وہ راشن والے..... ان ہی کے ساتھ جو ایک لمبا سا موٹا سا آدمی آتا تھا، وہی..... وہی.....“

”بک بک نہیں کر۔“ رحمت دین نے اسے ٹوک دیا۔

”تو تو مانے گا نہیں میری، میں کہتی ہوں وہی..... وہی لے گئے میری بیٹی کو.....“

میں تو لٹ گئی..... تباہ ہو گئی..... مجھے تو ہر وقت ہی دھڑکا رہتا تھا۔“

رحمت دین بھی گھبرا گیا۔ حوصلہ تو اس نے کبھی بڑی سے بڑی مصیبت میں گھر کر بھی نہیں ہارا تھا۔ لیکن جوان بیٹی کا معاملہ تھا۔ اب تو شام بھی گہری ہو گئی تھی۔ اور ہر طرف ڈھونڈنے کے باوجود بھی اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ حوصلہ آپوں آپ ٹوٹ رہا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھے وہ ست ست قدم اٹھاتا خیمے کی طرف آ رہا تھا۔ برکتے داویلا کر رہی تھی۔ شیدا اور حمید ابھی سر جھکائے چل رہے تھے۔

زہری کی گمشدگی نے گھر والوں کے علاوہ ارد گرد کے لوگوں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ رحمت دین اور برکتے کو گھیرے میں لئے ہر کوئی اپنا ہی سوال کر رہا تھا۔ جواب دینے کی ہوش کسے تھی۔ برکتے تو رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ لیکن رحمت دین پر تو جوں جوں شام ڈھل رہی تھی، سکتے کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ شیدا اور حمید پھر تلاش میں نکل پڑے۔ بستی کے کئی جوان بھی ان کے ہمراہ ہو لئے تھے۔ باقی وہیں انتظار کرنے لگے تھے۔

لیکن انتظار کچھ زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔

زہری آگئی۔

وہ زہری نہیں جو یہاں سے گئی تھی۔ بلکہ دوسری زہری..... جس کے بال کھلے تھے۔ جس کی آنکھوں میں وحشت جم گئی تھی۔ اور جو بربادی کی داستان کا عنوان تھی۔ برکتے نے سر پیٹ لیا۔ بستی کے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ شیدا شعلے کی طرح بھڑک اٹھا، حمید اُغزانے لگا۔

لیکن رحمت دین

مضبوط و مستحکم حوصلے والا رحمت دین، طوفان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے والا رحمت دین، مصیبتوں کو صبر شکر کے ساتھ جھیل جانے والا رحمت دین، آنکھیں پھاڑے بیٹی کو تنکے جا رہا تھا۔ اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ اور ٹھنڈے پسینے میں جیسے نہا سا گیا تھا۔ بستی کے ایک معمر نے اسے تھام لیا۔

”سیلاب تو ختم..... سیلاب تو..... ختم۔“ اس کے بے رنگ ہونٹوں پر صرف یہی الفاظ پھڑپھڑائے۔ اور پھر اس کا سر تھانے والے کے کندھے پر لڑھک گیا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ سیلاب تو ختم ہو گیا، بہہ سب کچھ اب کیوں گیا؟ اور جب لوگوں نے اس کے جسد بے جان کو چارپائی پر ڈالا تو اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں مجسم سوال تھیں، پوچھ رہی تھیں،

کہ

سیلاب جب آیا یا اب؟

☆☆☆

ویرانے میں بہار

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے۔

جیسے سوکھے ڈالوں پر ہریالی لہرانے لگے۔

جیسے اندھیری رات چاندنی کا پیرہن پہن لے۔

جیسے خاموشیوں کے ساکت دل دھڑک اٹھیں اور دم بخود ماحول میں نغموں کا رسیلا

ترنم لہرانے لگے۔

عاشی کو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ خوشیوں کے سوتے اس کی ذات کے اندر چار سو

پھوٹ نکلے تھے۔ گال تہمتار ہے تھے، اور آنکھوں میں رنگین خوابوں کا عکس لہرانے لگا

تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، ہوا کے دوش پر لہراتی پھرے، ناچے جھومے اور مستی کے عالم

میں بہک بہک جائے۔

تھوڑی دیر پہلے وہ نموبھابی کے گول مٹول بچے کو اٹھائے، ان کے کمرے میں گئی تھی

بھابی کوئی خط پڑھ رہی تھیں۔

”کس کا خط ہے بھابی۔“ اس نے بچے کو ہوا میں اچھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”عامی کا؟“

”جی.....“ عاشی کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”عامی کی پوسٹنگ یہاں ہو گئی ہے عاشی، دو ہفتے کو آ رہا ہے۔“ انہوں نے خط کو

تہہ کرتے ہوئے کہا، پھر بولیں۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”تائی امی پچھلے برآمدے میں بیٹھی ہیں۔“ فرط مسرت سے عاشری نے بچے کو اتنی زور سے بھینچا کہ وہ چیخ اٹھا۔

”آ جاؤ بھی آ جاؤ۔“ نموبھابی نے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے بچہ اچھل کر ماں کی گود میں آ گیا۔

”یہ خط امی جان کو دے آؤ عاشری، شکر ہے عامی کی پوسٹنگ یہاں ہو گئی۔“ نموبھابی نے عاشری کے گلگلوں رخساروں پر نگاہ ڈالی، حیا بار نظروں کو دیکھا عاشری خط لے کر باہر نکل گئی۔

بیٹے کی پوسٹنگ کی خبر ماں کے لئے خوش کن تھی۔ خط پڑھ کر ان کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میٹرک کے بعد وہ گھر سے نکلا تھا، پہلے کالج میں داخلہ لے کر ہوٹل میں رہا پھر کمیشن لے لی اور چار پانچ سال پورے پاکستان میں گھومتا رہا۔ کبھی مظفر آباد تو کبھی کوئٹہ کبھی پشاور تو کبھی حیدر آباد میں۔ کبھی کھاریاں بھی رہا اور کچھ وقت پنڈی میں بھی گزارا۔ اس سارے عرصے میں وہ بہت کم گھر آیا۔ لمبی چھٹی تو کبھی گھر پر گزاری ہی نہیں تھی۔ آٹھ دس دن کے لئے آتا۔ اور پھر مہینوں کے لئے چلا جاتا۔ امی اس کی جدائی بری طرح محسوس کرتی تھیں۔ گو بڑا بیٹا اور بہو گھر میں تھے۔ لیکن عامی کی بات ہی اور تھی۔ اور جب سے نجمہ کی شادی بھی کر دی تھی۔ تائی اماں کے من کے اندر جیسے تنہائیاں ہی تنہائیاں رہ گئی تھیں۔ بہو بیٹے کی مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ان کا وجود نہ ہونے کے برابر محسوس ہوتا تھا، ہاں عاشری کے آ جانے سے انہیں جیسے نجمہ کا بدل مل گیا تھا.....

عاشری کے امی ابو ان دنوں سعودی عرب میں تھے۔ ابو آرمی کے ڈاکٹر تھے، دو سال کے ڈیپوٹیشن پر گورنمنٹ نے بھیجا تھا، عاشری بی اے فائنل میں تھی۔ تعلیم کا سلسلہ وہاں جاری نہ رکھا جاسکتا تھا۔ اس لئے اس کو تائی امی کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

عاشری پہلے پہل تو بہت گھبرائی تھی۔ اتنی بڑی کوشی میں چند نفوس وہ بھی جیسے ایک

دوسرے سے بے خبر ناشتے کی میز پر ملاقات ہوتی۔ یا پھر رات کے کھانے پر ہر کوئی اپنی ذات کے حصار میں مقید، اپنے حالات میں گرفتار تھا عاشری کوئی چلبلی یا باتونی سی لڑکی ہوتی۔ تو شاید اس آراستہ نفس میں اس کا دم گھٹ جاتا۔ لیکن وہ کم سن اور شرمیلی سی لڑکی تھی۔ جلد ہی اس ماحول میں رچ بس گئی۔ وقت گزاری کے لئے تائی اماں کی خدمت اور گول منول منے کی صحبت کافی تھی۔ پڑھنے سے جو وقت بچتا۔ وہ ان دونوں محبوب مشغلوں کی نذر کر دیتی۔ مناس سے اس قدر مل گیا تھا۔ کہ وہ کالج سے آتی تو ماں کی گود سے چل چل کر اس کی طرف بانہیں پھلا کر تنکے لگتا۔ یہی حال تائی امی کا تھا۔ کالج سے آتی تو خود اس کے لئے کھانا لگواتیں، پاس بیٹھ کر کھلاتیں اور اس سے کالج کی چھوٹی موٹی مصروفیات کا پوچھتی رہتیں۔

زندگی اپنے طور سے رواں دواں تھی۔ تائی امی منا اور کورس کی کتابیں عاشری کی دلچسپیوں کے یہی محور تھے۔

لیکن.....!

اچانک یہی محور بدل گئے۔ دلچسپیوں کا نیا محور جو نیا تو نہیں تھا۔ عرصے سے من کے کسی گوشے میں چھپا تھا۔ سامنے آ گیا۔ ان دنوں عامی کھاریاں تھا اور تین دن کی چھٹی پر آیا تھا۔

اونچے لمبے قد چوڑے چکلے بدن اور ہنستی مسکراتی آنکھوں والا عامر اس عامر سے کتنا مختلف تھا۔ جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، بات بات پر لڑتی اور دانت کاٹ لیا کرتی تھی۔ وہ بھی تو موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کرتا تھا۔ کبھی اس کے بال نوچ لیتا۔ کبھی دھوکا دے دیا کرتا اور کھلونے تو کبھی چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ ایسی پیاری پیاری گڑیاں آنا فانا توڑ دیا کرتا۔ پیارے پیارے ٹی سیٹ اس کی آنکھ بچا کر چکنا چور کر دیا کرتا۔ دونوں میں اتنی لڑائی ہوتی تھی کہ اکثر والدین پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ پل بھر کو بھی تو دونوں چین سے نہ بیٹھ سکتے تھے۔ صلح بھی ہوتی تو سب کو یہی خدشہ رہتا کہ ابھی لڑے کہ لڑے۔

اور پھر عاشی کے ابو کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ کئی سال وہ دوسرے شہروں میں رہے۔ عاشی کے ذہن میں عامر کی کوئی خوشگوار یاد محفوظ نہ رہ سکی۔ اچھا تاثر یادوں کے سایوں پر نہ لہرایا۔ کبھی کبھار اگر ملنا بھی ہوتا تو اجنبیوں کی طرح کچھ بچپن کے یہ لاشعوری تاثرات اور کچھ عاشی کی کم خنی اور شرمیلی طبع، نہ کبھی عامر نے کسی خاموش جذبے کا اظہار کیا تھا، عاشی کی طرف سے تو اظہار کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔

لیکن جانے کیا ہو گیا۔ دنیا ہی الٹ پلٹ ہو گئی۔ خاکی وردی میں ملبوس جیالا سپاہی اپنے تمام تر وقار اور شخصیت کے نکھرے حسن سے روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ کیسا اجنبی بن گیا تھا وہ..... تائی امی سے کیسی بے نیازی سے پوچھا تھا۔ ”یہ کون صاحبہ ہیں امی۔“

”جیسے جانتا ہی نہیں شریہ کہیں کا.....“ امی نے پیار سے اس کے سر پر ہلکا سا تھپڑ لگایا تھا اور عاشی کی نگاہیں اس طرح جھک گئی تھیں کہ اٹھا کر عامر کو دیکھ ہی نہ سکی تھی۔ ”قسم سے میں نہیں جانتا انہیں۔“ وہ ناجتنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ہائے ہائے عاشی کو نہیں جانتا۔“ امی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا تو یہ عاشی صاحبہ ہیں۔ جہی تو انہیں دیکھتے ہی مجھے کلائی میں درد ہونے لگا تھا۔ یاد ہے۔ یہاں دانت کاٹے تھے۔ جناب نے۔“ اس نے ہنستے ہوئے اپنی کلائی عاشی کے سامنے نگلی کر دی تھی۔ بالوں سے بھرا مضبوط مردانہ بازو گھبرا کر اس نے اپنا نرم گداز ہاتھ پیچھے ہٹایا تھا تو جیسے بجلی کے مثبت و منفی تار ٹکرا گئے تھے۔ شدید ترین جھٹکے کے احساس سے کانپ گئی تھی۔

شاید اس کی گھبراہٹ وہ بھانپ گیا تھا۔ کتنی شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر لبوں میں مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

پہلے ہی دن اس نے بے تکلف ہونے کی بھرپور کوشش کی تھی، لیکن عاشی کتراتا رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تاش لے آیا تھا۔ ”کھیلو گی۔“

”نہیں۔“

”کیوں آتی نہیں۔“

”میں سکھائے دیتا ہوں۔“

عاشی نے گھبرا کر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

نمو بھابی نے اس کی جان چھڑائی تھی۔ ”آؤ میرے ساتھ کھیلو۔“

اور وہ دونوں دیر تک کھیلتے رہے۔ عاشی قریب ہی کرسی پر بیٹھی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

اور اس شام اس نے واپس جانا تھا۔ لان میں چائے پینے کے بعد بڑے بھیاٹھ گئے تھے۔ نمو بھابی سلاخیاں بٹنے میں مصروف تھیں، اور اماں اخبار لے بیٹھی تھیں۔ گھاس پر عامر منے کو لے لیٹا بار بار اچھال رہا تھا۔

”منے یا رتم گونگے ہو۔ باتیں ہی نہیں کرتے، پتھر لگتے ہو پتھر۔“ وہ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی ان باتوں پر عاشی کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اور گال تہمتا رہے تھے۔ وہ اس کی دزدیدہ نظروں کی تپش بھی تو محسوس کر رہی تھی.....

تیسرے دن عامر واپس چلا گیا۔ تو عاشی کو یوں لگا تھا۔ کہ جیسے وہی رونق محفل تھا۔ وہی جان انجمن، ہر سو ویرانی ہی ویرانی لگتی تھی۔ تنہائی کا احساس جان لیوا سا ہو گیا تھا کتنے ہی دن وہ اداس رہی تھی۔ امی ابو کو یاد کر کے روتی بھی رہی تھی۔ من کے اندریوں آپوں آپ اگ آنے والی اداسیوں کو ان کی یاد سے منسوب کر کے جذبات کی پردہ پوشی تو کرنا ہی تھی۔

اور اب.....!

عامی آ رہا تھا۔ یہاں ہی رہنے کے لئے۔ عاشی کی خوشیاں بہک رہی تھیں رنگین خوابوں کے عکس آنکھوں میں ڈولنے لگے تھے وہ کتنی شدت سے اسے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ اکثر ڈوب کر سوچتی کہ اسے ایک ایسی یہ کیا ہو گیا ہے۔ عامی وہی تو ہے جس سے

آئیڈیل

اگر وہ نفرت نہیں تو محبت بھی نہیں کرتی تھی، عام سالز کا لگتا تھا، لیکن اب کیا یہ اس کی فوجی وردی کی خوبی تھی۔ یا اس کی شخصیت ہی اتنی نکھر آئی تھی کہ بچپن کے تلخ تاثرات۔ محبت کی شدتوں میں ڈھل گئے تھے۔

عامی آ گیا۔

یوں لگا کہ بن موسم بہار آ گئی ہے۔ ماحول میں جو ایک مخصوص سی چپ عاشی نے ہمیشہ محسوس کی تھی ٹوٹ گئی۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتا ہلچل مچی رہتی۔ کبھی تائی امی کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہا ہے تو کبھی نمو بھابی کو ستا رہا ہے۔ منے کی تو اکثر شامت ہی آئی رہتی۔ گال سرخ انگارہ ہو جاتے عامی کی چٹکیوں سے، بھابی چیختی اور وہ مزے سے منے کو لگداتا، جھنجھوڑتا اور ستا تا رہتا۔

کتنے پر بہار اور متبسم ہو گئے تھے، دن رات، وہی گھر جہاں دس بچے سو جانا معمول تھا۔ اب بارہ بارہ ایک ایک بچے تک قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ اس ہلچل میں عاشی بھی شریک ہوتی، لیکن جانے کیا بات تھی۔ وہ اکیلے میں عامی کا سامنا نہ کر پاتی۔ کتر کر نکل جاتی، فوراً بھاگ جاتی، بات تک کرنے کا موقع نہ دیتی شاید اس کی وجہ امی کے ان الفاظ کا ذہن میں خوف تھا۔ جو انہوں نے جاتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہے تھے۔

”بیٹی تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں ہم..... رشتہ دار ذرا ذرا سی بات کا سکیئنڈل بنا لیتے ہیں، محتاط رہنا۔“

یا پھر نمو بھابی کے اس دن والے ریمارکس تھے۔ جو انہوں نے تائی امی سے باتوں کے دوران پاس کئے تھے۔ عامی کی شادی کے لئے وہ بے قرار تھیں۔ لڑکیوں کے انتخاب کا مرحلہ تھا۔ نمو بھابی لمبی چوڑی باتوں کے بعد بولی۔ ”عامی لڑکیوں سے بہت جلدی فری ہو جاتا ہے۔ امی اس کی پسند ناپسند کا اس طرح پتہ نہیں چل سکے گا۔ سنجیدہ تو کبھی ہوا ہی نہیں.....“

عاشی کا من کانپ گیا تھا۔ اس لئے اس نے اجتناب کی روش اپنائی تھی۔ عامی نے تو اس سے بے تکلف ہونے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

آئیڈیل

اس شام وہ رنگین پھولوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی کہ وہ آ گیا تھا۔ سفید پتلون اور سفید قمیض میں کتنا سمارٹ نظر آ رہا تھا۔ عاشی اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“

”کتاب“

”وہ تو دیکھ رہا ہوں، کس چیز کی۔“

”اکنامکس۔“

”ایک دم بور اور خشک مضمون، اسے پڑھ کر جیسی تم بھی خشک اور بور ہو گئی ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کتاب چھین کر دور پھینک دی۔ عاشی ایسی بے تکلفی کے لئے ذہنی طور پر آمادہ و تیار نہ تھی۔ غصے میں آ گئی۔ جھٹلا کر وہاں سے تیزی سے ہٹی اور کتاب اٹھا کر اندر چلی گئی۔

چھوٹے موٹے کئی واقعات رو پڑ رہے تھے۔ عامی جو کسی مقناطیسی کشش سے عاشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی سرد مہری اور بیگانہ روش سے جھنجھلا گیا۔

اس دن ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ عاشی کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ عاشی نے لمبے کے توقف بغیر اپنی جگہ بدل لی تھی۔ نمو بھابی کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ اور منے کو اٹھا کر اپنے اور عامی کے درمیان کر لیا تھا۔ وہ گھور جو اس بیدردی سے رہا تھا۔

اک سہ پہر وہ کھیل کرواپس آیا تو برآمدے ہی میں کرسی پر پھیل گیا۔ بہت تھکا ہوا لگتا تھا۔ عاشی برآمدے میں کھڑی منے کے فرائ کو بٹن ٹانگ رہی تھی وہ بن بلائے ہی بولا۔ ”میں نے تو یہاں ٹرانسفر کروا کے سخت غلطی کی ہے۔ سپاٹ چہرے دیکھ دیکھ کر کوفت ہونے لگی ہے۔“

”کس کے سپاٹ چہرے۔“ اچانک نمو بھابی نمودار ہو گئیں۔ عاشی تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے بھابی کو کیا جواب دیا۔ وہ سن نہ پائی۔

اور پھر اس دن اماں عاشی سے شادی کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر سب بیٹھے تھے۔ یہ موضوع کئی دنوں سے چل رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”امی کسی جیتی جاگتی لڑکی کا انتخاب کیجئے گا، پتھر کے بت مجھے پسند نہیں۔“ وہ میز سے اٹھ گیا تھا۔ سب ہنس پڑے تھے اس کی بات پر، لیکن اس رات عاشی کا تکیہ بھیگ گیا تھا۔

اس دن کے بعد عامی کا رویہ عاشی سے خاصا جارحانہ اور بھیمانہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ قربت کی منزلیں پھلا نکلنے سے مایوس ہو کر دوسری سمت چل نکلا تھا۔ عاشی کو بعض اوقات وہ اتنا دکھ دیتا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے..... انہی دنوں نجمہ آپا اپنی پیاری سی نند شگو کے ساتھ آگئیں۔ شوخ چنچل اور بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والی شگو اور عامی میں دوستی بھلا کیونکر نہ ہوتی۔ نمو بھابی کے مصداق عامی تو لڑکیوں سے جلد فری ہو جانے کا عادی ہی تھا۔ واقعی یہ سچ دونوں یوں گھل مل گئے کہ جیسے برسوں کے ساتھی ہوں۔ رات گئے تک تاش کی بازیاں جیتیں پکچر کے پروگرام بننے۔ میس میں دعوتیں ہوتیں۔ بیڈ منٹن کھیلا جاتا۔ پکنک کے منصوبے بنتے۔

عاشی کا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ خاموش طبع تو یوں بھی تھی۔ اب تو اسے جیسے چپ نکل ہی گئی تھی۔ شب و روز بے کیف ہو گئے۔ عامی پر اسے ان دنوں غصہ بھی بہت آتا تھا۔ جب وہ شگو کو پسند کر ہی بیٹھا تھا تو پھر دل جلانے کی باتیں کیوں کرتا تھا۔ اس دن عاشی چائے کی ٹرے اٹھا کر لائی۔ تو اس نے کتنی بیدردی سے کہا تھا۔ ”یہ خادمہ قسم کی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔“

اور پھر کتنی دفعہ اس نے عاشی کے سامنے شگو کی تعریف کی تھی۔ شگو کے اٹھ کر جاتے ہی بے اختیار کہہ دیتا۔ ”بھر پور زندگی کا نام شگو ہے۔ شگو کا جواب نہیں۔ وقت کے تقاضے شگو ہی پورے کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں انیسویں صدی کی لڑکیاں نہیں کھپ سکتیں۔“

ایسی ایسی باتیں وہ اکثر منے کو مخاطب کر کے بھی اسے سنایا کرتا تھا اور وہ دل ہی دل میں جل جایا کرتی تھی کئی بار تو رو بھی پڑتی تھی۔

تائی امی کو عامی کی شادی کی جلدی تھی۔ جب سے نجمہ آئی، اماں بیٹے سے اکثر اس موضوع پر باتیں کرتی رہتیں۔ انہیں عاشی بہت پسند تھی لیکن نجمہ شگو اور عامی کی بے تکلفی دیکھتے ہوئے نند کے حق میں تھیں۔ اب کون سا زمانہ تھا۔ جو بچوں کے رجحان کے خلاف قدم اٹھایا جاتا۔ نجمہ ہمیشہ ایسی باتیں ماں کی نظروں میں لا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ بچہ وہ بھی تو نہ تھیں۔ ہاں ایک نمو بھابی تھیں۔ جو کبھی ماں بیٹی کی باتوں میں شریک ہوتیں تو بے دھڑک کہتیں۔ ”عامی کی ان باتوں پر نہ جائیے گا، لڑکیوں سے فری ہونا تو اس کا شغل ہے، اچھا ہے جو آپ اسی سے پوچھ لیں۔ فیصلہ اس پر تھوپنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیں۔“ نمو بھابی کی باتیں ہمیشہ معقول ہوتی تھیں امی اور نجمہ بھی اس حقیقت کو مان گئیں۔

عامی چھ ہفتے کی سکیم پر جا رہا تھا۔ نجمہ نے بہتر جانا کہ رشتے کے اہم مسئلے پر جانے سے پہلے ہی گفتگو ہو جائے۔ وہ اپنے کمرے میں سامان وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ کہ نجمہ وہاں جا پہنچی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مطلب کی طرف آئی۔

”عامی ایک بات پوچھنا ہے تم سے۔“

”پوچھیے“

”شادی کے متعلق کیا خیال ہے۔“

وہ ہینگر ہاتھ میں پکڑے پکڑے ایک لمحہ کو ٹھنکا۔ پھر خوش دلی سے بولا۔ ”نیک“ اور شگو کے متعلق۔“

”کیا مطلب۔“ وہ ہینگر پھینک کر بہن کے سامنے آ کھڑا ہوا، نجمہ نے حیرانگی سے

اسے دیکھا۔ اور جلدی سے بولی۔ ”شگو تمہیں پسند ہے نا۔“

”لیکن شادی اور شگو کا کیا میل۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کیا تم شادی کے متعلق سیریس نہیں۔“

”تو پھر شکو کے لئے بات۔“

”یعنی.....“ وہ زور سے چیخا، نجمہ ششدر سی اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ ایک دم کمر موڑ کر بولا۔ ”شادی نہ ہوئی مذاق ہو گیا۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں شکو کو اس حد تک پسند کرنے لگا ہوں کہ.....“

نجمہ غصے میں آ گئی۔ ”اس سے جو بے تکلفی بڑھائی تھی اس کا کیا مطلب؟“

وہ مڑ کر نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب، اس کا مطلب! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“

نجمہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ غصے میں خوب خوب سنائیں۔ اپنے اور شکو کے رشتے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ وہ بولتی رہی۔ اسے عامی کی باتوں سے دھچکا جو لگا تھا۔ لیکن عامی تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ کچھ سوچ رہا تھا کچھ جھگ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن سوائے مٹھیاں بند کرتے۔ کھولتے ہوئے ٹہلنے کے اور کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

”جو کچھ کرنا ہے دو ٹوک فیصلہ کرو۔ تم نے میرے لئے اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔“ نجمہ الجھن اور بے دلی سے کہتی کمرے سے نکل گئی۔

”دو ٹوک فیصلہ۔“ عامی نے زیر لب کہا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو جھکا بیقراری سے کمرے میں ادھر ادھر گیا۔ وردیاں ادھر سے اٹھا کر ادھر پٹنیں سامان منتشر کر دیا۔ پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو برق کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے لمحے وہ عامی کے کمرے میں تھا۔

کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کے ساتھ لگی وہ باہر خلاؤں میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔

”عامی“ نے جھنجلاہٹ الجھن اور تذبذب سے بھری آواز میں پکارا۔ عامی نے پلٹ کر دیکھا۔ عامی کے چہرے سے پریشانی اور جھلاہٹ مترشح تھی۔ ذہنی کوفت کے پر تو بھی لہراتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ حیران نظروں سے اس کی طرف

دیکھنے لگی۔

”ساری مصیبت تم نے ڈال رکھی ہے۔“ وہ اس کے قریب یوں آیا جیسے کھا ہی جائے گا اسے۔

”جی،“ عامی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

”جانتی ہو کتنا بڑا اور سنگین مرحلہ درپیش ہے۔“ وہ اس کے عین سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”جی۔“ وہ ہراسانی سے اسے آنکھیں پھاڑے پھاڑے دیکھنے لگی۔

اور جب مختصر سی تمہید کے بعد جلتے جلتے لفظوں سے عامی نے کہا۔ ”شکو کو میرے پلے باندھنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔“

تو وہ تلخی سے مسکرائی۔ رخ موڑتے ہوئے بڑے سفاک طنز سے بولی۔ ”مبارک ہو۔“

”عامی“ وہ اتنے زور سے پاؤں پیٹتے ہوئے چیخا کہ عامی کو مڑ کر دیکھنا پڑا۔ گھبرا کر بولی۔

”شکو آپ کو پسند بھی تو ہے۔ اور کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”جو چاہتا ہوں، تم اچھی طرح جانتی ہو۔“ وہ بے دھڑک بولا۔

”جی.....؟“ عامی نے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔

”تم۔ تم پتھر ہو پتھر۔“ عامی نے سختی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”میں نے اس پتھر کو توڑنے پھوڑنے کے لئے شکو کو استعمال کیا، لیکن۔ تم..... تم کیا ہو عامی۔ کچھ اثر ہی نہ ہوا..... مجھے صرف اتنا بتا دو..... کہ مجھ سے کتراتی کیوں ہو۔

فرار کی کوشش کیوں کرتی ہو..... کیا اتنی نفرت.....“

لیکن وہ جملہ پو۔ نہ کر سکا۔ عامی نے جلدی سے اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔

”عامی۔“ عامی فرط مسرت سے چیخ اٹھا..... دوسرے لمحے عامی اس کے مضبوط

بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اور وہ بے یقینی کے عالم میں کہے جا رہا تھا۔ ”کیا واقعی، کیا واقعی..... تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔“

اور خوشیوں کی یلغار سے بے سدھ ہوتی۔ عاشی سر کو دھیرے دھیرے نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی..... ”عامی..... تم نے مجھے بہت دکھ دیئے..... بہت ستایا..... بہت رلایا..... تم آئے تھے تو مجھے لگا تھا..... جیسے..... جیسے دیرانے میں بہار آ گئی ہو..... لیکن؟“

”لیکن ویکن کچھ نہیں، دیرانے میں بہار تو اب آئی ہے.....“ وہ بازوؤں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے مسکرایا۔
عاشی کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

دھڑکا

رات کچھ ایسی گرم تو نہ تھی۔ ہوا تو شام ہی کو چلنا شروع ہو گئی تھی اور اب تو مشرقی سمت سے کالے کالے بادل بھی امنڈنے لگے تھے۔ ہواؤں میں نمی اور بوجھل پن آ گیا تھا۔ جس کا دم ٹوٹ گیا تھا اور جولائی کے تپتے میا لے آسمان پر ماند ماند چمکتے ستاروں کی رنگت نکھر آئی تھی۔ فضا میں گھلا ہوا گرد و غبار چھٹ چکا تھا اور خوشگوار کی احساس غالب آ رہا تھا۔ درود یوار کے تپتے سینے ہواؤں کے نرم آلودہ لہس سے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کئی دنوں کی جھلسا دینے والی تپش کے بعد موسم کی ایک ایسی تبدیلی خوشگوار تھی۔ کائنات مدہوش سی ہو گئی تھی اور نیند کی دیوی بڑی فراخ دلی سے دامن پھیلائے سکوت کا پہرہ دے رہی تھی۔ چھت پر چار پائیاں بچھی تھیں ایک طرف برقی پنکھا چل رہا تھا۔ رابعہ، سکو، جی اور افضل سبھی سو رہے تھے۔ ایک وہ تھی جس کی آنکھوں میں مسلسل جاگنے سے جلن ہونے لگی تھی۔ اور جسے موسم کے خوشگوار ہو جانے پر بھی جس کا احساس ہو رہا تھا۔ اور جلا دینے والی گرمی جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کتنی دیر سے چار پائی پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے دائیں طرف نواڑی پلنگ پر اس کا شوہر افضل گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے لیے لے لے گہرے سانس کبھی خراٹے بن رہے تھے۔ اس کے ساتھ والی چار پائی پر رابعہ، اس کی جواں سال بیٹی ہوئی ہوئی تھی۔ بیس اکیس سالہ رابعہ بے خبر سو رہی تھی، سپید چادر سے اس نے اپنا جسم ڈھانپ

رکھا تھا۔ بے خبری کے باوجود ایک احتیاط تھی جو رابعہ کے وجود سے لپٹی محسوس ہو رہی تھی اس کے ساتھ والی چار پائی پر اس کے دونوں چھوٹے بیٹے بڑی بے ترتیبی سے پڑے سو رہے تھے، لیکن اس کی نظریں بار بار رابعہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

وہ جب بھی رابعہ کی طرف دیکھتی اس کے ذہن میں ہلچل اور بڑھ جاتی۔ جس گھٹن اوچھلنا دینے والی گرمی کا احساس شدید ہو جاتا۔ اس نے کئی دفعہ اٹھ کر پانی پیا تھا۔ گھوں گھوں کرتے پینچے کا رخ اپنی طرف ساکت کر لیا تھا۔ نیلی دری سیٹ کر ایک طرف کر دی تھی۔ اور بان کی کھری چار پائی پر لیٹ کر تپتے احساس کو ٹھنڈک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جوں جوں سوچ کے زاویے پھیل رہے تھے اس کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک خوف سا کھا رہی تھی۔ گھبراہٹ سے سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سر کو جھٹک کر سوچوں سے نجات پانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

بے دم ہو کر اس نے اپنے سر کو تکیے پر گرادیا..... بازو آنکھوں پر رکھ کر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ لیکن یوں آنکھیں میچ لینا بھی قیامت ہی تھا۔ شام اس کی آنکھوں میں پھر بڑی وضاحت سے ڈھل آئی۔ رابعہ کے پیازی کپڑے اور ان سے اٹھتی ہلکی ہلکی مہک نظروں میں اتر آئی۔ گھبرا کر اس نے بازو ہٹایا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ کروٹ بدل لی اور پوری آنکھیں کھول کر بیٹی کا چہرہ دھندلی سی چاندنی میں دیکھنے لگی۔ بات بظاہر معمولی سی تھی۔ آج شام رابعہ نہادھو کر غسل خانے سے باہر نکلی تو اس نے ہلکے پیازی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تولیہ پشت پر پھیلا تھا اور سیاہ گیلے بالوں کے سروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

”امی میں اوپر جا رہی ہوں۔ یہاں صحن میں تو بڑا احس ہے۔“ رابعہ نے تولیے کو کندھوں پر ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے دبی دبی سی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ اور وہ سبزی بناتے بناتے جانے کیوں چونک گئی تھی۔ ایک دم پلٹ کر رابعہ کی طرف دیکھا تھا اور لمحے یوں گڈمڈ ہو گئے تھے کہ اسے لگا تھا۔ رابعہ نہیں وہ خود کھڑی ہے۔

وہ خود..... آج سے تیس سال پہلے والی، وہ خود..... کچھ ایسی ہی تپتی ہوئی شام

تھی۔ نہادھو کر اس نے ہلکے پیازی رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ بالوں کے بھیکے سروں پر پانی کے قطرے اٹکے ہوئے تھے۔ اور تولیہ کندھوں پر ٹھیک سے جماتے ہوئے اس نے ماں سے کچھ ایسے ہی الفاظ کہے تھے۔ ماں کا جواب سنے بغیر وہ اوپر چلی گئی تھی..... اوپر..... چھت پر..... جہاں ملحقہ مکان کی چھت پر کتا میں ڈھیر کئے سہیل بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں جوان دھڑکنیں سہیل کو دیکھ کر تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ بھی تپتی دوپہر میں اوپر آ کر اس کے چھت پر آنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔

سہیل؟ سہیل؟..... نفرت، کراہت اور پچھتاوے اس کے ذہن میں کلبلا اٹھے۔ اس کا دم پھولنے لگا۔ ماضی..... تلخ ماضی، جسے وہ عرصہ ہوا بھلا چکی تھی۔ جس کی اذیتوں کو انصاف کی سادہ لوحی اور لاعلمی نے پورا تحفظ دے دیا تھا۔ آج اچانک اور بالکل اچانک حال کے سینے سے جھپٹ پڑا تھا۔ رابعہ پہلے بھی نہایا کرتی تھی۔ پیازی کپڑے بھی نئے نہ تھے۔ اس کا چھت پر جانا کبھی ڈس نہیں پایا تھا۔ لیکن آج..... آج..... تیس سال کے وہ نازک اور کمزور لمحے اچانک لوٹ آئے تھے۔ انجان پنے میں سرزد ہو جانے والی بڑی بڑی غلطیاں نگاہوں میں گھوم گئی تھیں۔

یہ گھر بھی تو تقریباً دوسرا ہی گھر تھا۔ تنگ گلی میں ساتھ ساتھ جڑے مکان جن کی چستیں چھوٹی چھوٹی دیواروں سے الگ ہوتی تھیں۔ دیوار پھلانگنا اتنا سہل تھا۔ اور ساتھ والے گھر میں محمود بھی تو رہتا تھا۔ جوان، خوبصورت اور جوشیلہ۔ محمود۔ رابعہ بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور ساتھ والے گھر سے محمود کی آواز آ رہی تھی جانے اماں سے کس بات پر وہ بحث رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے محمود کے وجود کا احساس اتنے تلخ انداز میں ہوا۔

وہ پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی۔ لیکن نہیں..... وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ رابعہ کو وہ زندگی کے اس گھناؤنے پن سے دوچار نہیں ہونے دے گی۔ وہ یہاں تک سوچ بیٹھی کہ اگر رابعہ نے کوئی مزاحمت کی تو وہ اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دے گی۔

بادل بڑی تیزی سے بڑھ رہے تھے، پھیل رہے تھے، امنڈ رہے تھے، بجلیاں تڑپنے لگی تھیں۔ اور ہواؤں کا زور بڑھ گیا تھا۔ رابعہ نے کروٹ بدلی اور رخ دوسری طرف کر کے سو گئی۔ بچوں نے نیند ہی میں چادر ڈھونڈنے کو ہاتھ پاؤں مارے۔

اس نے بڑی بے چارگی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ رات بھی تو کچھ ایسی ہی تھی۔ جس نے دم توڑ دیا تھا..... اور ہواؤں میں نم آلود بوجھل پن آ گیا تھا۔ حدت کی ساری شدت ختم ہو گئی تھی۔ ایسے میں چار پائیاں بچھی تھیں۔ اور وہ اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اور پھر مشرقی سمت سے امنڈنے والے بادل تیزی سے بڑھ آئے۔ ہوائیں آندھی کا روپ دھار رہی تھیں۔ بجلیاں تیزی سے تڑپنے لگی تھیں۔ بوندوں کے پہلے ریلے پر ہی چھت پر بھگدڑی مچ گئی تھی۔ اس کے بھائی بستر سمیت نیچے اتر گئے تھے ماں باپ نے لکڑیوں والی کوٹھڑی میں چار پائیاں کھینچ لی تھیں۔ اور اس نے اپنا بستر ڈیوڑھی کی چھت والے کمرے میں ڈال لیا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح علم تھا کہ اس کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی سہیل کے چھت والے کمرے کی کھڑکی سے اتنی قریب ہے کہ ذرا سی احتیاط برتی جائے تو آسانی سے فاصلوں کی تمیز مٹ سکتی ہے۔ پھر واقعی اس رات جب بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ اور ہواؤں کا انداز مجنونانہ ہو گیا تھا۔ فاصلوں کی تمیز مٹ گئی تھی سہیل اندر آ گیا تھا..... کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اور پھر جانے بادل کتنا گرجے تھے، بجلیاں کتنی تڑپ سے تڑپی تھیں۔ اور ہواؤں نے کس کس رخ اپنا سر بٹھا تھا۔ اسے تو ہوش اس وقت آیا۔ جب وہ سہیل کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔ اور وہ بڑے بڑے حسین وعدوں کے سہارے اسے بہلا رہا تھا۔

اسے کپکپی سی محسوس ہوئی۔ گھبرا کر اس نے افضل کی طرف دیکھا اپنا مجرم ضمیر کانپ کانپ اٹھا۔ جانے وہ جذباتی پن میں کیا حرکت کر بیٹھی..... کہ اچانک بادل زور سے گرجا..... اور بوندوں کا پہلا ریلہ سونے والوں کو بیدار کر گیا۔ گلو، جمی نے جلدی جلدی بستر سمیٹا اور سیڑھیوں کی بتی جلا کر نیچے اتر گئے رابعہ بھی اٹھ بیٹھی..... ابو کا پلنگ ایک

طرف سے پکڑ کر اس نے برآمدے میں بچھو ادیا..... امی کی چار پائی بھی ان کے ساتھ لگوا دی۔ پھر اپنی چار پائی اٹھا کر ایک طرف کھڑی کرتے ہوئے۔ درمی میں لپٹا تکیہ اور چادر لئے کمرے کی طرف بڑھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ اسے اندر جاتے دیکھ کر پھٹ پڑی۔

رابعہ نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھولتے ہوئے بند کرتے بولی۔ ”اندر“

ماں کا کوئی جواب سننے سے پہلے ہی وہ اندر آئی..... بتی جلائی، کمرے کے عین درمیان پڑے پلنگ پر بستر ڈالا، باہر کی کھڑکیاں کھولیں اور پھر بتی بجھا کر پنکھا کھول دیا..... بستر پر پڑتے ہی رابعہ سو گئی۔

لیکن

وہ آنکھیں بند نہ کر سکی۔ وہی بھیا تک رات پھر لوٹ آئی تھی۔ ساتھ والے گھر کا کمرہ بھی تو اس کمرے سے ملحقہ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کمرے میں کون سو رہا ہے..... اسے تو صرف یہ احساس تھا کہ دونوں کمروں کی کھڑکیاں اتنی قریب ہیں کہ فاصلے ایک جست میں پھلانگے جاسکتے ہیں۔ اف، اس کا دماغ چکرانے لگا۔ سوچ نے اس کے ذہن میں جوار بھائے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ وہی رات..... وہی بھیا تک رات لوٹ آئی ہے..... وہ لمحے پھنکاراٹھے تھے ساتھ والے گھر میں پھر سہیل آ گیا تھا..... سہیل جو کھڑکیوں کا فاصلہ ایسے سے آسانی سے پھلانگ سکتا تھا۔

موسم لمحہ بہ لمحہ خونخوار سا ہوا جا رہا تھا۔ بادل کڑک رہے تھے۔ بجلیاں لہریں لے رہی تھیں۔ اور ہواؤں کے انداز میں جنون تھا..... اور ایسے ہی میں جب رابعہ والے کمرے کے دروازے کے پٹ زور سے بند ہوئے اور ساتھ ساتھ کسی کے کودنے کی دھم سے آواز ہوئی، تو وہ بے بس ہو کر چیخ اٹھی۔

”رابعہ“

دوسرے لمحے وہ چکراتا سا تھامے بند دروازے سے زور سے ٹکرائی۔ دروازہ کھل

گیا اور وہ فرش پر اوندھے منہ گر گئی۔ رابعہ کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔ ہڑبڑا کر افضل بھی اٹھ آیا..... بتی جلائی..... تو وہ فرش پر سر تھامے لیٹی تھی۔ غیر متوازن سانس لیتے ہوئے۔ ”وہ..... وہ..... وہ“ کہہ رہی تھی۔

”امی کیا ہوا؟“ رابعہ سہم گئی تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ افضل نے اسے کمال پیار سے تھام کر بٹھایا۔ اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ کمرے میں باپ بیٹی کے سوا کوئی نہ تھا۔

”اندرون کو داتا تھا.....“ وہ کانپتے ہوئے بولی۔

اور عین اسی لمحے رابعہ کے پلنگ کے نیچے سے موٹی سی بلی کرسی پر کودی اور پھر کھڑکی میں جا کر برابر والے مکان میں چلی گئی۔ کچھ ایسی ہی دھم کی آواز تو اس نے سنی تھی۔ لیکن وہ کہے گئی۔

”کون تھا؟ کون تھا؟“

”بلی.....“ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اس کا تمسخر اڑایا۔ ”پریشان کر دیا، سبھی ہوگی کوئی چور ہے..... چلو آؤ چل کر ایسی طوفانی رات میں کوئی تمہاری پونجی لوٹنے نہیں آئے گا۔“

وہ باہر چلا گیا۔ رابعہ نے ماں کا ہاتھ تھام کر اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے سانس ابھی تک غیر متوازن تھے۔ رابعہ نے پیار سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کا سر تکیے پر ٹھیک سے رکھتے ہوئے بولی۔

”ڈر گئیں میری امی..... کم بخت باہر طوفان بھی تو ایسا ہے نا.....“

”میرے پاس لیٹ جاؤ رابعہ..... میرے پاس“ اس کے حواس اب تک بجا نہیں تھے۔

رابعہ نے بتی بجھائی ماں کے قریب پلنگ پر لیٹ گئی۔ ماں نے جوش جنوں میں اسے چٹالیا۔

”امی۔“ رابعہ کا دم اس کے بچنے بازوؤں میں گھٹنے لگا۔

”شکر ہے شکر ہے، وہ بلی تھی۔ لیکن وہ وہ محمود.....“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی.....

”امی آپ کو کیا ہو رہا ہے۔ محمود کون..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ رابعہ نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے پھر بتی جلا دی۔ ماں کی حالت بنا گفتہ بہ تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے امی۔“ اس نے ماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر رو ہانسی آواز میں پوچھا۔

”بڑا بھیا تک خواب.....“ وہ گہری آہ بھرتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اب وہ قدرے

حواس میں تھی..... حیران حیران آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے پھر نگاہیں رابعہ پر مرکوز کر دیں.....

”یہ کھڑکی بند کر دو.....“ اس نے رابعہ کو حکم دیا۔ رابعہ نے خاموشی سے کھڑکی بند کر دی۔ اور ماں کے قریب آ بیٹھی۔

”یہ کھڑکی اب کبھی نہ کھولنا۔“ اس نے ڈری ڈری سہمی سہمی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھا۔“ رابعہ جھلا سی گئی۔ پھر ماں کو آہستگی سے پلنگ پر لٹا دیا۔ ”آپ سو جائیں امی۔“

باہر بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہوائیں بھی اب حوصلہ ہار رہی تھیں۔ بادل مغرب کی طرف جھکے جا رہے تھے۔ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ پھلوار خوشگوار تھی۔ ہواؤں کے دوش پر بوندوں کا ترنم بکھر رہا تھا۔

تیرہ و تار رات کا وہ گھناؤنا لمحہ گزر گیا تھا۔ جس سے وہ شام ہی سے ڈر رہی تھی۔ اب وہ مطمئن تھی پرسکون تھی؛ بشاش تھی۔

اور جب رابعہ نے کئی بار اس کی حالت کے بارے میں اصرار سے پوچھا تو وہ اپنے ذہن میں کلبلاتی شام اور اس سے وابستہ آج سے تیس سال پہلے کا واقعہ بیٹی کے کوش گزار کرنے پر مجبور سی ہو گئی۔ یہ واقعہ بیٹی کی آنکھیں کھلی رکھ سکتا تھا۔ اس سے سبق

لے کر وہ کسی لغزش سے دوچار نہیں ہو سکتی تھی.....

وہ کبھی سنجیدہ اور کبھی رنجیدہ ہو کر ساری باتیں اسے بتانے لگی۔ اس رات کا واقعہ دانستہ حذف کر کے ساری باتیں بیٹی کے گوش گزار کر دیں۔

”بس“ رابعہ شوخ نظروں سے ماں کو دیکھ کر مسکرائی۔ ”اتنی سی بات کے لئے آپ اتنی پریشان تھیں، حد ہو گئی۔“

”اتنی سی بات نہ کہو رابعہ، بہت بڑی بات تھی۔“ وہ بولی۔

”ہاں تھی تو بڑی، لیکن آپ کا تصور بھی کیا۔ ان دنوں والدین اولاد پر جو بے جا پابندیاں لگایا کرتے تھے نا امی..... یہ چوری چوری ملنا اور چھپ چھپ کر دیکھنا اسی کا نتیجہ تھا۔ شکر ہے زمانہ بدل گیا۔ آج کل تو ایسی پابندیاں نہیں ہوتیں نا۔ اندھیروں میں دیواریں پھلانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔“

اس نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ بیٹی کی بولتی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ رابعہ نے مسکراتے ہوئے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ بولتی آنکھیں تھوڑا سا حذف کر کے سب کچھ کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

پرکھ

مائی کی گرہ باندھتے باندھتے اس کے ہاتھ رک گئے اور اس نے مسز وسم کے ہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گلے میں لٹکتی مائی کا پھندہ لئے وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے سر پا پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ براؤن سوٹ میں وہ خاصا اسارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے اپنے آپ کو دیکھا وہ یقیناً اتنا خوبصورت نہیں تھا۔ کہ دیکھنے والے حواس کھو بیٹھیں۔ اور انگلیاں زخمی کر لیں۔ لیکن ہو یہی رہا تھا۔ کہ جس محفل میں وہ جاتا، جس پارٹی میں شریک ہوتا، حواس کھو دینے والی ہی بات ہوتی۔ لوگ اس سے اس حد تک متاثر ہوتے کہ اسے کوفت سی ہونی لگتی۔ جوان جوان بیٹیوں کی مائیں تو اس پر نچھاور ہو ہو جاتیں..... اونچے اونچے گھرانوں کی لڑکیاں اس کے قریب آنے کی کوشش میں ارزاں ہوئی جاتیں۔

مسز وسم نے آج اسے چائے پر بلایا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ تین جوان بیٹیوں کی ماں کے التفات کا بھی وہی مقصد ہے جو حمیرہ کا تھا۔ حمیرہ کے ہاں وہ اپنے عزیز دوست الطاف کو بھی لے گیا تھا۔ الطاف جو مردانہ حسن و جاہت کا مرقع تھا۔ جس کا اخلاق و کردار بے داغ تھا۔ لیکن اس کے سامنے الطاف کو کسی نے اہمیت ہی نہ دی تھی۔ حمیرہ اس کے آگے بھیجی جاتی تھی کیوں؟ کس لئے؟

کیا امریکہ میں سات سال گزار آنے کی چھاپ اتنی دلکش تھی؟ تایا اور نانا کی

چھوڑی ہوئی معقول دولت کا اتنا سحر تھا؟ محل نما کوٹھی اتنی پرکشش تھی.....؟

وہ جب امریکہ سے آیا تھا۔ اور نانا ابا کی اراضی اور تایا کی بڑی سی محل نما کوٹھی اس کے نام منتقل ہو گئی تھی۔ وہ جیسے کچھ سے کچھ بن گیا تھا۔ اعجاز سے جازی بن جانا تو خیر بڑی بات نہ تھی۔ لیکن اس لفظ کی ادائیگی سے چہروں کی بناوٹیں جس جس زاویے سے بدلنے لگتیں۔ وہ بہت بڑی بات ضرور تھی۔ اکثر تو اسے ہنسی آ جاتی۔ لیکن بسا اوقات وہ چڑ بھی جاتا۔ سعدیہ نے اس سے پیار کی بیٹنگیں بڑھائی تھیں۔ نوشینہ مری جاتی تھی۔ فرحانہ کا انداز بھی ہمہ سپردگی کا ہوتا۔ مسز وسیم، حمیرہ رانا اور مسز اسلم کے التفات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سب لوگ اسے سنہری چھاپ اور دولت کے طلسم سے محبوب گردان رہے ہیں۔ اسے اسی بات سے تو چڑ لگتی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو اس خول کے اندر مقید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنا آپ بھی تو تھا۔ اس اپنے آپ سے کوئی متاثر ہوتا تو بات بھی تھی۔

”ابھی تیار نہیں ہوئے۔“ الطاف کمرے میں آتا ہوا بولا۔

”اوہ تم آگئے، بس ایک منٹ“ میں تیار ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی ٹائی کی گرہ باندھی۔ اور بالوں میں برش کر کے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔

”بس بس۔ اتنا ہی کافی ہے۔“ الطاف مسکرایا۔ ”بے سنورے بغیر ہی لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں تمہیں تو..... یہ.....“

”یہی تو مجھے پسند نہیں۔“ وہ اس کی طرف مڑا۔ اور پھر الطاف کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”مسز وسیم کے ہاں میں نہیں جا رہا، چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”وہاں کیوں نہیں جا رہے؟“

”تمہیں معلوم ہے۔“

”نرمی بات ہے اعجاز، اور پھر میں تو کہوں گا۔ لوگ مڑے نہیں، کسی ایک کا انتخاب کر لینا سودا گھانے کا نہیں۔“

”میں سودے بازی ہی کا تو قائل نہیں، انتخاب کا قرعہ تو اسی کے نام نکلے گا۔ جو مجھے میری وجہ سے پسند کرے گا۔“

”تمہیں تمہاری وجہ سے پسند کرے گا۔“ الطاف نے زیر لب دھرایا۔

”ہاں۔“ وہ مستحکم آواز میں بولا۔ ”میں بھی تو کچھ ہوں آخر..... یہ اراضی..... یہ جہازی سائز کوٹھی، یہ شان شوکت مجھ سے الگ کر کے دیکھو، جو کچھ باقی بچتا ہے وہ میں ہوں۔ اور اس سے مجھے بڑا پیار ہے۔ اس کی عزت کرنے والا ہی میری نگاہوں میں عظیم ہے الطاف..... سمجھے۔“

الطاف مسکرانے لگا، لیکن اعجاز سنجیدہ ہو گیا۔ دونوں اسی بارے میں گفتگو کرتے کمرے سے نکلے اور برآمدے میں آئے..... اور پھر پورچ میں کھڑی گاڑی میں جا بیٹھے۔

وہ تو مسز وسیم کے ہاں جانے پر رضا مند نہیں تھا۔ الطاف ہی سمجھا بچھا کر لے گیا۔ وعدہ خلافی بھی تو اچھی بات نہیں..... ماں بیٹیوں کی حرکات کو فٹ دینے ہی کا موجب بنیں۔ وہاں صرف سنہری پس منظر والا جازی ہی تھا۔ اعجاز کہیں دور دور بھی نہ تھا۔ آؤ بھگت بھی اسی کی ہو رہی تھی اور نگاہوں کے تیر بھی اسی پر برسائے جا رہے تھے۔

اس دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ کسی ایسی محفل میں شریک نہیں ہوگا۔ جس میں اپنے آپ سے کٹ جائے۔

”کئی دن وہ ان ممی قسم کی عورتوں سے نہیں ملا۔ بے مہار لڑکیوں کو منہ نہیں لگایا۔ کلب، ہوٹل اور اونچے لوگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ ان دنوں الطاف کی پر خلوص محبت اور اس کے مفید مشورے سننے کی اسے خوب مشق ہوتی رہی الطاف کا مخلصانہ مشورہ یہی تھا کہ وہ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر ڈالے۔

کسی اچھی سی لڑکی کا انتخاب ہی تو سب سے بڑا مرحلہ تھا۔ اچھی لڑکیوں کی کمی بے شک نہیں تھی۔ لیکن جو معیار اس کے ذہن میں تھا، کوئی اس پر پوری اترتی تو بات بھی تھی۔

آئیڈیل

”کسی شریف غریب گھرانے میں شادی کرلو.....“ ایک دن الطاف نے اس کی دلیلوں سے عاجز آ کر کہا۔ ”یوں معیار کے چکر میں نہ پڑو یہ خط کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دور مادہ پرستی کا ہے۔ اونچی لڑکیوں کی اڑان بھی اونچی ہوگی۔ غریب شریف لڑکی اچھی رہے گی۔“

”وہ بھی نہیں.....“

”کیوں؟“

”وہ لڑکی خواہ مخواہ مجھ سے مرعوب ہوتی رہے گی۔ جس سے ذہنی تضاد پیدا ہوگا۔ اس شادی کا فائدہ ہی کیا..... جس میں فریقین کو ایک دوسرے کی صحیح ذہنی رفاقت ہی میسر نہ آئے۔“

”یوں کہو کہ تم اپنے طبقے سے کٹ بھی نہیں سکتے۔“

”کتنا بھی نہیں چاہیے۔“

”تو پھر چاروں طرف جو ڈھیروں لڑکیاں منڈلاتی پھرتی ہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو۔ نوشینہ، ناز، رخسانہ اور جانے کتنی اور ہیں میرے خیال میں نوشینہ اور سعدی سے تم کچھ کچھ متاثر بھی ہو۔“

”ہاں، کسی حد تک..... لیکن لگتا ہے وہ بھی میری، ”میں“ کو اہمیت نہیں دیتیں۔“

”مفروضوں کے چکر میں نہ پڑو۔ اچھی اچھی لڑکیوں کو اندازوں اور قیافوں کی بھینٹ چڑھانا عقل مند ہی نہیں۔ کسی کو آزما تو دیکھو۔“

”سچ کہتے ہو کیوں نہ انہیں پرکھا جائے..... انتخاب یوں سہل ہو جائے گا۔“

اور پھر دونوں دوست سر جوڑ کر پرکھنے کے طریق سوچنے لگے۔ نوشینہ، ناز، سعدی اور سائرہ ایسی لڑکیاں تھیں..... جنہیں معیار کی کوئی پر پرکھنے کے لئے منتخب کیا جاسکتا تھا۔ موہنی موہنی صورتوں والی یہ لڑکیاں اچھے اچھے خاندانوں سے تعلق بھی رکھتی تھیں۔ پڑھی لکھی بھی تھیں۔ روشن ذہن اور وسیع دل و دماغ کی مالک تھیں۔ نوشینہ اسے کلب میں ملتی تھی۔ ناز سے ملاقات ہوائی جہاز میں ہوئی تھی۔ سعدی کو اس نے مسز وسیم کے گھر

آئیڈیل

دیکھا تھا..... اور سائرہ کبھی کبھی شیزان میں ملنے کے بعد اب باقاعدہ امیدوار بن چکی تھی۔ ان سب کو آزمانے کا اس نے پروگرام طے کر لیا۔

دوسرے دن نوشینہ سے ملا۔ وہ شام بڑی حسین تھی۔ کلب میں زندگی جگمگا رہی تھی۔ مس لطاشہ کے قص کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے نوشینہ بڑی جذباتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بار بار اس کے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔ نم آلود ہتھیلیوں کا دباؤ وہ محسوس کر رہا تھا..... پھر..... اس نے نوشینہ کو بالکل غیر متوقع طور پر بتایا کہ وہ شادی کے متعلق ان دنوں سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔

”اوہ.....“ نوشین جذبات سے ہکتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے جازی۔ میں..... میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم مجھے اپنا لو گے نا۔“

”شادی ایک مقدس عہد ہوتا ہے نوشینہ، یہ کھیل نہیں، عمر بھر کے بندھن کا نام ہے۔ بہتر ہے پہلے تم میرے متعلق پوری طرح اطمینان کرلو، میرا گھر بار دیکھ لو..... میرے حالات پر کھلو..... میری حیثیت، میرا مقام ہے.....“

”اوہ، جازی، نہیں، ان سب تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔ رہی تمہاری حیثیت، تو وہ..... وہ..... اتنی بڑی مرسڈیز کوئی ایسے ہی تو نہیں رکھ سکتا۔“ نوشینہ نے بڑی کافر ادائی سے مسکراتے ہوئے اس کے بازو کو تھام لیا..... کتنا پیارا آ گیا تھا اسے جازی پر۔ وہ ہنکے ہنکے انداز میں باتیں کرتی رہی۔ کتنے حسین حسین خواب اس کی آنکھوں میں اتر رہے تھے۔

وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔ اور فرط جذبات سے مغلوب ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتی نوشینہ اس کے دل سے اتر گئی، لیکن وہ خوشگوار موڈ بنائے اس سے باتیں کرتا رہا۔ دوسری شام اس نے سعدی کے ساتھ گزاری۔ ہوٹل میں چائے پیتے وہ مستقبل کے سہانے تصور سے مغلوب ہو ہو گئی۔

”تمہاری کٹھی تو بڑی شاندار ہوگی۔ بنک بیلنس کتنا ہے۔ ہنی مون کے لئے

پھر اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔
اور اعجاز فرط مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔ انتخاب کا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ اسے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔
قرعہ انتخاب ناز ہی کے نام نکلا۔

اور

جب الطاف کے استفسار کے جواب میں اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ کہ میں نے ناز کے حق میں فیصلہ کیا ہے، تو الطاف فرط حیرت سے ٹکرائے اس کا منہ دیکھنے لگا۔
”ناز.....؟“ وہ صرف یہی کہہ سکا۔

”ہاں الطاف..... میرے معیار پر وہی پوری اتری ہے۔ اس نے مجھے میرے پس منظر کی جگہ گھٹ دیکھ کر پسند نہیں کیا۔ اس نے میری ”میں“ کو چاہا ہے۔ ان سب چیزوں سے ہٹ کر مجھے دیکھا ہے۔“
”تم اتنے یقین سے یہ باتیں کیونکر کہہ رہے ہو۔“ الطاف نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

اس نے ناز سے کی ہوئی ساری باتیں الطاف کو کہہ سنائیں۔
الطاف یقین اور بے یقینی کے عالم میں اس کا منہ ٹکٹنے لگا۔ ناز جیسی لڑکی اتنی مخلص اور دولت کی بجائے انسان کو پیار کرنے والی ہو۔ اچنبھے کی بات تھی۔

”وہ بڑی پر خلوص اور سادہ لڑکی ہے الطاف“ میں نے بارہا اسے اپنی مالی حیثیت بتانے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن اس نے سننے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی شادی کی بنیاد خلوص ہونی چاہیے۔ مانتے ہونا کہ اس دور میں بھی ایسی لڑکیاں مل جاتی ہیں۔“ اعجاز نے وفور مسرت سے جھومتے ہوئے کہا۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔“ الطاف کے انداز میں بے یقینی تھی۔“ ناز کے متعلق تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انتہائی مادہ پرست۔“
”یہی تو سمجھ کا پھیر ہے۔“ الطاف نے قہقہہ لگایا۔ ”نوشینہ کو تم مخلص سمجھتے ہو۔“

سوئٹرز لینڈ تو جاؤ گے ہی۔“ صوفے میں دھنسی ہوئی بیٹھی سعدی کی پرواز بلند سے بلند ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کے چہرے سے تاثرات چُختا رہا۔ ایک بار بھی تو سعدی نے اسے بہ حیثیت اس کے نہیں سراہا تھا۔

اگلی ملاقات ساڑھ سے تھی۔ وہ اس کے گھر چائے پر مدعو تھی۔ عالی شان کوٹھی جدید ترین فرنیچر زمانے بھر کی نایاب چیزیں۔ وہ تو اپنے آپ پر نازاں ہو گئی۔

”کیا میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ یہ سب کچھ میرا ہو جائے گا۔“ اس نے نگاہیں گھماتے ہوئے بے صبری سے کہا۔

وہ مجھ سا گیا کیا الطاف سچ کہتا ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں میری پسند کا معیار ایک خط کے سوا کچھ نہیں..... وہ سوچوں میں کھو گیا۔

اگلے روز اس نے ناز کو مدعو کیا۔ ناز جس کے متعلق الطاف کی رائے تھی کہ ”وہ بہت ہوشیار بڑی گھاگ لڑکی ہے اور جو اس کی نظروں میں سب سے زیادہ مادہ پرست اور وقت کے دھارے میں بہہ جانے والی لڑکی تھی۔“

لیکن

نازی نہیں آئی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ اور جب شام کے سائے لمبے ہو کر دم توڑنے لگے۔ تو اس نے ناز کو فون کیا۔ نہ آنے کا گلہ بھی..... لیکن ناز کا جواب اتنا معقول تھا کہ وہ قائل ہو گیا۔ اس کی ”میں“ کو سکون مل گیا۔ اس کا اپنا آپ مسکرا اٹھا۔ ناز نے باتیں بھی تو ایسی کیں۔

”میں یوں آنا مناسب نہیں سمجھتی۔ آپ کے گھر میں کوئی عورت بھی تو نہیں مجھے یوں آنا اچھا نہیں لگتا۔ باقی رہا اس ملاقات میں آپ کی حیثیت اور مقام کا تعین کرنا۔ تو صاحب..... میں اس کی قائل نہیں۔ آپ امیر ہیں یا غریب..... مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرے پرکھ کی اساس خلوص ہے۔ اور وہ میں نے آپ کی ذات میں ہمیشہ پایا ہے۔ اور اسی خلوص نے مجھے متاثر کیا ہے۔“ وہ ایسی باتیں کرتی رہی۔ اعجاز مرعوب ہوتا چلا گیا۔

یا کچھ اور

جب واحد بھائی کا فون آیا چھ بجنے میں پانچ سات منٹ ہی تھے۔ اور گاڑی پورے پونے سات چھوٹی تھی۔ اماں جی بیمار تھیں۔ انہیں ہسپتال داخل کروانا تھا۔ بھابی اکیلی تھیں۔ گھر اور ہسپتال دونوں ذمہ داریاں سنبھالنا مشکل تھا۔ کچھ ویسے بھی اماں جی کی خواہش تھی کہ میں ان کے پاس رہوں۔ بھائی نے فون پر تسلیاں تو بہت دی تھیں یہ بھی کہا تھا کہ صبح آرام سے آ جانا، لیکن توبہ، اماں جی بیمار ہوں اور ان کی چہیتی بیٹی کو آرام آ جائے۔

میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ پر لگا کر اڑ جاؤں، اور اپنی پیاری سی اماں کو جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ کئی واسے، کئی دسو سے دل میں اٹھنے لگے تھے۔ کچھ سوچہ ہی نہیں رہا تھا۔ خیبر میل چھوٹنے میں تھوڑا ہی وقت تھا۔ لیکن میں اسی گاڑی کو پکڑنا چاہتی تھی۔ لاہور سے پشاور جانے کے لئے ویسے بھی میں اسی گاڑی پر سفر کیا کرتی تھی۔ اور آج تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ صبح تک انتظار کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

جلدی جلدی چیزیں سمیٹیں، افراتفری میں سامان رکھا۔ ایک سوٹ کیس میں اپنے اور چھوٹی دونوں بچیوں کے کپڑے ڈالے، تھرماس میں دودھ بھرا، کچھ ڈبل روٹی کے پیس، کچھ بسکٹ، جو کچھ گھر میں ملا، نوکری میں ڈال لیا۔ بڑی بیٹیوں کو گھر ہی ابو کے پاس چھوڑتے ہوئے جانے کیا کیا ہدایات دیں۔ نوکر کو ٹیکسی کے لئے دوڑایا۔ صاحب

سعدی کے متعلق بھی تمہارا یہی خیال تھا۔ اور سائرہ کو تم نے اچھی لڑکی کہا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا، وہ ضرورت سے زیادہ ہی حریص ہیں۔ بڑی مادہ پرست..... ناز..... کیا کہنے اس کے..... سب سے منفرد ہے وہ..... سب سے الگ.....“

اور

واقعی

ناز منفرد بھی تھی اور سب سے الگ بھی۔

اس نے اعجاز سے دوستانہ مراسم بڑھانے سے پہلے ہی اس کی مالی حیثیت معلوم کر لی تھی۔ اس کی اراضی، محل نما کوٹھی اور بینک بیلنس کے متعلق تحقیق کر لی تھی، نوشینہ، سعدی اور سائرہ کی طرح سادگی سے پٹ جانے والا مہرہ نہیں تھی وہ.....

بڑی ہوشیار

بڑی گھاگ

اور

بڑی ہی چالاک تھی وہ۔

☆☆☆

کی بھی مرضی تھی کہ میں صبح ہی چلی جاتی، رات کا سفر۔ سیٹ وغیرہ ملنے کا بھی امکان نہیں تھا۔ دبے لفظوں میں انہوں نے رات خیرمیل سے بغیر سیٹ کی ریزرویشن کے جانے کی مخالفت بھی کی۔ لیکن سینڈ کیا تھرڈ میں بھی جانا پڑتا تو چلی جاتی۔ میری ماں بیمار تھی۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے شفقتیں، محبتیں بکھرتی جا رہی ہوں میں ان سب کو ماں کے پاس جا کر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ ان کی شفقتوں کے سائے میں سستانا چاہتی تھی ان کی چاہتوں کا سہارا لینا چاہتی تھی۔ ان کی محبتوں کو روح میں اتار لینا چاہتی تھی۔

نوکر ٹیکسی لے آیا تو مجھے بستر یاد آیا، رات بھر بچوں کو بستر کے بغیرنگی سیٹوں پر تونہ لٹایا جاسکتا تھا۔ بھاگم بھاگم تکیہ چادر، دری جو کچھ بھی ہاتھ لگا اٹھالیا۔ نوکر نے ٹیکسی میں سامان رکھ دیا اور میں دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر پچھلی سیٹ پر آن بیٹھی، بڑی بچیاں چونکہ گھر میں اکیلی تھیں۔ اس لئے ان کے ابو کو گھر ہی رکنا پڑا۔ اور میں نوکر کے ساتھ اسٹیشن آگئی۔ ٹیکسی رکتے ہی قلی لپکے۔ نوکر کے کچھ کہنے سے پہلے قلی نے سامان اپنے اوپر لاد لیا۔

”کہاں جانا ہے بی بی۔“ میرے ٹیکسی سے برآمد ہوتے ہی قلی نے پوچھا۔

”پشاور.....“ میں نے ٹیکسی والے کو پیسے دینے کے لئے بٹوہ کھولا۔

”کتنے پیسے.....“ میں نے سیٹ پر اطمینان سے بیٹھے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف پہلی بار دیکھا..... اور دیکھا کیا، دیکھتی ہی رہ گئی..... ٹیکسی ڈرائیور نہیں جیسے واحد بھائی بیٹھے تھے۔

”ڈیڑھ روپیہ.....“ ٹیکسی والے نے مجھے اس انہماک سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ششدر سا ہو کر کہا۔

میں نے ڈیڑھ روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، ہاتھ بھی تو بالکل واحد بھائی کا تھا۔ اتنی مشابہت بھی کبھی ہو سکتی ہے۔ وہی ناک نقشہ، وہی ہی رنگ، انہی کی طرح بھاری بھر کم وجود میں سوچ رہی تھی کہ وہ گاڑی نکال کر لے گیا۔

”خیرمیل کا سنگل ڈون (سنگل ڈاؤن) ہو گیا ہوا ہے بی بی، جلدی کیجئے، ابھی

ٹکٹ بھی لینا ہوگا آپ کو۔“

قلی مجھے یوں ششدر کھڑے دیکھ کر بولا۔

”ہاں ہاں ٹکٹ بھی لینا ہے.....“ میں چونکی پیسے نوکر کو دیئے اور خود بچوں کو لے کر قلی کے ساتھ اس پلیٹ فارم پر چل دی جہاں خیرمیل نے آنا تھا۔

اسٹیشن پر گاڑی کے آنے کی ہلچل تھی۔ بھیڑ بھاڑ اور شور و غل تھا۔ کوئی قلیوں کو پکار رہا تھا۔ کوئی سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ ریڑھی والے کھانے پینے کی چیزیں لئے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ رہے تھے۔ غل غپاڑے اور ہلچل میں میرے ذہن سے ٹیکسی ڈرائیور کی واحد بھائی سے مشابہت سے جو حیرانی پیدا ہوئی تھی وہ محو ہو گئی۔ اب مجھے بچیوں کو سنبھالنا اور گاڑی میں جگہ لینے کا مسئلہ درپیش تھا۔

گاڑی آئی رش اتنا تھا کہ کوئی اور وقت ہوتا تو میں گھر واپس لوٹ جاتی۔ جانا بھی ضروری تھا۔ جیسے تیسے گاڑی میں گھس ہی گئی۔ ایک باوقاری خاتون نے انتہائی شفقت سے اپنے پاس تھوڑی سی جگہ دے دی۔ میری چار سالہ بچی کو انہوں نے کھڑکی کے ساتھ اپنے بکس پر بٹھالیا، دوسری کو میں نے گود میں بٹھایا، موسم خوشگوار تھا گاڑی چلتے ہی حواس بجا ہو گئے۔ نکلنے کو جگہ مل گئی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر رسمی باتیں شروع ہو گئیں۔

”آپ کہاں سے آئی ہیں..... کہاں جائیں گی.....؟“ ان جملوں کا تبادلہ تو سفر ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس خاتون نے گجرات جانا تھا مجھے خوشی ہوئی، چلو گجرات جا کر آدھی سیٹ پر تو قبضہ ہو ہی جائے گا۔ اور نہیں تو دونوں بچیاں تو آرام سے سو سکیں گی۔ باقی ڈبہ تو بھرا پڑا تھا۔ اور اکثریت پشاور جانے والوں کی تھی۔

گود والی بچی تو بڑے اطمینان سے سو گئی۔ بکس پر بیٹھی بچی ہلکورے لینے لگی۔ تو اسی خاتون نے اس کا سراپنی گود میں رکھ اسے بکس پر لٹا دیا۔ جانے اس خاتون میں کیا کشش تھی۔ شاید یہی کہ اتنے رش اور بھیڑ بھاڑ میں وہ میرا یوں ہمدردی سے ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے اس سے عقیدت سی ہو گئی۔ عجیب اتفاق تھا کہ ان کی بھی والدہ بیمار

تھیں۔ اور وہ انہیں ملتان سے دیکھنے آ رہی تھیں۔ درد بھی مشترک تھا۔ اس لئے ہم دونوں بھرے پرے ڈبے میں صرف ایک دوسرے میں مگن باتیں کرتی رہیں اور پھر جانے کب باتوں ہی باتوں میں اونگھ گئی۔

”آپاجی جلدی کیجئے۔ گاڑی یہاں بہت کم رکتی ہے“ واحد بھائی کی آواز پر میں ہڑبڑا کر چوکی۔ کیا پشاور آ گیا؟ میں نے سوتے جاگتے میں صرف یہی سوچا۔

”گجرات آ گیا ہے۔“ وہ خاتون مسکرائیں اور میں نے پلٹ کر دیکھا واحد بھائی کھڑے اوپر والی سیٹ سے اس خاتون کا مکس اتار رہے تھے۔

بالکل واحد بھائی۔ مجھے خوف سے جیسے کپکپی سی آ گئی۔ اور جب تک میں پوری طرح بیدار ہوئی وہ خاتون میری بچیوں کو پیار کرتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ ”وہ کون ہے؟“ میں نے حواس باختہ ہو کر واحد بھائی جیسے انسان کی طرف دیکھا۔

”یہ میرا بھائی ہے۔“ وہ خاتون بولی۔ اسی کے پاس امی رہتی ہیں۔“

”خدا حافظ کہہ کر وہ اتر گئی..... گاڑی چل دی..... میرا دماغ چکرا سا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی یاد آ گیا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا۔ اتنی مشابہت بھی ہو سکتی ہے۔ مشابہت کیا؟ دونوں دفعہ ہو بہو واحد بھائی کو میں نے دیکھا تھا..... یا الہی یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ اور میری اسی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صندوق پر بیٹھی عورت اس خاتون والی جگہ پر براجمان ہو گئی۔ میں نے بہتیرا کہا بچیوں کی بے آرامی کا احساس دلانا چاہا۔ لیکن وہ لڑاکا سی عورت تھی۔ مجھے مجبوراً چپ ہونا پڑا۔ جیسے تیسے بچیوں کو بکس اور گود میں لٹا کر پھر آج کے رونما ہونے والے عجیب و غریب واقعہ کے متعلق سوچنے لگی۔

گاڑی فرائٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خوشگوار لگ رہی تھی۔ مجھے شور و غل ہو تو کبھی نیند نہیں آتی، لیکن جانے کیا بات تھی۔ گاڑی کی کھٹا پھٹ اور عورتوں کی کھر دری اونچی اونچی باتوں کے باوجود نیند آ گئی۔ میں بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی۔

اور پھر جانے رات کا کیا بجا تھا اور کون سا اسٹیشن تھا، ساری عورتیں بے خبر سوئی تھیں، بکس پر بیٹھی بوڑھی عورت عین دروازے کے سامنے تھی۔ باہر سے شاید کوئی سواریاں اندر آنے کو تھیں، دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

”اماں جی۔“ میں نے اس عورت سے کہا ”دروازہ کھول دیجئے“ گاڑی کہیں چل نہ دے، کوئی سواریاں ہیں شاید۔“ باہر سے کسی نے زور زور سے دروازے کو لاتیں ماریں۔ ساتھ ہی شور مچایا کہ دروازہ کھولو۔ میری بات کا تو اس عورت پر اثر نہ ہوا تھا۔ اب ذرا ساسر کی، میں نے اٹھ کر دروازے کی اوپر والی چٹخنی کھول دی، دھکے سے دروازہ کھلا۔ ایک عورت دو بچے اور ایک ملازم لڑکا اندر آئے۔ سب گھبرائے ہوئے تھے۔ گاڑی وسل دے چکی تھی۔ اور ان کا سامان ابھی باہر تھا۔ ڈبے میں ایک بھگدڑی مچ گئی۔ قلی سامان اندر پھینکنے لگا میں بچیوں کو سیٹ پر ٹھیک سے لٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ عورتیں بڑبڑا رہی تھیں۔ اور اندر آنے والی عورت قلی سے پیسوں کے معاملہ پر تکرار کر رہی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یا میرے خدا، قلی کہاں وہ تو واحد بھائی تھے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتی قلی پیسے لے کر بڑا تے ہوئے اتر گیا، کیونکہ گاڑی سرکنے لگی تھی۔ میں بچیوں کو دیے ہی چھوڑ لپک کر دروازے کی طرف آئی۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے والے قلی کی طرف دیکھا۔ اس کی چال بھی واحد بھائی کی سی تھی۔ ایک لمحہ کو تو مجھے یوں لگا جیسے لال قمیض ملگئی سی شلوار اور پھٹی ہوئی چادر کندھے پر ڈال کر واحد بھائی نے بہروپ بھر رکھا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے خوف کی کپکپی میرے سراپا میں دوڑ گئی، جلدی سے پیچھے نہ ہٹ جاتی تو شاید چکرا کر گر پڑتی سیٹ پر پڑتے ہی میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”کیا ہوا بہن.....“ اسی لڑاکا عورت کی ساری ہمدردیاں مجھ سے وابستہ ہو گئیں۔ میں اسے کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا..... یہ سب کیا ہے۔ کیا ایسی مشابہت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہو بھی سکتی ہے تو بار بار۔

کے قریب تھی۔ کیا میں بے ہوش ہو گئی تھی؟

میں نے عورتوں کا شکریہ ادا کیا۔ چھم چھم آ نسو بہاتی بڑی بچی کو سینے سے لگایا، گود والی بے خبر سوئی بچی کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیئے۔ پریشانی کے عالم میں جانے کیا کیا حرکتیں کر رہی تھیں۔ اب تو قوت برداشت نہیں رہی تھی۔ میں نے ساتھ والی عورتوں کو آج بار بار رونما ہونے والے واقعے کے متعلق بتایا، تو کونے میں بیٹھی نو بیاہتا لڑکی زرد زرد پڑ گئی۔ لیکن دائیں ہاتھ بیٹھی جہاندیدہ سی عورتیں ہنس پڑیں۔ لڑا کا عورت نے اسے جناتی واقعہ تسلیم کر لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں میں اور پریشان ہو گئی۔ شکر ہے راسبتہ گھنٹہ بھر کا باقی رہ گیا تھا۔ ورنہ ان عورتوں کے استفسار پر باتوں کے جواب دینے کی مجھ میں سکت ہی کہاں تھی۔

پشاور کا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی سب نے اپنا سامان وغیرہ درست کر لیا۔ میں نے بھی بستر سمیٹا بچیوں کو جگایا۔ ٹوکری میں ادھر ادھر بکھری چیزیں ڈالیں اور تھرمس میں خراب ہو جانے والا دودھ باہر پھینکا، گاڑی اسٹیشن پر آن ٹھہری۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ میں کھڑکی سے باہر دیکھ سکتی کہ کوئی مجھے اسٹیشن پر لینے بھی آیا ہے یا نہیں۔

”واحد ماموں.....!“ جب میری بڑی بچی زور سے چلائی۔ تو میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکا کہ بس رک ہی جانے کو تو ہوا..... واحد بھائی ڈبہ ڈبہ دیکھتے یہاں آ پہنچے تھے۔

”ہیلو.....“ وہ خوشی سے بولے.....“ میرا بھی خیال تھا کہ آپ ضرور خیبرمیل سے آ جائیں گی۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں اماں جی کچھ ایسی بیمار نہیں کہ.....“ وہ جانے کیا کہتے ہوئے بچیوں کو لپٹا رہے تھے۔ قلی کو سامان اٹھانے کا کہتے ہوئے بڑی بچیوں اور ان کے ابو کا حال پوچھ رہے تھے۔

میں ڈر رہی تھی۔ سہی ہوئی تھی۔ نظر بھر کر ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی کہ کہیں یہ بھی تورات بار بار نظر آنے والے واحد بھائی نہیں ہیں۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی کو

کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ ڈبے میں کبھی کبھی گڑ بڑا ہٹ سی محبتی اور پھر سکون ہو جاتا۔ گاڑی کی کھٹا پھٹ کبھی تیز ہو جاتی کبھی تھم جاتی۔ بچیاں بے آرام ہوتیں تو نیند میں چینے لگتیں۔ چھت سے چپکی زرد روشنیاں کبھی آنکھیں موند لیتیں اور کبھی فراخ دلی سے روشنی بکھیرنے لگتیں۔ وقت بھی گزر رہا تھا۔ اور فاصلے بھی سمٹ رہے تھے۔ میں پشاور کے قریب قریب پہنچتی جا رہی تھیں۔ لیکن اس وقت مجھے پشاور پہنچنے کی خوشی کا احساس تھا نہ اماں کی بیماری کا خیال میرا ذہن تو ہر پھر کر واحد بھائی کے گرد منڈلا رہا تھا۔ واحد بھائی جسے ٹیکسی ڈرائیور، پھر اس خاتون کا بھائی اور اب قلی کے روپ میں دیکھا تھا۔

ابھی سوچوں اور رات بھر کی بے چینی نے سردرد کی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ چائے کی طلب سی ہوئی۔ چائے یوں بھی میری کمزوری ہے۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھی عورت نے چائے کا کپ منہ سے لگا رکھا تھا۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ گاڑی شاید کیمبل پور کے اسٹیشن پر تھی۔ صبح کے آثار نمودار تھے، اندھیرے تحلیل ہو رہے تھے۔ مشرقی گوشے میں دھندلی سی بے رنگ روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے گود والی بچی کو آہستگی سے اپنی جگہ پر لٹایا اور چائے والے کو پکارنے کے لئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

”اف.....“ میرا دماغ ریل کے پھیپے کی سی تیزی سے گھوم گیا، سامنے ہی اسٹال پر واحد بھائی کھڑے چائے کے گھونٹ اپنے مخصوص انداز میں حلق سے اتار رہے تھے۔ ساتھ ہی کئے بالوں والی لمبی سی عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی چائے کی پیالی تھی۔ دونوں ہنس کر بات کر رہے تھے۔

”یقیناً یہ واحد بھائی نہ تھے۔ لیکن کون تھے.....؟“

میں نے چکراتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کوشش میں بکس پر ہی گر گئی تھی۔ کیونکہ جب میں پوری طرح اپنے حواس میں آئی تو ارد گرد کی عورتیں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ کوئی سر سہلا رہی تھی۔ کوئی احوال پرسی کر رہی تھی۔ اور گاڑی نو شہرے

اماں کی بیماری سے منسوب کر رہے تھے۔ اور جب انہوں نے بڑے پیار سے مجھے لپٹا کر تسلی دی تو میرا جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

گھر پہنچ کر جب میں پوری طرح حواس میں آئی تو سب کو یہ عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ سب بے اختیار ہنس پڑے۔ کسی نے مذاق اڑایا، کسی نے ہمدردی جتائی۔ بھابی کہنے لگیں۔

”پریشانی کی وجہ سے ایسا محسوس ہوا ہے۔“

چھوٹے بھیا بولے.....“ کوئی نیا پلاٹ سوچا ہے تو سیدھی طرح سناتی۔ یہ واقعہ واحد بھائی سے منسوب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

واحد بھائی ہنسے۔ ”ہماری بہن کو سب سے زیادہ محبت ہی سے ہے اور ہمیں بھی اپنی بہن سے رات کا سفر تھا اس لئے ہم ان کی خبر گیری کرتے رہے رات بھر.....“

کسی نے بھی تو میری بات کو سچ جاننے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ اماں جی نے بھی میری پریشانی پر اس بات کو محمول کیا، میں جھلا گئی، لیکن واقعہ جو حقیقتاً پیش آیا تھا۔ کسی کو بھی اس کی حقیقت تسلیم نہ کروا سکی۔

اس قصے کو دس سال سے زائد گزر چکے ہیں۔ پھر کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ کوئی مافوق الفطرت بات کبھی پیش نہیں آئی، میں اکثر سوچتی ہوں وہ سب کیا تھا، کیا مشابہت کا سلسلہ محض اتفاقی تھا یا کچھ اور۔

☆☆☆

خالی گود

کل تک تو اس کا یہی خیال تھا کہ وہ ڈاکٹری رپورٹ وسیم کو دکھا دے گی۔ اسے اندازہ تھا کہ طوفان اٹھے گا۔ لیکن یہ بھی احساس تھا۔ کہ طوفان اتنی ہی تندی سے مات کھا کر جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جائے گا۔ جو کچھ بھی ہونا تھا، اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ و تیار کر لیا تھا۔ آئی بلا ٹالنے کو اس کے پاس یہی آخری اور مؤثر ہتھیار تھا۔ بے شک اس نے عہد کر رکھا تھا۔ کہ اس راز سے اپنی زندگی میں پردہ نہیں ہٹائے گی، لیکن شکست عہد اس کے ہاتھوں نہیں وسیم کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ کل اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن آج اس نے یہ ارادہ بالکل ترک کر دیا تھا۔ وہ بہت خونخوار ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ ایسی آگ جو ٹیشن جلا دیتی ہے۔

وہ سعدیہ سے مل کر آئی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رہنے کا کہنے لگی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کی بھیک مانگنے لگی تھی۔ ہر طریق سے اس نے سعدیہ کو باز رکھنا چاہا تھا۔ لیکن وہ..... وہ ماننے پر آمادہ نہ تھی۔ وسیم کی سحر کاری اپنا پورا پورا اثر کر چکی تھی۔ اس کی محبت میں وہ تو جیسے پاگل سی ہو رہی تھی.....

”سعدیہ میری بات مان جاؤ، اس محبت کو بھول جاؤ، یہ مرد معصوم لڑکیوں کو اپنے چنگل میں پھنسانے کے لئے ایسے سنہری جال پھیلا کر دیتے ہیں۔ یہی دعوے وسیم میری محبت کے بھی کیا کرتا تھا۔ بلکہ اب بھی کرتا ہے۔ لیکن دیکھ لو انجام۔“

سعدیہ نے اس کی باتیں ایک نگاہِ تسخیر میں اڑا دی تھیں۔ ”مجھے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ماجدہ! میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔“

اور پھر باتوں میں اتنی تلخی آ گئی تھی۔ ایسا زہر بھر گیا تھا کہ سعدیہ نے اسے بھکارن سمجھتے ہوئے بڑی نخوت سے دھتکار تے ہوئے کہا تھا۔

”وسیم کو بچے کی ضرورت ہے اور دس سالوں میں تم چڑیا کا بچہ بھی اسے نہ دے سکی۔ خود غرض۔“

سعدیہ کھلکھلا کر اس طرح ہنسی کہ اسے اپنے چاروں طرف آتشیں شعلوں کا سیلاب سا امنڈنا محسوس ہوا تھا۔ یہی وہ آتشیں لمحہ تھا۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کل والا ارادہ بدل دیا تھا۔ بیوی سے وہ صرف وہ عورت رہ گئی تھی جس کی قربانی کو خود غرضی کہہ کر روند ڈالا گیا تھا۔ جس کی انا کو کچھ کے لگائے گئے تھے۔ جس کی نسوانیت کی توہین کی گئی تھی۔ پھنکار تے ہوئے وہ اٹھی تھی اور صرف یہی کہا تھا۔

”پچھتاؤ گی کسی دن۔“

اور سعدیہ نے ایک اور طنزیہ قہقہہ لگایا تھا۔ ”یہ قہقہہ گھر آنے تک اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس کی روح کے اندر کھول رہا تھا وسیم کو تو سمجھاتے سمجھاتے وہ عاجز آ گئی تھی۔ آخری چارہ یہی تھا کہ وہ سعدیہ کے پاس گئی تھی۔ ایک عورت کو اپنا مجروح دل دکھا کر بھیک مانگنے گئی تھی۔ لیکن وہ اب تلملا رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ اپنی ذلت اور رسوائی سے مرغِ بیکل کی طرح تڑپ رہی تھی۔“

”یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی.....“ اس نے میز پر مکہ مارتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ”سعدیہ اور وسیم کی شادی ضرور ہوگی۔“

شادی! شادی! شادی! اسے اپنی شادی یاد آ گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور میز پر بازوؤں کے حلقے میں سر رکھ کر کھو گئی۔

دس سال پہلے کا وہ چمکتا ہوا حسین دن اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ جب وہ بڑے ارا مانوں سے بڑے چاؤ سے عروسی جوڑا پہن کر سنہری گٹھڑی سی بنی وسیم کی خوبصورتی

سے سخی خوابگاہ میں پھولوں سے لدی ہوئی سچ پر بیٹھی تھی۔ دل کی دھڑکنیں آواز پانی تھیں۔ خوشیوں کی ایسی یلغار تھی کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں زندگی کے سب سے بڑے اور سب سے حسین خواب کی تعبیر ڈول رہی تھی۔ آج وہ شرعی اور قانونی طور پر وسیم کی ہو گئی تھی۔ وسیم جسے اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ دل کی دھڑکن کی طرح اپنے آپ میں پایا تھا۔

دونوں قریبی دوست تھے۔ نگاہوں کی خاموشیوں میں بڑے بڑے مراحل طے ہو گئے تھے۔ کبھی چوری چھپے ملاقاتیں ہوئی تھیں نہ نامہ و پیام بھیجا بھیجوا یا گیا تھا۔ بس اک نگاہیں تھیں۔ جو بولتی تھیں۔ بہت کچھ سنتی تھیں۔ شاید ان نگاہوں کا مفہوم والدین نے سمجھ لیا تھا۔ یا اپنے طور پر ہی فیصلے کر لئے تھے۔ دونوں کو ازدواجی بندھنوں میں بڑے چاؤ سے جکڑ دیا گیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو پا کر اتنے خوش تھے کہ دنیا نظروں میں جنتی رعنائیوں کی حامل نظر آنے لگی تھی۔ زندگی کی شاہراہوں پر پھول ہی پھول مسکرا اٹھے تھے، فردوسی نغموں کی گنگناہٹ حیات کا دوسرا نام بن گئی تھی۔

ایک سال گزرتے پتہ بھی نہ چلا تھا۔ لیکن دوسرا سال چونکا دینے والا تھا خوشیوں مسرتوں اور حسین ترین گہما گہمیوں کے باوجود کچھ اکیلے پن کا احساس دونوں ہی کو ہوا تھا۔ بے نام سی اداسی روح میں اترنے لگی تھی۔ زندگی کا آنگن پھولوں سے چا پڑا تھا۔ لیکن یہ سب پھول کچھ تصنع کا لبادہ لئے دکھائی دیتے۔ یہ بے مہک سے پھول کسی وقت پریشان کر دیتے۔

اور اس دن تو اس کی پریشانی اتنی بڑھی کہ وہ رونے لگی۔ اس کی ساس کتنے دل گرفتہ لہجے میں اپنی کسی ملنے والی سے کہہ رہی تھی۔ ”میرا تو ایک ہی بیٹا ہے سال گزر گیا، ابھی تک کوئی امید نظر نہیں آئی، کوئی پوتی پوتا ہو جاتا تو زندگی پرسکون ہو جاتی.....“

اور پھر اس کی گود ہری ہونے کے چرچے ہونے لگے۔ ساس اسے ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھری۔ ٹوٹے، ٹوٹے دم دار، تعویذ ہر چیز آزما دیکھی۔ دامن امید گوہر

مقصود سے نہ بھرا تو اس کا دل بھی بیٹھنے لگا۔ ننھے ننھے بچوں کے خواب تو وہ بھی دیکھا کرتی تھی۔ موٹے موٹے تازہ دم بچے، خوبصورت وحسین بچے، ساس سے کہیں زیادہ تو وہ خود بچوں کی دیوانی تھی۔

دوسرا سال بھی گزر گیا، اور پھر تیسرا بھی، وسیم کی تسلیوں کے باوجود وہ چڑچڑی سی ہو گئی۔ علاج معالجے اور ہر وقت کی ذہنی کوفت سے اس کا سنہری رنگ دھندلا سا گیا۔ آنکھوں کا سارا حسن تفکرات کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کی صحت کو جیسے گھن سا لگ گیا۔

وسیم اسے حوصلے دلاتا رہا، پیار نچھاور کرتا رہا۔ زندگی خواہ یوں ہی ٹنڈ منڈ رہے۔ وہ اسے ہمیشہ ساتھ دینے کا احساس دلاتا رہا۔ ”بچے نہیں ہوتے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ خدا کو منظور نہیں ہوگا۔ اور پھر ہم ہی تو نہیں دنیا میں سینکڑوں ایسے جوڑے ہوں گے اس بات کو روگ بنا لینا کہاں کی عقل مندی ہے ماجدہ، دل سے ہر وہم نکال دو، اور پھر..... دیکھو نا..... مجھے تو ویسے بھی بچوں سے وحشت ہوتی ہے، رہیں اماں، تو ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو۔“

”وہ بہتیرے بہلاوے دیتا تھا لیکن دل میں ہمیشہ گدگدانے والی خوشیاں جیسے آپوں آپ مرتی جا رہی ہوں۔ وجود سے زندگی یوں نچرتی جا رہی تھی۔ جیسے دھلے ہوئے کپڑے سے پانی۔ ایسا ہوتا بھی کیونکر نہ؟ ساس تو مایوسی کی ان حدوں تک جا پہنچی تھی جہاں سے امید کی نئی راہوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ وسیم کی دوسری شادی کے لئے وہ سنجیدگی سے سوچنے اور کہنے لگی تھی۔ وسیم سہارے نہ دیتا تو شاید وہ تورا تورا کرایسی گری ہوتی کہ اٹھنے کی امید ہی نہ رہتی۔ وسیم کو اماں کے ارادے کا علم ہوا تھا۔ تو اس نے جیسے قیامت برپا کر دی تھی۔ وہ ایسی بات سننے کو بھی تیار نہ تھا۔ ماجدہ تو اس کی زندگی کا محور تھی۔ محور سے چھٹ کر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وسیم نے جس طرح ٹوٹ کر ان دنوں اسے پیار کیا تھا، ہمیشہ ساتھ دینے کی جتنی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ بہل گئی تھی۔ اس کے دل سے سارے خدشے نکل گئے تھے۔

بچوں کا ارمان اپنی جگہ سہی پھر بھی اس نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہی دنوں اس کی عزیز سہیلی میمونہ مقامی ہسپتال میں تبدیل ہو کر آگئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر تھے۔ شوہر نے بھی یہیں تبدیلی کروالی تھی۔ میمونہ اسے ملنے آئی تو حیران ہی رہ گئی تھی۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور مزاج کی شوخی کہیں نام کو نہ رہی تھی۔

اس نے نمناک آنکھوں سے اپنی محرومی کی داستان ڈاکٹر میمونہ کو سنائی تھی۔ دکھ تو میمونہ کو بھی بہت ہوا، لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے اسے بہتری تسلیاں دیں اور پھر اب تک وہ جس جس ڈاکٹر سے علاج کروا چکی تھی۔ تفصیل سے ہر بات پوچھی تھی، ننھے دیکھے تھے۔ اور ڈاکٹری نقطہ نظر سے جو مناسب سمجھا پوچھا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”میمنہ! میں کبھی ماں نہ بن سکوں گی۔“ اس نے بڑے جذباتی پن سے پوچھا تھا۔

”یوں کرو، تم دونوں کل ہسپتال آ جاؤ۔“

وہ انہیں ہسپتال آنے کی تاکید کر گئی تھی۔ اس کی باتوں سے اسے یونہی سا قرار آ گیا تھا۔ رات اس نے وسیم سے ساری بات کسی نئی امید کی روشنی میں کہی تھی۔ تو وسیم کی جیسے مردانگی ضرب کھا گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگوار سا تاثر لہرایا تھا۔ پھر بڑے وقار اور بڑے اعتماد سے اس نے کہا تھا۔ ”میں معائنہ نہیں کراؤں گا۔“ وہ پھر بھی بضد رہی کہ معائنہ کرایا جائے۔

”میں اچھا بھلا صحت مند آدمی ہوں۔“ اس نے قدرے تلخی سے کہا تھا اور وہ مایوس ہو کر رو دی تھی۔

پھر کئی دن بحث و تکرار ہوتی رہی تھی۔ اس کا یہی کہنا تھا۔ ”آخر حرج ہی کیا ہے؟ ڈاکٹر نے مناسب سمجھا ہے تو یہ کہا ہے نا۔ اپنی نہ سہی میری خاطر ہی سہی۔“ اور پھر اس دن وہ اسے زبردستی پکڑ کر ہسپتال لے گئی تھی۔ بالکل زبردستی۔ وہ تو ڈاکٹر کے حسن سلوک اور سمجھانے بھانے سے نیم راضی ہوا تھا۔ ورنہ اس کے زبردستی کرنے سے شاید

رپورٹ لینے وہ خود ہی میمونہ کے گھر گئی۔ وسیم تو اس سلسلے میں بات ہی کرنے کو تیار نہ تھا۔ رپورٹ لینے کیسے جاتا۔ رسی سی باتوں کے بعد اس نے میمونہ سے رپورٹ مانگی۔ میمونہ کے چہرے کے عجیب و غریب تاثر دیکھ کر اس کا دل کچھ سہم سا گیا۔ میمونہ فائل اٹھا کر لائی اور میز پر رکھتے ہوئے چہرے پر بشارت لانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ ”پہلے کچھ چائے وائے تو پی لو۔“

اس کا دل دھڑک دھڑک کر اودھم مچا رہا تھا۔ چائے کیونکر پی لیتی۔ ”کیا زلٹ رہا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

صوفے پر بیٹھے بیٹھے آگے کو جھک کر میمونہ نے فائل اٹھائی، صفحات الٹے پلٹے اور پھر گھمبیر آواز میں بولی۔ ”تم بالکل ٹھیک ہو۔ لیکن ماں کبھی نہ بن سکو گی ماجدہ“ اور..... اسے یوں لگا جیسے ایک ایسی کوئی چیز اس کے اندر ہی اندر اس طرح پھیل گئی کہ اس کا سارا وجود اس غبارے کی طرح چھٹ جانے کو ہے۔ جس میں ضرورت سے زیادہ گیس بھری جاتی ہے۔

میمونہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ پیشانی چومی، پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ ”مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا، کسی نے بھی وسیم کا معائنہ نہ کیا۔“ میمونہ رک رک کر بول رہی تھی۔ اور وہ جیسے اندھی گوئی اور بہری ہو گئی تھی۔ کتنی ہی بے رحم ساعتیں گزر گئیں۔ کتنے ہی دکھتے لمحے ریگ گئے۔ جب وہ کچھ حواس میں آئی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میمونہ نے اسے جی بھر کر رو لینے دیا۔ یوں غم کی شدت کم ہو سکتی تھی۔

بے شک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی لیکن اب تک امید کی کرن جاگ رہی تھی۔ اسے صفیہ آپا کا پتہ تھا۔ جن کے ہاں پورے پندرہ برس بعد لڑکا ہوا تھا۔ مائی حیواں کی بہو کو بھی جانتی تھی جس کی گود ساتویں سال ہری ہوئی تھی۔ اس طرح کئی عورتیں تھیں۔ جن کی بانجھ کوکھوں ہی سے ہری ہری کونٹیلیں پھوٹ پڑی تھیں۔ کسی کو ڈاکٹری علاج سے افاقہ ہوا تھا۔ کسی کو دیسی علاج سے تو کسی کی امید تعویذ گنڈے سے ہی برآئی تھی۔ لیکن

اب..... میمونہ کے انکشاف نے تو امید کا چہرہ ہی گم کر دیا تھا۔ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ اس کے خواب ٹوٹ جائیں گے، اس کے تصور بکھر جائیں گے۔ وہ کافی دیر گم صم رہی، تو میمونہ نے واقعے کی تختی کو کم کرنے کے لئے قدرے مسکرا کر کہا۔

”چلو ایک طرف سے تو سکون ملے گا نا تمہیں، اب وسیم کی دوسری شادی کا دھڑکا تو نہیں رہا.....“

میمونہ کی بات پر وہ جبراً مسکرائی، لیکن اس طرح کہ آنسو ابل پڑے میمونہ اسے بہلانے لگی۔ ”چلو کوئی بات نہیں، تم یتیم خانے سے کوئی بچہ گود لے لینا۔ سوچ کا انداز ہی ہے نا..... اپنی تمام تر توجہ اور پیارا سے دے دینا۔“ میمونہ باتیں کرتی رہی اور اس کی نظروں میں وسیم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس رات جب اس نے طبی معائنے کے لئے اسے پہلی بار کہا تھا۔ تو کس طرح اس نے سچ و تاب کھائے تھے۔ اس کا وقار مجروح ہوا تھا۔ اور پھر کتنے تلخ اعتماد سے اس نے کہا تھا۔

”میں اچھا بھلا تندرست آدمی ہوں۔“

اور اب؟ اب؟ اس کا سر چکرانے لگا۔ وسیم کتنا سبک ہو گا۔ اس کی باتیں اس کا وقار اس کا اعتماد کر چیاں کر چیاں ہو کر بکھر جائے گا۔ نہیں نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ اس محرومی کو اپنے سینے میں راز بنا کر دفن کر دے گی۔ لیکن وسیم کی نگاہیں جھکنے نہ دے گی۔ وسیم کی محبت میں وہ بہت بڑا فیصلہ کر بیٹھی۔

میمونہ نے آہستگی سے فائل سے دونوں کی میڈیکل رپورٹ نکالی اور خاموشی سے کاغذ اس کے حوالے کر دیئے۔

”میمونہ۔“ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ تھام لیا۔ میمونہ اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگی۔ ”میمونہ۔“ اس نے مجسم التجا بن کر کہا۔ میمونہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”عدہ کرو میمونہ وسیم کے بارے میں کسی کو کچھ نہ پتہ چلے گا۔ وسیم کو بھی نہیں۔ وسیم نے اگر کبھی پوچھا بھی تو کہہ دینا کہ میں..... میں ہی ماں بننے کے قابل نہیں۔“

”پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ میمونہ نے جلدی سے کہا۔ ”وسیم کیا، وسیم کی ماں کو بھی معلوم ہو جانا چاہیے جو بیٹے کی دوسری شادی پر تلی بیٹھی ہیں۔“

”نہیں میمونہ، وعدہ کرو، میں بھی یہ رپورٹ وسیم کو نہیں دکھاؤں گی دوسری شادی کی بات چھوڑو، وسیم یہ خیال بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ اس نے میمونہ کے سمجھانے بجھانے کے باوجود اس سے رپورٹ کو صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ لے لیا۔

گھر آئی تو وسیم کمرے میں ہی تھا۔ اسے اتنا اعتماد تھا اپنے پرکہ رپورٹ کے متعلق پوچھا ہی نہیں، وہ خود ہی بے اختیاری سے رودی کہ وسیم سہم گیا۔

”میں کبھی ماں نہ بن سکوں گی وسیم، کبھی میری گود ہری نہ ہو سکے گی۔“ وہ رو رو کر کہتی رہی اور وسیم کہتا رہا۔

”تم میری زندگی ہو ماجدہ، میں تمہیں کبھی پیچھا نہیں دکھاؤں گا۔ آج سے تمہارے سارے علاج معالجے بند، خواہ مخواہ صحت بر باد کر لی ہے، خدا کی یہی رضا ہے تمہارا کیا قصور.....“

اس نے بھیگی پلکوں سے وسیم کا چہرہ دیکھا تھا۔ کتنے اعتماد کیسے وقار سے وہ اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ محرومی، مایوسی اور حرماں نصیبی کے باوجود اس کے من کے اندر سکون کی لہریں پھیل گئی تھیں۔

پھر تین چار سال کتنے سکون سے گزر گئے تھے، ساس فوت ہو گئی تھیں۔ اب تو دوسری شادی کا کوئی ڈھکے چھپے بھی نام نہ لیتا تھا۔ رشتہ دار عزیز وسیم کو کبھی کبھی اکساتے ضرور تھے۔ لیکن وہ جیسے پتھر کی سل بن چکا تھا، لیکن شادی کا دسواں سال اس کے لئے پریشان کن تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی وسیم بچے کے لئے بری طرح بے تاب ہے۔ جب وہ پڑوسن کا کالا کلوٹا بچا اٹھا کر ہوا میں یوں اچھال دیا کرتا، اس کے لئے بسکٹ ٹافیاں اور کھلونے لے آیا کرتا، تو اس کے دل سے ہوک سے اٹھتی، وہ وسیم کی آنکھوں میں تڑپتی مچلتی خواہش دیکھ کر بے تاب ہو جاتی۔

ایک دن اسی خواہش کے احترام میں اس نے وسیم سے کہا..... ”ہم یتیم خانے سے

بچہ گود کیوں نہ لے لیں۔“

”نہیں۔“ وسیم نے دو ٹوک جواب دے دیا۔ ”میں کرائے کے بچوں کا قائل نہیں، بچہ اپنے ہی گوشت پوست کا ہونا چاہیے۔“

”لیکن وہ کیسے ہوگا۔“ اس نے مایوس نظروں سے وسیم کو دیکھا۔

”تم چاہو تو ہو بھی سکتا ہے۔“ وسیم نے گھمبیری مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔ لیکن اگلے چند دنوں ہی میں محالات اتنی تیزی سے بدلے کہ وہ بکھر کر رہ گئی۔

سعدیہ وسیم کے دفتر کی ٹائپسٹ تھی۔ چھبیس ستائیس سالہ سعدیہ جانے کب اور کیونکر وسیم کی زندگی میں داخل ہوئی اور کیونکر اسے موٹے تازے صحت مند گل گوتھنے سے بچوں کا شدت سے احساس دلایا۔ اور زندگی کی روکھی پھینکی یکسانیت سے اکتا کر کب وسیم اسے اپنانے کا وعدہ کر بیٹھا۔ اسے تو علم اس دن ہوا۔ جب وسیم نے اس کے گلے میں پیار سے بانٹیں ڈال کر دوسری شادی کے لئے ایک ایک اجازت چاہی۔

”تمہاری حیثیت یہی رہے گی۔ مجھے صرف بچوں کی ضرورت ہے، سعدیہ ہماری روکھی زندگی میں بہاریں لے آئے گی تم بھی تو بچوں کی دیوانی ہونا۔“

وسیم جانے کیا کیا کہتا رہا تھا۔ لیکن وہ مگر ٹکراس کا منہ تنکے گئی تھی۔ اس کا دماغ ریل کے پیمنے کی طرح گھوم گیا تھا۔

”تمہیں احساس ہونا چاہیے ماجدہ، دس سال ہونے کو آئے، ہماری خالی خالی زندگی اب تو ہولناک ہو گئی ہے۔ میں بچوں کی چہکار سننا چاہتا ہوں۔ میرے بازو ننھے منے بچے کو دبو چنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ تم میری راہ کی رکاوٹ بنیں تو یہ بہت زیادتی ہوگی۔ خود غرضی ہوگی۔“

وہ اسے بھونچکا سا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ کتنی ہی دیر تو وہ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ کہ یہ سب کیا ہوا؟ ہوش میں بے ہوش کھڑی پھٹی پھٹی نظروں سے خلاؤں میں گھورتی رہی۔

جب وہ کچھ حواس میں آئی تو اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ نئی صورتحال پر وہ رودے یا قہقہہ لگائے۔ اس اعتماد کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ جو وسیم کو دوسری شادی پر اکسارہا تھا۔ اس وقار کو درہم برہم کر دے جس کے سہارے وسیم کی ضدیں زندہ تھیں۔ یا خود غرضی کا جلتا ہوا طعنہ سینے سے لگا کر وسیم کی راہ میں پوری جرأت سے آجائے۔

وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ پانچ سال پہلے کی ڈاکٹری رپورٹ اس کے بکس میں بڑی احتیاط سے رکھی پڑی تھی۔ لیکن اسے وسیم کو دکھانے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ اس کے اعتماد اور وقار کے ٹکڑے کرتے ہوئے اسے خوف سا آتا تھا۔

اس نے وسیم کو ہر ممکن طریق سے سمجھایا۔ رورو کر منت سماجت کر کے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن اس کے اعصاب پر سعدیہ اس بری طرح سوار تھی۔ بچے اس طرح مسلط تھے۔ کہ وہ کچھ سننے پر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔

پانی جب سر سے گزرنے کو ہوا، تو اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹری رپورٹ وسیم کو دکھا دے گی۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس سے نپٹنے کے لئے تیار کر چکی تھی۔

کل تو اس کا ارادہ یہی تھا۔ لیکن آج صبح اسے سعدیہ سے مل کر آخری چارہ جوئی کا خیال آیا۔ خود اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اسے سمجھایا، بہلایا، لیکن وہ تو آہنی دیوار تھی۔ ڈانوا ڈول نہ ہوئی۔ وہ دل برداشتہ ہو گئی تو سعدیہ نے اس کا تسخیر اڑایا، اسے خود غرضی کا طعنہ دیا، اسے وسیم کی زندگی تشنہ رکھنے کا قصور وار ٹھہرایا۔ اس کی نسوانیت سعدیہ کی چوٹ سے تڑپ اٹھی۔ اس کی انا مجروح ہو کر چیخ اٹھی وہ بھڑک گئی۔ اس نے رپورٹ وسیم کو دکھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سعدیہ کو نیچا دکھانے کے لئے تل گئی۔

”یہ شادی ضرور ہوگی۔“ وہ کمرے میں دیوانہ وار ٹہلتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔ اس کا انداز چوٹ کھائی ہوئی ناگن کا سا تھا۔ وہ لپک کر اپنے سنور میں گئی۔ سب سے نچلے بکس میں کپڑوں کی تہہ میں وہ رپورٹ والا لفافہ محفوظ پڑا تھا۔ اس نے جلدی جلدی

سوٹ کیس ادھر ادھر ہٹائے، بکس کھولا، کپڑوں کی تہیں الٹی پلٹی کیں اور وہ لفافہ نکال لیا۔

کھڑکی کے قریب آ کر اس نے وہ رپورٹ نکالی۔ جس میں وسیم کی ابدی محرومی کی مہر ثبت تھی۔ اور جسے اس نے نوشتہ تقدیر سمجھ کر اپنا سریوں جھکا دیا تھا کہ وسیم کا وقار برقرار رہا تھا۔ لفافہ ہاتھ میں سختی سے پکڑے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

یہ لفافہ وہ وسیم کی دلہن سعدیہ کو شادی کے بعد رونمائی کے طور پر دے گی، رونمائی..... اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر اس کے قہقہے بکھرتے چلے گئے۔ سعدیہ کا تصور اسے قہقہے لگانے پر مجبور کرتا رہا۔ کتنی ہی دیر وہ مجنونانہ سی حرکتیں کرتی رہی۔

رات جب وہ سوئے کو لیٹی تو بڑے والہانہ طریق سے اس نے وسیم سے کہا۔
”وسیم“ جلدی سے سعدیہ کو لے آؤ۔ ہمارے سونے آنگن میں بہار آئی ہی چاہیے پھول ایسے پیارے پیارے بچے، سعدیہ ہی دے سکتی ہے نا!

وسیم اس کے والہانہ پن سے کچھ شرمندہ سا بھی ہوا تھا۔ پھر اس سے آنکھیں ملائے بغیر اسی ماہ کے آخر میں نکاح کر لینے کی حامی بھر لی تھی۔ وہ اتنا ہنسی تھی کہ وسیم کو اس کی دماغی صحت پر شک ہو گیا تھا، لیکن اس نے جلد ہی بات بنالی تھی۔ ”وسیم بچے کتنی بڑی نعمت ہیں اور میرے خیال میں اس عورت سے زیادہ بد قسمت کوئی نہیں جو اس نعمت سے محروم رہے۔ اب یہ محرومیت ختم ہو جائے گی۔ سعدیہ کے بچے میرے ہی تو ہوں گے۔ گول مٹول بچوں کا تصور مجھے پاگل بنا رہا تھا۔“

رات گزر گئی۔ صبح وہ دیر تک پڑی سوتی رہی۔ وسیم دفتر چلا گیا۔ جب ملازمہ نے اسے جگایا تو دس بجنے والے تھے۔ نکھری نکھری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک رچی بسی تھی۔ نیند اچھی طرح نکال لینے سے اس کا ذہنی تناؤ کم ہو چکا تھا۔ اور اس کی سوچیں صحت مند ہو گئی تھیں۔ وہ سکون اور اطمینان سے اپنے آخری فیصلے کا جائزہ لینے لگی۔ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے وہ سوچ رہی تھی۔ اس سے بڑا ظلم عورت پر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہ ماں بن سکنے کی اہل ہو کر بھی ماں نہ بن سکے۔ وہ سوچتی

رہی، سوچتی رہی۔ اس کی سوچوں کا مرکز سعدیہ تھی سعدیہ جو اس حقیقت سے بے خبر و سیم کو صحت مند بچے دینے کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی۔

پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ بستر سے اٹھی، بیتابی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ سوچوں میں گم تھی۔ سعدیہ پر اتنا بڑا ظلم ہونا چاہیے یا نہیں۔ کشمکش میں کتنے ہی لمحے ریگ گئے۔ پھر وہ اپنی الماری کی طرف آئی، اپنے بیگ میں کل کارکھا ہوا میڈیکل رپورٹ والا لفافہ نکالا، پیڈ اور قلم لے کر وہ پھر بستر پر آ بیٹھی۔

”سعدیہ خیال تو تھا۔ یہ رپورٹ تمہیں رونمائی میں دیتی، لیکن ایک عورت پر شاید دنیا کا سب سے بڑا ظلم ہوتا۔“

ماجدہ۔“

لفافہ بند کر کے اس نے سعدیہ کا پیٹہ لکھا اور نوکر کو بلا کر اسی وقت پوسٹ کرنے کے لئے لفافہ دے دیا۔

نوکر کے جانے کے بعد اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ چہرے پر طمانیت کے آثار لہرائے، پھر اس کا سر جھک گیا۔ اس کی نگاہیں اپنی خالی گود پر پڑیں۔ خالی ویران اور سنسان گود پر۔

دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے زار زار رو رہی تھی۔

☆☆☆

بڑے گھر کی

اس نے اپنا گھونگھٹ ذرا سا سرکایا، جھکا ہوا سر اٹھا کر کمرے پر نگاہ ڈالی کمرہ خالی تھا۔ سب عورتیں اور لڑکیاں جا چکی تھیں۔

کچے فرش اور دھواں سی چھت والا یہ دالان نما کمرہ اس کا جملہ عروسی تھا۔ کچی دیواروں پر نیا نیا فیروزہ رنگ پھیرا ہوا تھا۔ سامنے کونے میں مٹی کا بڑا سا منگھ تھا جس پر کانسی کی گاردھری تھی۔ اسی دیوار کے ساتھ تین بوریاں غالباً گندم کی ہوں گی اوپر تلے پڑی تھیں۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ بڑا سا طاقوں والا صندوق تھا، جس پر پرانے سفید کپڑے کی کٹاؤ دار چادر پڑی تھی۔ دو پرانے ٹین کے صندوق بھی اس کے اوپر تلے رکھے تھے۔ ایک طرف کپڑوں کی گٹھڑی پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ کھونٹی کے ساتھ بھی ایک بڑی سی گٹھڑی لٹک رہی تھی۔ جس میں نئی دھنی روئی نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی دیوار سے کچھ کاغذی رنگین پھول بھی ہاروں کی صورت میں لٹک رہے تھے۔ اور دو ایک قطعے بھی بھدے بھدے فریموں میں آویزاں تھے..... صحن میں کھانے والی دونوں کھڑکیاں بوسیدہ تھیں۔ ایک کھڑکی میں سے لکڑی اس طرح ٹوٹی ہوئی تھی کہ باہر جھانکنے کو روزن سا بن گیا تھا۔ جملہ عروسی کے پیش نظر اس میں بڑا سا کپڑا اٹھونس دیا گیا تھا۔ اسی کھڑکی کے قریبی کونے میں ایک پرانی سی میز پر ایک لالٹین ٹمٹا رہی تھی۔ اور میز پر پڑے کروشیے کے رومال میں سے میز کی کالی سطح جھانک رہی

وہ جس چارپائی پر بیٹھی تھی وہ رنگین پایوں والی تھی۔ اور اس پر چوکور خانوں والا کھیس پڑا تھا۔ اس نے اپنے سرخ دھتے ہوئے جوڑے پر نظر ڈالی، گوٹے کے خوبصورت کام والا یہ جوڑا.....

اور یہ جملہ عروسی..... اس کے چہرے پر ناخوشگوار سے تاثرات پھیل گئے اور اس کی آنکھوں میں ماحول سے مطابقت نہ کرنے والا الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ اسے چھوٹے صاحب کی شادی کا خیال آ گیا۔ ان کا جملہ عروسی جہاں ہر چیز میں امیروں کی سی چمک تھی۔ ارغوانی قالین، ریشمی پردے، فوم کا بیڈ، بنوسی میز، گدے دار کرسیاں، اور پھولوں کی چادریں، رنگ و نور کا سیلاب تھے جیسے خوشبوؤں کی مہک جانفز تھی..... اف وہ کمرہ تھا یا جنت کا گوشہ..... اتنی رومانوی سی فضا ہو رہی تھی۔ وہاں تو آپوں آپ ٹوٹ کر محبت کرنے کو جی مچنے لگتا ہے اور وہ چھوٹے نواب صاحب، کنواری کی اچکن میں کیا کسی شہزادے سے کم لگ رہے تھے۔ کتنی نرمی، کتنی ملائمت تھی، ان کے سراپا میں، لیکن اس کے باوجود کتنے وجہہ، کیسے پروقار اور کتنے گرائڈل لگ رہے تھے۔

اس نے کئی شادیاں دیکھی تھیں، کچھ ایسے ہی شہزادہ نما دولہا ہوا کرتے تھے۔ نجوآ پا کے دولہا، شمو باجی کے دولہا..... اور..... اور کتنے ہی اور تھے۔ خاندان کی تقریباً ہر شادی میں وہ شامل ہوئی تھی۔ دولہا کا تصور اس کے ذہن میں نرم و ملائم وجہہ و باوقار جسم کے آدمی کا ہیولہ بن چکا تھا۔ لیکن آج..... آج جب اس کی برات آئی تھی تو سارہ بی بی نے اسے مذاق مذاق میں گھسیٹ کر اس کھڑکی میں کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں نیچے جن میں چند دیہاتیوں، مزدور نما مردوں اور سستے قسم کے چمکیلے کپڑوں میں ملبوس عورتوں میں گھرا اس کا دولہا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے دل نے پوری قوت سے غوطہ کھایا تھا۔ اس کا دماغ چکر اگیا تھا۔ دولہا کا خوبصورت تصور بکھر گیا تھا۔ یہ دھواں کھائی سی لکڑی کی طرح..... سخت سخت کرخت کرخت سا دولہا اس کا تھا..... اس کے ذہن نے یہ بات قبول ہی نہ کی اور وہ پاگلوں کی طرح سارہ بی بی کا خوبصورت چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

سارہ بی بی جو اس کے دولہا کی تعریف کر رہی تھی۔ وہ لہراتی لہراتی پھر رہی تھیں۔ اور اس پلنگ پر آ بیٹھی تھیں جہاں اس کا سرخ گوٹے والا جوڑا پڑا تھا اور جہاں ابھی کچھ دیر پہلے نجوآ پا۔ شمو باجی، فائزہ، ملیحہ اور گھر کی دیگر عورتیں اور لڑکیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ نازک نازک، نرم نرم، گداز گداز عورتیں اور لڑکیاں..... پلنگ پر بیٹھے ہوئے اس کی نظر سامنے والے قد آدم آئینے پر پڑی تھی۔ اپنی چمکتی ہوئی سانولی رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ کوئی خوبصورت لڑکی نہیں ہے۔ اسی احساس کے ساتھ اس نے دولہا کا کرچی کرچی تصور سمیٹ لینا چاہا تھا اور سارہ بی بی کی تعریفی باتوں کے سہارے دل کو تسلی دے لی تھی۔

لیکن یہ تسلیاں وہ کہاں کہاں دے لیتی۔ ابھی ابھی اس کے سسرالی رشتہ دار عورتیں اور جوان لڑکیاں اسے اس جملہ عروسی میں بٹھا کر گئی تھیں۔ یہ جملہ عروسی جسے اس کا ذہن کسی طرح بھی جملہ عروسی قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور یہ سب عورتیں..... گھنٹہ بھر اس کا دماغ چاٹتی رہی تھیں۔ اس کا ذہن دھچکے کھا رہا تھا۔ اور اسے بار بار ان گنت شادیوں پر دیکھی سسرالی عورتیں یاد آ رہی تھیں۔ نجوآ پا کی سسرالی عورتیں کیا طرح دار عورتیں تھیں۔ بھاری بھاری قیمتی ساڑھیاں، غرارے، فلپیر، منی مڈل اور میکسیووں پر کا مدانی اور ستاروں بھری کام، ترشے بال، بڑے بڑے جوڑے، وگس اور ان سب کے ساتھ ساتھ ان کی نرم نرم، شائستہ شائستہ باتیں، لیکن ابھی ابھی جو عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جو لڑکیاں اس پر گری پڑتی تھیں۔ جو بچے اس کی گود میں گھسے آ رہے تھے۔ سب کو دیکھ کر تو اس کا دل کراہت کھانے لگا تھا۔ عورتیں جو کالی کالی سی تھیں۔ تنگی اور سختی ان کے کرخت چہروں سے عیاں تھی۔ جو دو ایک بچوں کو جنم دینے کے بعد عمر کے کئی سال پھلانگ کر ادھیڑ عمر تک پہنچی ہوئی دکھائی دیتی تھیں جن کے بدن ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ جن کی چھاتیاں پیٹ تک لٹکی ہوئی تھیں چند ایک کے سوا سبھی کے کپڑے میلے تھے۔ بوسیدہ، پراسراری سرانڈ لئے ہوئے..... اور ان سب کی باتوں کا انداز..... کتنا چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھیں، کیسے بے ہودہ اور بھونڈے انداز میں مذاق کر رہی تھیں۔ سہاگ رات کی

باتیں کس بے باکی سے اسے سنارہی تھیں۔ شرمانے کی بجائے وہ خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔
اس کا ذہن پھر ان عورتوں کا موازنہ فائزہ کی شادی پر جمع ہونے والی عورتوں سے
کر رہا تھا۔ فائزہ جب لال ٹشو کے بھاری سوٹ میں گھڑی بنی فوم کے خوبصورت بیڈ پر
بیٹھی تھی تو نوجوان سہاگنیں اسے مذاق میں چھیڑ رہی تھیں..... کتنی شائستگی سے کتنے بیٹھے
اور سہانے انداز میں..... اور جب فائزہ شرماکر اور گھڑی بن جاتی تو ان عورتوں کے
لطیف قہقہے کس سلیقے سے کمرے میں بکھر جاتے تھے۔ ہنسی کی پھوار کتنی نرمی اور کیسے تسلسل
سے پڑنے لگتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی..... اس والا نرما کمرے میں
دائیں ہاتھ کی بڑی دیوار پر لکڑی کی کھونٹی پر نئے پرانے کپڑے ٹنگے تھے۔ ایک لکڑی
کے پرانے صندوق کے اوپر کچھ کھیس اور میلے میلے غلافوں والے دو تکیے بھی رکھے تھے۔
اسی دیوار کے ساتھ ایک اور چارپائی بھی پڑی تھی۔ جس پر نیا کھیس اور سائٹن کے غلاف
والا تکیہ پڑا تھا۔ یہ بستر..... اور اس کا دولہا..... گھبرا کر اس نے اپنا سر تھام لیا..... اور
اس کا تصور پھر اسے اس جہازی سائز محل نما کونٹھی کی طرف لے گیا۔ جس کے ہر بیڈ روم
میں فوم کے نرم و گداز بیڈ تھے..... اور جہاں چھوٹے صاحب، شکیل بھیا اور انور
صاحب جیسے شکیل، خوب رو باوقار وجہہ مرد تھے..... اور جس میں اس نے زندگی کے گیارہ
سال گزارے تھے۔

وہ پانچ چھ برس کی تھی، جب اس کا مزدور باپ لکڑی کی سیڑھی سے پھسل کر چل بسا
تھا۔ بیوہ ماں پر بوڑھی ساس، جوان نندا اور دو بچیوں کا بار آں پڑا تھا۔ فکر معاش تو پہلے
بھی جان لیوا تھا۔ لیکن اب تو معاملہ ہی بگڑ گیا تھا..... ماں نوکری پہلے بھی کرتی تھی۔ لیکن
اب تو دن رات کام کر کے بھی بمشکل گزر رہی تھی۔ انہیں کسمپرسی کے دنوں میں وہ کسی
خانسا ماں کی وساطت سے اس جہازی سائز کی کونٹھی میں کپڑے دھونے پر مامور ہو گئی۔
یہ امیر کبیر بھرا پرانہ شہر کے چوٹی کے گھرانوں میں سے تھا۔ معقول پیسے کے ساتھ
کھانا اور کپڑا بھی میسر آنے لگا۔ دولت کے ساتھ ساتھ یہاں شرافت بھی تھی۔ بڑی

بیگم اپنے چار بیٹوں دو بہوؤں اور تین بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اور خوبصورت
چمنوں میں پھول سے بچوں کو رنگ برنگے، پیارے پیارے کپڑے پہنے کھیلتے دیکھا
کرتی تھی۔ یہیں سے اس کی دوستی سائرہ بی بی سے ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر جو تھی۔
دوستی اتنی بڑھی کہ سائرہ بی بی نے رات کو بھی اسے اپنے پاس ٹھہرنے پر ضد شروع کر
دی۔ سب سے چھوٹی اور انتہائی لاڈلی بیٹی تھی۔ ضد پوری کیونکر نہ ہوتی۔ بڑی بیگم نے
اسے بھی باقاعدہ ملازمت میں لے لیا۔ وہ اب دن رات کونٹھی میں ہی رہنے لگی۔ اسے
نہیں پتہ تھا کہ اس کی ماں اس کی کتنی تنخواہ وصول کرتی ہے۔ اسے تو صرف اس بات کی
خوشی تھی کہ اب وہ بڑی پیاری جگہ پر رہتی ہے۔ اور اس کے پاس سائرہ بی بی کی
خوبصورت فراک، سویٹر ٹریس اور جوتے ہیں..... سائرہ بی بی کی سب اتریں اسے ہی تو
ملا کرتی تھیں۔ اس کے ذمے کام کوئی خاص تو نہیں تھا۔ پھر بھی اسے بڑے بھیا کے
دوسرے بیٹے منو میاں کو کھلانے میں بڑا مزہ ملتا تھا۔ گول مٹول سال بھر کا بچہ اٹھائے
پھرنے میں اسے بڑا سرور ملتا تھا۔ اور یوں بھی جب شام سارے بچے گاڑی میں بھر کر
سیر کو جاتے تو موٹر میں بیٹھنے کا اس کے پاس معقول بہانہ ہوتا۔ وہ منو میاں کو بغل میں دبا
نرم نرم گدوں والی موٹر میں جا گھستی۔ اسے موٹر میں بیٹھنے کا اتنا مزہ ملتا کہ کبھی اماں کی گود
میں بھی نہ ملتا۔ بڑی بہو کو بھی بچے کی کھلائی مل گئی تھی۔ وہ بھی اس کا خاص خیال رکھنے لگی
تھیں۔ چونکہ ان کا بچہ اس کے پاس رہتا تھا۔ اس لئے اس کی صفائی ستھرائی کا وہ خود
خیال رکھتیں۔ کپڑے ہمیشہ صاف پہنا تیں بالوں میں کنگھی کا روز حکم تھا۔ دانت صاف
کرنے کے لئے انہوں نے خاص طور پر اسے الگ منجن دیا تھا۔ صابن تولیہ اور کنگھی بھی
الگ دے دیئے تھے۔ ننگے پاؤں پھرنے کی عادت تو اسے بھول ہی گئی تھی۔

ماہ و سال گزرتے گئے۔ اور وہ کونٹھی کے امیر کبیر بچوں کے ساتھ پلتی بڑھتی
رہی..... وقت کے ساتھ ساتھ کام بھی بدلتے رہے۔ منو میاں بڑے ہو گئے۔ تو اس کی
دیکھ بھال اس کے سپرد ہوئی۔ پھر بچوں کے کپڑے دھونے اور استری کرنے کا کام
سپرد ہوا..... پھر سب بچوں کی وہ وارڈن بنادی گئی۔ گھر میں کئی نوکر پہلے موجود تھے۔

بیرہ، خانساں، مالی، جعدار..... اس کے ذمے کوئی بڑا کام کبھی نہ آیا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے کاموں کی نگرانی کرتے کرتے وہ بڑی ہوتی گئی۔ کچھ بڑی بیگم کا جذبہ ترحم تھا۔ کچھ سارہ بی بی کی دوستی۔ اسے نوکر ہونے کا احساس ہوا نہ دلایا گیا۔ ایک مرکزی حیثیت لئے وہ نوکروں میں شامل رہی۔ اور گھروالوں میں بھی۔

وہ بارہ تیرہ برس کی تھی۔ جب کسی نوکر نے اس سے غیر شائستہ سا مذاق کیا تھا۔ اس نے بڑی بیگم کو بتایا تھا۔ تو جیسے طوفان بپھر گیا تھا۔ اسی وقت اس نوکر کو برطرف کر دیا گیا تھا اور اسے کوارٹر میں مالی بابا اور اس کے بچوں کے ساتھ رکھنے کی بجائے کوٹھی کے اندر لے آیا گیا تھا۔ اب وہ بڑی بیگم کے پاس ہی رہتی تھی۔ انہی کے چھوٹے موٹے کام کرتی۔ بستر صاف ستھرا رکھتی۔ کرسیاں برابر کرتی، الماری میں کپڑے استری کر کے لٹکا دیتی۔ اور رات بیگم کے پاؤں دباتے دباتے انہی کے کمرے میں سو جاتی۔

یہاں ملازمت کے بعد یہ اس کی زندگی کا دوسرا خوشگوار تجربہ تھا۔ اتنا خوبصورت آراستہ کمرہ جو سردیوں میں بڑے سے ہیٹر سے گرم رہتا۔ اور گرمیوں میں ایئر کنڈیشنڈ سے ٹھنڈا رکھا جاتا..... اس کا مسکن تھا۔ کام میں اس نے کوتاہی کبھی برتی نہ تھی۔ برق کی سی تیزی سے کام کرتی۔ بڑی بیگم کو اس کی یہی ادا پسند تھی۔ اس کی وجہ سے انہیں آرام مل رہا تھا۔ ورنہ بیٹے بیٹیاں تو اپنی زندگی میں بٹ چکے تھے۔ وہی ان کے لئے سکون فراہم کر رہی تھی..... سارہ بی بی سے تھوڑا تھوڑا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ ذہانت قدرتی تھی۔ وہ اس ضمن میں بھی مراحل طے کرتی گئی۔ اور اب اخبار رسالے پڑھ کر بڑی بیگم کو سنانا اس کا مشغلہ تھا..... اور غیر محسوس طریق سے وہ بہت کچھ سیکھتی بھی چلی جا رہی تھی۔ اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ دنیا کس رنگ میں تھی۔ کن حالات میں گزر رہی تھی۔ سیاسی چکر کیسے چل رہے تھے۔ حکومتیں کیسے بن گز رہی تھیں۔ اسے سب معلوم تھا۔ یہ معلومات کچھ اس طرح بھی بڑھ جاتیں کہ جب سب اہل خانہ کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرتے ہوتے۔ کوئی سیاسی نقطہ زیر بحث ہوتا۔ کوئی ملکی حادثہ موضوع بحث ہوتا تو وہ بھی سن سن کر اپنے حافظے میں ہر بات منتقل کر لیتی۔

سارہ بی بی کی سہیلیاں آتیں یا سہیلیوں کے ہاں جاتی تو اس کا بیگ اٹھائے وہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ گھر پر ان کی سہیلیوں کی مدارات اسی کے ذمے تھیں۔ اسے وقت کے اعتبار سے خاطر مدارات کا سلیقہ آ گیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ چائے کس وقت پیش کرنا ہے۔ مشروب کس وقت، ٹرائی سجانا اسے بے حد مرغوب تھا اور پھر سہیلیوں کی قربت میں اس نے پنجابی، اردو، انگریزی فلموں پر بحث و تنقید بھی سیکھ لی تھی۔ سارہ بی بی اسے کبھی کبھی فلم دیکھایا کرتی تھی۔ لیکن اس کی معلومات یہاں بھی تازہ ترین تھیں۔ پھر گھر میں ٹی وی بھی تھا۔ اسے ہر پروگرام کا علم تھا۔ انگریزی کے سلسلہ وار پروگرام تو اسے از بر یاد تھے۔ وہ یہاں تک بھی سوچ سکتی تھی کہ ہمارے معاشرے کے لئے کون سی انگریزی فلمیں سم قاتل ہیں۔

اس کے لئے رمضان کا رشتہ خوش بختی قرار دیا گیا تھا۔ گلاس فیکٹری میں دو ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والا رمضان جس کے پاس شہر کے قریبی گاؤں میں اپنا ذاتی گھر بھی تھا۔ اور جس کے گھر میں ہر وقت بوری دو بوری گندم اور چاول موجود رہتے تھے..... سب کی نظر میں بڑا موزوں اور اچھا رشتہ تھا۔ جہی تو سارے خاندان والے اس شادی میں ہاتھ بٹانے کو پیش پیش تھے۔ کسی نے کپڑے بنا دیئے۔ کسی نے برتن، کوئی پلنگ لے آیا تھا۔ اور کوئی بستر مجو آپانے سونے کی بالیاں دی تھیں۔ چھوٹی بھابی نے دو جوڑے بنائے تھے۔ مل ملا کر خاصا جہیز بن گیا تھا۔ بڑی بیگم نے بارات کی خاطر مدارت کی تھی۔ سارہ بی بی نے یہ سرخ گوٹے والا جوڑا کتنی چاہت سے بنا کر دیا تھا۔ لیکن..... لیکن..... جیسے وہ کسی آزمائش سے دوچار تھی۔ اس گھر کو وہ ذہنی طور پر قبول نہ کر سکتی تھی..... دونوں ہاتھوں میں سر تھا اس کی حالت کسی مغویہ کی سی تھی..... اور پھر رات بھر دھواں کھائی لکڑی کے سے شوہر کے ساتھ اسے یہی احساس ہوتا رہا، جیسے اس پر جبر کیا جا رہا ہے۔ اسے نوچا کھوٹا جا رہا ہے۔ دلہن کے خواب چکنا چور تھے۔ اور ہر طرف بکھری کرچیوں سے وہ لہو لہان تھی۔

صبح جب اس کی بیابھی نندوں اور جھانیوں نے اسے رات کی روئیداد سنانے کو

گدگدایا تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہر اسانی کے سائے کانپ گئے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اور جب اسی کمرے کے ایک کونے میں جہاں ذرا سا پکا فرش تھا۔ اسے نہانے کے لئے بالٹی بھر پانی دے کر وہ سب ہنستی کھلکھلاتی باہر چلی گئیں۔ تو وہ دیوانوں کی طرح اس غسل خانے کو دیکھتی رہی۔ وہ تو ایک مدت سے بڑی بیگم ہی کے غسل خانے میں نہایا کرتی تھی۔ چکنے چکنے ٹانگوں والا غسل خانہ، چمکیلے بیسن..... فوارہ..... ٹل..... اف..... اس کا دماغ چکر اگیا۔ وہ بے بس ہو گئی اور اس کے اندر کھڑی سائرہ بی بی، نجوآ پا اور فائزہ تعاون کے لئے قطعی تیار نہیں تھیں۔

وہ کیا کرے گی؟ وہ کیا کرے گی؟ سر ہاتھوں میں تھامے وہ سوچتی رہی۔ اس زنداں میں زندگی کیسے کئے گی۔ زندگی کے لوازمات جن کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ کہاں سے پائے گی۔ اپنے جلا پائے ذہن کو پھر کیسے دھندلائے گی۔ اس کا جی چاہا..... یہاں سے بھاگ جائے..... اس سخت و کرخت دنیا سے نکل کر پھر اپنی اسی نرم و ملائم دنیا میں پہنچ جائے..... لیکن.....

وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ دنیا اس کی ہے..... یا وہ..... وہاں تو وہ ملازمہ تھی..... اور یہاں مالکہ..... لیکن اس ملازمت کا کبھی کسی نے اسے احساس ہی کب دلیا تھا۔ اسے بڑی بیگم پر غصہ آنے لگا..... اس نے سائرہ بی بی کو بھی کوس ڈالا..... نجوآ پا، فائزہ اور چھوٹی بیگم سبھی کو اس نے دل ہی دل میں کوس ڈالا۔ لیکن اس سے اس کی ذہنی کوفت کم نہ ہوئی۔ ان بے چاروں کا کیا قصور..... ان کی شفقتیں اتنی کم تو نہ تھیں کہ کونے دینے سے یہ بار ہلکا ہو سکتا۔

وہ سارا دن گم صم رہی۔ اس کے چہرے پر نئی سہاگن کی ضوفشانی نہ تھی۔ وہاں تو کسی حرماں نصیب بیوہ کا سناٹا تھا۔ نفرت و بیزاری کا احساس اس پر چھایا ہوا تھا۔ یہاں کی ہر چیز ہر بات اس کی ذہنی سطح سے کم تھی۔ اس سے کھانا بھی نہ کھایا جاسکا۔ سفید مٹی کے پیالے میں سالن اور میلی سی چنگیر میں رکھی تنوری روٹی..... پیتل کے لائبے سے گلاس میں لسی..... اس کا جی چاہا تھا ہر چیز کو الٹ دے۔ توڑ پھوڑ ڈالے۔ ملیا میٹ

کر دے کیا دلہن کی خاطر داری ایسی ہوتی ہے؟ اس نے جلد دل و دماغ سے سوچا۔ اور پھر ٹشو کے چوڑے چوڑے غراروں، کا مدار و پنوں اور طلائی کھٹکتے زیورات سے لدی دلہنیں اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ ان کی خاطر داریاں ناز برداریاں.....

لیکن اچانک اور بالکل اچانک اس کی نظروں میں اپنا آپ گھوم گیا۔ وہ دلہن بھی تو ایسی نہ تھی۔ چمکیلی، سانولی، کلائیوں پر کانچ کی سرخ چوڑیاں، پیتل کی دواگوٹھیاں..... کانوں میں نجوآ پا کے دیئے ہوئے بندے، بدن پر چھوٹی بیگم کا دیا ہوا جوڑا..... پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ..... وہ سائرہ، نجوآ فائزہ نہیں بشیراں ہے۔ بشیراں جو ایک بیوہ ماں کی بیٹی اور جو ایک بڑے گھر کی بیٹی نہیں..... ملازمہ ہے..... نوکرانی ہے خدمت گار ہے۔ اسے بڑے گھر کی بیٹی کے سے انداز میں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔

اور پھر وہ شام تک اسی انداز میں سوچتی رہی۔ اس کے خیالات ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ اس نے عہد کر لیا کہ وہ اپنے آپ کو اسی ماحول میں ڈھال لے گی۔ اس کی ماں ایک غریب بیوہ تھی۔ اس سے تو یہاں کی حالت بہت بہتر تھی۔ وہ بگلی یہاں کا موازنہ اس جہازی ساز کی کوشی اور وہاں کے ماحول سے خواہ مخواہ ہی کر رہی تھی..... ہزاروں لاکھوں دلیلیں دے کر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لینا چاہا..... شام اس نے روٹی بھی کھالی..... نوالے حلق میں پھنستے رہے اور وہ ہونٹوں پر لہو لہان سی مسکراہٹ لئے کھانا کھاتی رہی..... رات اس نے رمضان کو بھی مسکرا کر دیکھا۔ وجیہہ و شکیل دو لہے اس کی نظروں کی آڑ میں آتے رہے۔ لیکن وہ ان تصوراتی دولہوں کو کچلتے ہوئے رمضان کے قریب آتی گئی۔

صبح اس کا شوہر بہت ہشاش بشاش تھا، خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اس کی خوشی کے لئے اس نے کتنے بھلاوے، کتنے فریب، کتنے دھوکے دیئے تھے اپنے آپ کو۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اوپر خول چڑھانے میں کامیاب ہو تو گئی تھی۔ اگلے دن اس کی ماں اور پھوپھی اس سے ملنے آ گئیں۔ سیر بھر مٹھائی کا ڈبہ ساتھ لئے، جب وہ اس کے کمرے میں آئیں تو اسے ایک بار پھر بڑے گھروں کا جھٹکا لگا۔ لیکن جلد ہی وہ سنہیل

آئیڈیل

”نہیں تو کیا؟“ ماں کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے بشر اں کا کندھا جھنجھوڑ ڈالا۔
”نہیں تو..... نہیں تو صابر اں کے خول میں بھی سائرہ گھس جائے گی ماں اسے
صرف صابر اں ہی رہنے دو..... صابر اں ہی رہنے دو.....“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی۔
ماں اور پھوپھی پاگلوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

آئیڈیل

گئی، سیروں مٹھائیاں، ڈھیروں پھل، بھلا اس کی غریب ماں کے پاس کہاں سے
آ جاتا۔
ماں نے بڑے پیار سے اسے گلے لگایا۔ اس کے انداز میں تفاخر کی جھلک بھی تھی۔
بشر اں کو اس نے اتنے اچھے گھر میں بیاہ دیا تھا۔ چار پائی پر بیٹھے بیٹھے وہ اس کمرے کا
جائزہ لے رہی تھی، جس میں گندم اور چاول کی بوریاں تھیں۔ پیتل کے برتن تھے۔
طاقتوں کا بڑا بکس تھا۔ اور رنگین پائیوں والی چار پائیاں تھیں۔
ماں سرگوشی کے انداز میں بڑے فخر سے اپنی نند کو سب کچھ بتا رہی تھی اور بشر اں
کھوئی کھوئی اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔
اچانک اسے اپنی چھوٹی بہن کا خیال آ گیا۔
”ماں صابر اں کو بھی لے آتیں۔“ اس نے ماں کی طرف شاکی نظروں سے
دیکھا۔

”وہ کوٹھی گئی ہوئی تھی۔“ ماں نے ایک شان استغنا سے مسکرا کر کہا۔
”کیوں؟“ بشر اں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
”تمہاری جگہ بڑی بیگم نے اسے رکھ لیا ہے.....“ ماں ہنسی۔
”ماں.....!“ بشر اں ایک دم چیخی۔ ”اسے کیوں بھیج دیا وہاں.....“
”کیوں؟ کیا ہوا بیٹی.....“ ماں اور پھوپھی دونوں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔
”اسے واپس بلا لو ماں..... اسے واپس بلا لو..... خدا کے لئے اسے واپس بلا لو۔“
بشر اں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
”بشر اں“ ماں گھبرا گئی۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ہراساں نظروں سے
اسے دیکھنے لگی۔
”ابھی جا کر اسے واپس لے آؤ ماں..... اسے وہاں نہ بھیجنا..... خدا کے لئے
وہاں نہ بھیجنا، نہیں تو.....“ بشر اں کہتے کہتے پھوٹ پڑی۔ دوسرے لمحے وہ ہاتھوں میں
منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

اسے تلخی حالات کی کڑواہٹ حلق میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ کاش اس کا شوہر اسے یوں کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں نہ موندھ لیتا۔ زندگی غیر آسودہ تو جب بھی تھی لیکن پھر بھی گراں ذمہ داریوں کا بوجھ تو دونوں میں بٹا ہوا تھا۔ اب تو اس کے ناتواں کندھوں پر بوڑھی بیمار اور کراہتی ساس کا بوجھ تھا۔ اس معصوم بچے کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ مشین بھی نہ ہوتی تو دن گزارنا مشکل ہوتے۔

اسلام پورہ میں چند مختیر لوگوں کے ہاں اس کا آنا جانا تھا جن کے کپڑے سی کر وہ گزر اوقات کر رہی تھی اسی سلائی پر اس کے صبح و شام بیت رہے تھے وہ دن رات تن دہی سے اس کام میں جٹی تھی آبرو سے دن گزر رہے تھے۔ اس کی جوانی مشین کی گھر گھر میں بیتی جا رہی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ گوشت پوست کی بنی عورت ہے جس میں قیامت خیز جوانی ڈھلی ہوئی ہے اس کا وقت تو ساس کی کھوں کھوں سنتے یا بچے کی معصوم اور شگفتہ باتیں سنتے بیت رہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا سہارا یہی معصوم بچہ تھا۔ یہی روشنی تھی جو تاریک راہوں کو جگمگائے تھی۔

یہ بچہ بھی نہ ہوتا تو زندگی اتنا بڑا عذاب ہوتی کہ اس سے نبھاہ کر لینا ممکن ہی نہ ہوتا۔ وقت گزرتا رہا۔ اور بس آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ پتھر یلے بچ خالی تو تھے، لیکن ان پر بیٹھنے کو اس کا جی مطلقاً نہ چاہ رہا تھا۔ ایک بچ پر تو کسی نے قے کی ہوئی تھی۔ جس پر کھیاں ٹوٹ پڑی تھیں۔ دوسرے پر بھی کھائے ہوئے پھلوں کے چھلکے، سگریٹوں کے جلے ادھ جلے ٹکڑے اور تڑے مڑے کاغذ پڑے تھے۔ ذرا سی جگہ صاف تھی۔ جہاں اس نے سلعے ہوئے کپڑے کی گٹھڑی لٹکا رکھی تھی۔

یہ گٹھڑی اس نے آج ہی پہنچانا تھی۔

دو ٹیکسیاں اور ایک کالی موٹر آگے پیچھے گزریں۔ اس نے حسرت بھری نگاہ ان پر ڈالی۔ ایک ٹیکسی تو خالی بھی تھی اور ٹیکسی ڈرائیور نے اسے منتظر دیکھ کر رفتار ڈرا دھیمی بھی کر دی تھی۔ لیکن ٹیکسی کے لئے اس کے پاس پیسے کہاں تھے۔ اس کے پلوں میں تو آخری

ماموں

اپنے تین سالہ بچے کی انگلی پکڑے وہ بس اسٹاپ پر کھڑی اسلام پورہ جانے والی بس کا انتظار کر رہی تھی سلعے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑی اس نے بس اسٹاپ کے پتھر یلے بچ پر ایک طرف کو رکھی ہوئی تھی۔

دو تین عورتیں اور مرد جو اس کے ساتھ ہی کھڑے تھے ابھی ابھی اوپر تلے آنے والی دونوں بسوں میں بھاگ دوڑ کر سوار ہو گئے تھے۔ وہ بھی لپکی تھی لیکن گٹھڑی اٹھانے اور بچے کو گھسیٹ کر سڑک تک لانے میں بیس نکل گئی تھیں۔ دونوں بار اس نے جدوجہد کی تھی، لیکن ناکام ہو کر لوٹ آئی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا رہا تھا اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اب وہ یہاں اکیلی کھڑی تھی۔ یہ شہر کا نسبتاً ویران حصہ تھا۔ جہاں یہ چھوٹا سا بس اسٹاپ تھا جس پر ارد گرد کی کچی بستیوں میں رہنے والے غریب اور مفلوک الحال لوگ ہی آیا کرتے تھے۔

اسے اس وقت پریشانی تنہائی کی نہ تھی۔ نہ ہی اسے سنسان سڑک سے خوف آ رہا تھا۔ خائف تو وہ وقت کے احساس سے تھی۔ اسلام پورہ جانا اور پھر شام سے پہلے اسے واپس آنا تھا۔ وہ کئی بار سڑک پر آ کر متوقع نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ لیکن ہر بار دو تین ٹیکسیاں، ایک آدھ موٹر اور چھکڑا نما تانگے آئے تھے اور گزر رہے تھے۔

بس تھی کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ جھنجھلاہٹ اس کے اعصاب پر سوار تھی۔

چوٹی بندھی تھی جو اس نے ٹکٹ خریدنے کو احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ کاش اس کے پاس ٹیکسی کے لئے دو روپے ہوتے۔ اس کے ذہن میں یہ خواہش مچلی، لیکن دوسرے لمحے اس کے سوکھے ہونٹوں پر زہر آلود تبسم کھل گیا۔ ٹیکسی میں جانے کی استطاعت ہوتی تو اس محنت مزدوری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے تلخی سے سوچتے ہوئے تھوک نگلی۔ اور اس کے ذہن میں اس کا غیر آسودہ ماضی اور غیر یقینی حال گھوم گیا۔ مستقبل کے بارے میں تو اسے سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اتنی تنخیاں گھلی ہوئی تھیں ان ایام میں کہ کسی اچھے دن کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔

ایک گہری آہ بھرتے ہوئے اس نے گٹھڑی اٹھائی بچے کی انگلی پکڑی اور آہستہ آہستہ چلتی سڑک کے اوپر آگئی دو فرلانگ کا راستہ چل کر پیچھے بس اسٹاپ پر پہنچنا تو مشکل نظر آیا، لیکن وہ قدرے بڑا اسٹاپ تھا۔ وہاں سے بس ملنے کی توقع غالب تھی۔ سڑک کی ویرانی اور بس اسٹاپ کا سناٹا اسے اب ڈسنے لگا تھا۔

وہی کالی موٹر جو کچھ دیر پہلے مخالف سمت کو گئی تھی۔ اب پھر زن سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے اس موٹر کو دیکھا لوگوں کے لئے زندگی کتنی سہل، کتنی آسودہ اور کتنی دل فریب تھی۔

سرمئی سڑک کے کنارے لگے اونچے اونچے درختوں کے سائے تلے وہ تھکے تھکے بوجھل بوجھل قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ بچہ ماں کا ساتھ دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ وہ منہ بسور رہا تھا، کبھی بھوک کا بہانہ بنا رہا تھا، کبھی پیاس کا، اور وہ جھوٹے بہلاوے دے دے کر اسے قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

جھوٹی تسلیاں اور خوش کن بہلاؤں کے سہارے بچہ بمشکل چند قدم اور چل سکا۔ پھر اس کی ہمت شائد جواب دے گئی۔ آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ اس نے ماں کا پلو پکڑ کر لجاجت سے اسے دیکھا۔

”مجھے اٹھا لو۔“

اس نے بچے کو پکڑا ”دیکھو اتنی بڑی گٹھڑی میں نے اٹھا رکھی ہے، بیس روپے

ملیں گے، پھر میں تمہارے لئے خوبصورت کھلونے لاؤں گی، دادی اماں کے لئے دوائی لوں گی رات کو کھانا پکاؤں گی اور اپنے منے کو کھلاؤں گی۔

لیکن بچہ گڑ کر رونے لگا۔ مجبور ہو کر اسے اٹھانا پڑا۔ اسے کندھے سے لگایا اور دوسرے ہاتھ میں بوجھل گٹھڑی تھامے ہوئے اس نے آسمان کی طرف حسرت سے دیکھا لیکن حسرت پریشانی بن گئی۔ شمال کی جانب سے آسمان ٹیلا ہورہا تھا۔ خوفناک آندھی اٹھ رہی تھی۔ دور سرمئی سڑک پر بگولے سے بھی ناچ رہے تھے۔ طوفان گرد و باد کی آمد پر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کاش وہ بس اسٹاپ پر ہی کھڑی رہتی۔ کچھ تو پناہ ملتی۔

فضا کی گٹھن اور اونچے لائے درختوں کا سکوت بتا رہا تھا کہ طوفان امنڈ رہا ہے سوئے ہوئے بچے کو کندھے سے لٹا کر اور ہاتھ میں گٹھڑی لٹکا کر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ بھاگ بھاگ بھی جاتی تو طوفانی جھکڑا سے راستے میں آلیتے۔ بے بسی سے وہ کھڑی ہو کر درختوں کے درمیان تساہل سے لیٹی سرمئی سڑک کو دیکھنے لگی۔ کوئی تانگہ، کوئی گاڑی کوئی انسان آتا دکھائی نہیں دیا۔

پیچھے سے آنے والی گاڑی کی آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا وہی کالی گاڑی غالباً تیسری بار اسے نظر آئی۔ اس نے دل میں اسے ہاتھ دے کر روکنے کا سوچا۔ کم از کم یہ گاڑی اسے بس اسٹاپ تک تو پہنچا سکتی تھی۔ لیکن جرأت و ہمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر گاڑی کو روکنے کا اشارہ نہ کر سکی اور گاڑی قریب سے گزر گئی۔ لیکن گاڑی میں بیٹھے مرد نے شاید اس کے چہرے پر جلتے بجھتے تاثرات دیکھ لئے تھے۔ ذرا آگے جا کر گاڑی ایک چرچراہٹ سے رک گئی۔ ایک نوجوان مرد نے کھڑکی سے سر نکال کر اسے دیکھا اور پھر گاڑی موڑے بغیر اسے پیچھے دھکیل لایا۔ اس کے قریب آ کر رکتے ہوئے اس نے اس کے سراپا پر نگاہ ڈالی۔

”تمہیں کہاں جانا ہے۔“ اس نے شرافت سے پوچھا۔

”وہ پہلے تو گھبرائی، پھر جھجکی، لیکن جب اس مرد نے شائستگی سے پوچھا۔“

آئیڈیل
 ”کہاں جانا ہے“ میں تمہیں پہنچاؤں گا۔ غالباً تم گھنٹہ بھر سے بس اسٹاپ پر کھڑی ہو۔“
 ”جی“ اس کی گھبراہٹ بے بسی میں ڈھل گئی۔ ”بس نہیں آرہی۔ اور اب یہ طوفان۔“

مرد نے گاڑی کا پچھلا دروازہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مڑ کر کھولا۔ ”میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں“ کہاں جانا ہے؟“
 ”اسلام پورے“

”میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں“ آؤ بیٹھ جاؤ۔“
 وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی کبھی گاڑی کو دیکھتی رہی کبھی سرمئی سڑک کو جہاں سے بس آنے کی توقع تھی۔

”..... جانا ہے تو بیٹھ جاؤ..... ورنہ میں چلا۔ بس شاید گھنٹہ بھر اور نہ آئے۔ آندھی طوفان امنڈ رہے ہیں۔“ مرد نے لا پرواہی سے کہا اور گاڑی کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ دیئے۔ غالباً وہ جا رہا تھا۔

آندھی کا ایک چیخا ہوا ریلا آیا۔ دھول فضا میں غبار بن کر پھیل گئی۔ درخت چیخنے لگے سڑک کے کنارے پر ریت اور مٹی بل کھا کھا کر اڑنے لگی۔ وہ ایک ایک کی گاڑی کی طرف لپکی اور گھڑی اندر سیٹ پر پھینکتے ہوئے خود بھی بچے سمیت گاڑی میں آ بیٹھی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ بدن لرز رہا تھا۔ چہرے پر خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ لیکن مرد کے شریفانہ انداز تخاطب اور شائستگی کے بھروسے وہ گاڑی میں بیٹھی تھی بچے کو اس نے سیٹ پر لٹا دیا اور اپنے تھکے ہوئے کندھے کو دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگی۔

مرد نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور گاڑی چلا دی۔
 طوفان گرد و باد امنڈ پڑا تھا۔ خوفناک آندھی پھیل چکی تھی۔ آسمان سنولا گیا تھا اور مٹی کا غبار اتنا گہرا ہو گیا کہ مرد کو موٹر چلانا مشکل ہو گیا۔ انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس نے رفتار دھیمی کر دی۔

”بڑا خوفناک طوفان ہے۔“ مرد نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

آئیڈیل
 وہ سہمی سہمی بیٹھی رہی، اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ مرد کی نگاہ اچانک موٹر کے آئینے پر پڑی پچھلی سیٹ پر ہراساں بیٹھی وہ آئینے میں صاف طور پر نظر آرہی تھی۔ اس کا لمبل کا دوپٹہ اس کے وجود سے چپکا ہوا تھا۔ اور جسم کے نشیب و فراز دوپٹے کے چپکنے سے کچھ نمایاں کچھ اجاگر ہو گئے تھے۔

مرد کی نگاہ ان نشیبوں ان فرازوں میں الجھ سی گئی ایک لمحے کو اسے موٹر چلانا جیسے بھول گیا۔ ایک دم پلٹ کر اس نے اس پر نگاہ ڈالی۔ گاڑی کے چلنے سے اس کا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ یہ لرزش کتنی جذبات انگیز تھی۔ مرد نے اپنے سارے جسم میں سرور کی لہریں سی اٹھتی محسوس کیں۔

اس نے پھر آئینے پر نگاہ ڈالی اور چپکے چپکے لرزش کے جذبات انگیز عکس کو چرانے لگا۔ ایک جوان عورت کے قرب کا تلذذ وہ اپنے ذہن سے جدا نہ کر سکا۔ ایک اہلیسانہ خیال اس کے جسم کے اندر انگڑائیاں لینے لگا۔ اس لمحے وہ یکسر بدل گیا۔

طوفان خوفناک حد تک بڑھ چکا تھا اور اس سے بھیانک طوفان اس کے اندر جاگ اٹھا تھا۔ دھیمی رفتار سے چلتی موٹر کے آئینے پر اس نے پھر نگاہ ڈالی۔ اس میں ایک عورت کا وجود لہرا رہا تھا۔ یہ وجود نشہ بن کر اس کے حواس پر چھا گیا۔ ایک جوان عورت اس کے قبضے میں تھی۔

عورت

جو صرف عورت تھی۔

جس کا نام کوئی نہ تھا۔ کوئی عمر نہ تھی۔ کوئی شکل کوئی صورت نہ تھی۔ وہ عورت تھی۔ جوان بھرے بھرے گدرائے گدرائے جسم کا نام عورت تھا۔ یہ جسم بھوک مٹا سکتا تھا۔ پیاس بجھا سکتا تھا۔ تلذذ کی گھڑیاں فراہم کر سکتا تھا۔ عیش کے لمحے بخش سکتا تھا۔ وہ اس آزمائش سے چند لمحے نبرد آزما بھی ہوا۔ سر کو جھٹک کر اس اہلیسانہ ارادے کی مذمت بھی کی، نگاہیں آئینے سے چرائیں بھی لیکن اس کے اندر کا وحشی مرد جاگ اٹھا تھا۔ اس وحشی مرد کو سلا دینا اس کے بس میں نہ رہا تھا۔

اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر نیم پکے راستے پر موڑ لی۔
 ”اسلام پورہ کو سیدھی سڑک جاتی ہے۔“ شرافت پر کئے گئے اعتماد کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ عورت سمٹ کر قدرے آگے ہو کر بیٹھ گئی۔

”طوفان میں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے ایکسیڈنٹ تو نہیں کرنا۔“ مرد نے سرخ انگارہ سی آنکھوں سے اسے گردن موڑ کر گھورا۔

”مجھے یہیں اتار دو۔“ اس نے ہکلاتی آواز میں کہا۔

”میں تمہیں اپنے گھر لئے چلتا ہوں، طوفان جو نہی تمہا تمہیں پہنچا دوں گا۔“ اس نے قدرے ملائمت سے کہا۔

گھر! عورت نے دھڑکتے دل سے سوچا، لیکن گھر کے ساتھ پناہ تحفظ اور بھرے پرے کنبے کا احساس ابھر آیا۔ مرد کی شرافت اور شائستگی کے سہارے اس نے اس احساس کو قبول کر لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اور گاڑی طوفان کی سی تیزی سے کئی میڑھے میڑھے راستوں کو کاٹتی، چیتنے چنگھاڑتے درختوں تلے ہوتی، آندھی کی خوفناکیوں سے نہنتی پکی سڑک پر آ گئی۔ اور پھر چند منٹ سیدھے سیدھے راستے کو طے کرنے کے بعد ایک پھانک میں داخل ہو گئی۔

درمیانی قسم کی کٹھنی کا بیرونی چمن کچھ لٹا پٹا تھا آندھی اور طوفان سے درخت جھک جھک کر سجدہ ریز تھے۔ پودے جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ اور بجلی کے تاریکی جگہ سے ٹوٹ کر لٹک رہے تھے۔

پچھلا دروازہ کھول کر اس نے اسے باہر آنے کو کہا۔

وہ غیر یقینی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”ایسے طوفان میں یہاں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں بجلی کے تار ٹوٹ رہے ہیں کوئی گاڑی پر آگرا تو جل جاؤ گی۔ اندر چلی آؤ۔۔۔۔۔ میری بیوی بچے نوکر چاکر سبھی یہاں ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ جس کی پرچھائیاں عورت کے ذہن میں کانپ رہی تھیں۔

”بیوی، بچے، نوکر چاکر۔“ اس نے دل ہی دل میں یہ الفاظ دوہرائے اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی خطرے کے امکان کا سوال تو نہ تھا۔ اور جب دوسری اور تیسری بار آندھی اور طوفان کی زد میں آئے مرد نے شائستگی سے اسے اترنے کو کہا تو وہ بچے کو کندھے سے لگائے گٹھڑی ہاتھ میں پکڑے گاڑی سے باہر آ گئی۔ آندھی کے ریلے مجنونانہ حرکات پر اتر آئے تھے۔ دھول مٹی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ دانتوں تلے کرج کرج کر رہی تھی۔ بمشکل قدم اٹھاتی وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں آ گئی جس کا دروازہ اس نے اس کے اندر آتے ہی بند کر دیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔ بچے کو لٹا دو، طوفان تھمنے کا یہیں بیٹھ کر انتظار کر۔ میں اپنی بیوی کو بلاتا ہوں۔“

اس نے اعتماد اور شرافت سے کہا۔ وہ دل کی بیکل دھڑکنوں پر خوف کے سائے لئے سہم کر بیٹھ گئی۔ بچے کو اس نے قریب ہی صوفے پر لٹا دیا۔

باہر طوفان چنگھاڑ رہا تھا۔ بند کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں سے سر پھوڑ رہا تھا۔ عجیب عجیب سی ڈراؤنی آوازوں کا شور ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ہزاروں بھوت پریت نوحہ خوانی، سینہ کو بی کرتے ہوئے گزر رہے ہیں، دہشت سے اس کا دل ہلا جا رہا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ پھر کمرے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی نہ کوئی بچہ وہ اکیلا ہی تھا لیکن یکسر بدلا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور درندگی ناچ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ہی مکروہ مسکراہٹ تھی۔

عورت آنکھیں پھاڑے اس کے بدلے تیور دیکھنے لگی۔ وہ اس کے قریب آ بیٹھا اور بڑی بے تکلفی سے اس کی کلائی تھام لی۔

وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاپنے لگے اس کا گلا خشک ہو گیا لیکن دوسرے لمحے وہ آن کی حفاظت کے لئے شیرنی کی طرح غرائی۔

مرد نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ بلکہ خباثت کچھ اور نومند ہو گئی۔ وہ اسے مزاحمت

آئیڈیل

کے باوجود گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے آیا۔ اور دھکا دے کر بستر پر گراتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

”جتنا جی چاہے شور مچالو..... یہاں تمہاری سننے والا کوئی نہیں۔“

وہ چیختے چیختے ہانپ گئی اور اس کے آہنی چنگل سے اپنے مقدس وجود کو بچانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا، روئی چینی، ہاتھ باندھے، اپنی بیوگی کا واسطہ دیا۔ اپنی غربت کا دامن پھیلا یا منت کی سمجھوتہ کی، لیکن وہ اس وقت اندھا، گونگا اور بہرہ ہو چکا تھا۔ اسے تو صرف یہی احساس تھا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک ایسا گدرا یا ہوا جوان جسم ہے جو بھوک مٹا سکتا ہے پیاس بجھا سکتا ہے وحشی درندے کی طرح اسے بازوؤں کے شکنجے میں لئے وہ اس پر جھکا اپنے مکروہ ہونٹوں سے اس کی بے داغ بیوگی کو داغ دار کرنے پر تل رہا تھا۔ وہ سر اُدھر اُدھر پٹختے ہوئے چیخ رہی تھی۔

”ماموں.....“ ایک چیخ نما آواز گونجی۔

مرد نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ وہ تین سالہ معصوم بچہ دروازے سے اندر آتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

اور دوسرے لمحے وہ بچہ آ کر مرد کی ٹانگوں سے چٹ گیا۔ ”ماموں، امی کو نہ مارو ماموں۔ سب امی کو مارتے ہیں، تم تو نہ مارو ماموں۔“

خدا جانے ان الفاظ میں کیا درد تھا۔ کیا گہرائی تھی، کیا جادو تھا۔ مرد جیسے سکتے میں آ گیا۔ بچہ چیخے جا رہا تھا۔ اور مرد کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی گناہ کا احساس ڈس گیا تھا۔ انسانیت جاگ اٹھی تھی اور ماموں کا لفظ اک تو اتر سے روح پر تازیانے برسا رہا تھا۔

اور جب اس کے چنگل سے رہائی پا کر وہ ننگے سر بچے کو اٹھا کر باہر جانے کو بھاگی تو وہ روح کے کچوکوں سے ادھ مواسا ہو رہا تھا۔ سرتا پاپسینے میں ڈوبا۔ نادم و خجل وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ بستر پر عورت کا ململ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ اور وہ باہر نکلنے کو دوسرے کمرے کے دروازے کی چیخنی کھول رہی تھی۔

آئیڈیل

اس نے جلدی سے دوپٹہ اٹھایا۔ عقیدت و احترام سے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے، اسے یوں لگا جیسے اس نے خود اپنی حقیقی بہن کی بے حرمتی کی ہے احساس گناہ سے وہ نیم مردہ سا ہو گیا۔

دوپٹہ لئے وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ دروازہ کھولتی عورت کے سر پر دوپٹہ ڈالتے ہوئے وہ اس کے قدموں میں جھگ گیا۔

”مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو۔“

عورت ششدر سی اسے دیکھنے لگی۔ وہ اب چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے سک رہا تھا۔ گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ حیران تھی۔ اسے کیا ہوا ہے اتنی وحشیانہ درندگی سے اس پر جھپٹنے والا شخص اتنی لجاجت سے سکتے ہوئے اس سے معافی کا طلب گار تھا۔ سر جھکائے اور شرمساری سے آنکھیں نیچی کئے وہ اٹھا اور اس کے ہاتھوں سے بچے کو لیتے ہوئے بولا۔

”تم واقعی فرشتہ ہو۔ میرے بچے، تم نے آج مجھے بہت بڑے گناہ سے بچا لیا۔ میں تمہارا احسان مند ہوں بیٹے۔ ایک بار پھر مجھے ماموں کہہ دو۔“

بچے نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر فردوسی پاکیزگی سے کہا۔

”ماموں۔“

اس نے بچے کو لپٹا لیا، دوسرے لمحے وہ دروازے سے باہر تھا۔ آؤ بہن۔ میں تمہیں اسلام پورے پہنچا آؤں۔“

وہ ایک بہن کے مقدس وقار کے ساتھ اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

باہر

طوفان گرد و باد تھم چکا تھا۔ کالے کالے بادل امنڈ رہے تھے۔ ہواؤں میں مہک تھی اور ہلکی ہلکی بوندوں کی مترنم گنگناہٹ کسی فردوسی نغمے کی طرح لگ رہی تھی۔

یہ یادیں اتنی تنومند۔ ایسی جاندار اور اتنی حسین تھیں کہ سونیا اپنا آپ ان سے کسی طور الگ نہ کر سکی۔ انہیں یادوں کے دیپ آنکھوں میں جلا کر اس نے زندگی کے ہر رخ سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سہیلیاں اور اس کے بچپن کا پجاری کزن بوبی اسے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹانے کی کوششیں کر کے تھک ہار چکے تھے۔

سہیلیوں نے تو اسے اس کے حالات پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بوبی کے سینے میں بجھے چراغ پھر سے لودینے لگے تھے۔ مشتاق کی موت ایک بار پھر اسے سہانی منزلوں کے پتے دینے لگی تھی۔ سونیا کو اس نے شروع ہی سے حاصل حیات سمجھا تھا۔ سونیا کے جذبات بھی سرد اور مایوس کن تھے۔

مشتاق تو حادثے کی طرح آنا فانا آن پکا تھا۔ بوبی نے اپنی محبت سونیا کی خوشیوں کے لئے قربان کر دی تھی۔ سونیا مشتاق کی قد آور شخصیت سے مرعوب بھی تو انتہا کی آخری حدوں تک ہو گئی۔

دولت مند ماں کی اکلوتی بیٹی سونیا نے خواہش کی اور پوری ہو گئی۔ بچپن ہی سے اس نے جو چاہا پایا تھا۔ کسی چیز کا انکار یا کسی خیال کو مسترد کرنے کی تو وہ عادی ہی نہ تھی۔ اور پھر مشتاق کو مسترد کرنے کا تو کوئی جواز بھی نہ تھا۔ مشتاق و جیبہ باوقار اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز۔ دو سال بیرون ملک گزار کر آیا تھا یوں شخصیت اور بھی نکھر گئی تھی۔

مشتاق سے سونیا کی ملاقات کلب میں ہوئی تھی۔ وہ کلب کی باقاعدہ ممبر تھی کبھی می کے ساتھ کبھی بوبی اور کبھی اکیلے ہی وقت گزاری کے لئے وہاں چلی جاتی سنہرے گیلی چکنی مٹی کے سے وجود اور سیاہ خوبصورت گہری گہری آنکھوں اور کالی راتوں ایسے سیاہ بالوں والی سونیا کلب کے ممبران میں بڑی مقبول تھی۔ ناصر، کلیم اور شاہد تو چپکے چپکے اس کی محبت کی آگ میں جل رہے تھے۔ بوبی کی وجہ سے کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ اس کے بچپن کا منگیتر مشہور تھا۔ جوانی میں بھی دونوں کا ساتھ تھا۔ اس لئے چاہنے کے باوجود محبت کا اظہار تینوں خاموش متوالوں میں سے ایک بھی نہ کر سکا۔

انہی دنوں مشتاق کلب میں آیا اس کی شمولیت ایک حسین اضافہ تھی۔ پہلی ملاقات

انتقام

بعض اوقات ہم یوں بھی تو مر جاتے ہیں کہ چلتے ہیں پھرتے ہیں۔ اٹھتے ہیں بیٹھتے ہیں۔ کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے بھی ہیں۔ لیکن!

اپنے تڑنے ہوئے وجودوں پر یوں خول چڑھالیتے ہیں کہ روشنی کی کوئی کرن ان کے آر پار نہیں ہوتی۔ خوشی کا کوئی اجالا نہیں پھیلتا۔ زندگی کی ہماہمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

سونیا بھی ایسے ہی مر گئی تھی۔ بیس اکیس سالہ گھور گھٹاؤں ایسے خوبصورت بالوں اور سیاہ حسین آنکھوں والی کندنی سی لڑکی جیتے جی مر گئی تھی۔ بیوگی کو اس کی عمر اس کے حسن سے کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ شادی کے صرف تین ماہ بعد ہی بیوگی کے سانچے سے دو چار ہو گئی تھی۔

چھ فٹ قد اور خوبصورت تنے ہوئے جسم والا مشتاق اپنی شخصیت کی تمام تر دلاویزیوں کے ساتھ اس کی زندگی میں جتنی سرعت سے آیا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے نکل بھی گیا۔ ٹریفک کا معمولی سا حادثہ نگین نوعیت کا ثابت ہوا۔ گاڑی میں پانچ افراد میں سے موت کا وار صرف مشتاق پر ہی ہوا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ عمر بھر کے نبھاہ کے اس کے پکے پکے وعدے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ سونیا کے پاس سوائے چند یادوں کے اور کچھ بھی نہ رہا۔

ہی میں دل میں اتر جانے کے فن سے وہ بخوبی آشنا تھا۔ سونیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بھیگی بھیگی مترنم سی شب تھی۔ سونیا کلب میں جلوہ گر اس روشن روشن شخصیت کو دو تین دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن تعارف نہیں ہوا تھا۔ اس دن وہ اپنی میز پر اکیلی ہی تھی

وہ ادھر ہی آ گیا۔ اپنی بڑی بڑی فوسوں ساز آنکھوں سے سونیا کو دیکھتے ہوئے قدرے مسکرایا۔ میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔

”ضرور۔ ضرور۔“ سونیا اس کی قربت سے بوکھلا سی گئی۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ بھانپ کر بڑے حسین طریق سے مسکرایا۔ اور پھر معنی خیز انداز میں سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا ”میں مشتاق ہوں۔“

جملے کی سادہ لیکن ذومعنی ادائیگی سے سونیا سرخ ہو گئی۔ جھپٹتے ہوئے بولی ”مجھے سونیا کہتے ہیں۔“

”بہت خوبصورت“ وہ نگاہ شوق اس پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”جی۔“ وہ معصوم مسکراہٹ سے بولی۔

”شخصیت کی طرح آپ کا نام بھی منفرد ہے۔“ وہ بولا۔

”شکریہ۔“ وہ خوش دلی سے ہنس پڑی۔

اور

پھر دونوں بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ مشتاق نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔ اس کی گفتگو کا انداز مہذب اور دلکش تھا۔ سونیا ڈوبتی چلی گئی۔

سونیا نے مشتاق کا مئی سے بھی تعارف کروایا۔ بوبی سے بھی ملوایا۔ اس کی باغ و بہار طبیعت نے مئی کو جلد ہی مرعوب کر لیا۔ بوبی البتہ اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ لیکن سونیا تو جیسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہوتی جا رہی تھی۔ بوبی کے کھچاؤ کو اس نے کہاں محسوس کرنا تھا۔

مشتاق اور سونیا بہت قریب آ گئے۔ دونوں کی شامیں اکٹھے گزرنے لگیں مشتاق

اکثر سونیا کے ہاں بھی آنے لگا۔ رات کے کھانے پر تو مئی اسے اکثر بڑے پیار سے روک لیتیں۔

دو تین ماہ کی ملاقاتیں مشتاق کی درخواستگاری پر منتج ہوئیں اس نے سونیا کو پانے کی بڑی چاہت پیارا ور شوق سے مئی سے بات کی۔ سونیا کی خوشیوں کا ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

مئی نے جب اس کی رائے پوچھی۔ تو اس نے بڑے ہی والہانہ انداز میں ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر سرگوشی کی مئی مشتاق میری زندگی ہے۔ مئی کی راہ میں کوئی رکاوٹ تھی۔ ہاں بوبی کا خیال ضرور تھا۔ لیکن جب دو فریق متفق تھے۔ تو تیسرے کو درمیان میں گھسیٹنا کہاں کی عقل مندی تھی۔ اور پھر مشتاق کی شخصیت اتنی اجلی اور ایسی نکھری ہوئی تھی کہ کسی قسم کا اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔

مئی نے اسے حامی بھرتے ہوئے صرف اتنا ضرور کہا کہ اپنی ماں کو بلا لو۔ تیسرے ہی دن مشتاق کی مہارانیوں جیسی سبج دھج والی اماں بھی آ گئیں ایسی باوقار خاتون تھی وہ کہ مئی کے دل میں اگر کوئی وسوسہ یا خدشہ تھا بھی تو نکل گیا۔

سونیا کو دیکھ کر تو اماں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ بیٹے کی پسند پر سوسو بار قربان ہونے کو جی چاہا۔ سونیا کو کلیجے سے یوں بار بار لگایا۔ جیسے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہو۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ سسرال میں اماں یا بڑے بھیا ہی تھے۔ سونیا ان کی آنکھوں کا تارا بھی بن گئی۔

مشتاق چونکہ ملازمت کے سلسلہ میں ان دنوں یہیں تھا۔ اس لئے سونیا اتوار کا دن ساس اور جیٹھ کے ساتھ گزار کر مشتاق کے ساتھ ہی واپس آ جاتی۔ الگ بنگلہ لینے کی مئی نے مخالفت کی۔ اتنی بڑی جہازی سائز کوشی اور تھی کس کے لئے اس کے الگ تھلگ کمرے سونیا اور مشتاق کے لئے مختص ہو گئے دونوں ایک دوسرے میں کھو کر ازدواجی زندگی کی پر مسرت راہیں طے کرنے لگے۔ یہ جوڑا مثالی تھا خوبصورت سوشل اور پروقار لوگ انہیں رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے سونیا کے امیدوار سلگ رہے تھے۔ دکھ بوبی کو بھی بہت تھا۔ لیکن اس نے سونیا کی خوشیوں پر اپنی خوشی کو قربان کر دیا تھا۔ درد

اپنی جگہ شدید تھا۔ لیکن وہ اسے خوش دیکھ کر خوش ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔
دن گزر رہے تھے۔

انتہائی رنگین دن گزر رہے تھے۔

عشق و محبت کی انتہائیں سمٹ رہی تھیں۔ گرد و پیش کا جیسے دونوں کو ہوش ہی نہ تھا۔
اور جب بے خودی یوں چھائی ہو تو ایک دوسرے کو جاننے پر کھنے کا شعور کہاں رہتا
ہے۔ کبھی کبھی بوبی کے مسکراتے لبوں پر جب سونیا کو آگ کے سلگاؤ محسوس ہوتے تو وہ
اداس ہو جاتی۔

یوں ہی۔

کبھی کبھی مشتاق بھی ڈوب سا جاتا۔

لیکن اہمیت کبھی سونیا نے دی نہ مشتاق نے۔

تین ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ اور ابھی نگاہوں میں نکھرتے رنگین رنگین خوابوں کے
عکس پوری طرح لہرا بھی نہ پائے تھے کہ رفاقت کے بندھن ٹوٹ گئے موت کا وار ایسا
ناگاہ ہوا تھا کہ مشتاق سونیا کو کوئی الودائی لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

سونیا تو کیا اماں اور می کی دنیا بھی اندھیر ہو گئی۔

سونیا نے غش پہ غش کھائے۔ پچھاڑیں کھائیں۔ دیوانگی مسلط ہوئی۔ لیکن جانے
والا لوٹ کر نہ آ سکا۔ دنیا کی نظر ہی کھا گئی۔ بہاریں جوان ہونے سے پہلے ہی خزاں کا
روپ دھار گئیں۔ آبادیاں پوری طرح بس نہ پائی تھیں کہ ویرانیوں نے نگل لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ می اور اماں تو سنسنیل گئیں۔ وقت کا مزہم بڑا اکسیر ہے لیکن
سونیا تو داغوں کو سینے میں سجانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔ وفا و ایثار کے نام پر قربان ہو
جانے کا تہیہ کئے تھی۔

ماتمی لباس جو پہنا تو پھر رنگ رنگ الٹا ڈرن لباسوں کو پلٹ کر بھی نہ دیکھا.....
ہارسنگار کی ضرورت سے زیادہ ہی شوقین تھی۔ لیکن اب آنکھوں کے بہتے آنسو اور لبوں
پر سسکتی آہیں ہی اس کا سنگار تھے۔ گیلی چکنی مٹی کا سا سنہری وجود سوکھ رہا تھا آنکھوں کی

چمک اور سیاہیاں آنسوؤں ہی کی نذر ہوتی رہتی تھیں۔ ہونٹوں پر زردی اور چڑیاں جم
رہی تھیں۔ لیل و نہار کی گردش جیسے بے معنی سی تھی۔ کمرے میں بستر پر اوندھی پڑی
رہتی۔ دل گھبراتا تو مشتاق کی قبر پر بیٹھی روتی رہتی.....

بوبی نے بہتری کوشش کی مٹی کے ڈھیر سے سونیا رابطہ توڑ لے۔ رونا دھونا ہی ہے تو
گھر پر رو لیا کرے۔ لیکن سونیا اس کی سنتی تھوڑا ہی تھی۔ وہ تو قبر پر بیٹھ کر یوں تسکین
محسوس کرتی جیسے مشتاق کے پاس بیٹھی ہے۔ کتنی میٹھی میٹھی باتیں کر کے جی بہلاتی تھی۔
کئی بار تو روٹھ کر منہ بھی پھیر لیا تھا۔ کبھی قبر سے لپٹ کر یوں روتی جیسے مشتاق کے
چوڑے چکلے سینے سے لگ کر رو رہی ہے۔

زخموں پر تسکین کے پھاہے رکھنے کی کوشش میں می ہار گئیں۔ بوبی بھی بے بس ہو
گیا۔ تین چار ماہ میں وہ سونیا کو اپنے مقام سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ کر سکے تھے۔
زندگی کسی نہ کسی نظریے کی پابند ہوتی ہے۔ سونیا نے اپنا ہی نیا اور انوکھا نظریہ وضع کر لیا
تھا۔ جیتے جاگتے انسان سے پیار کے جذبات کی تسکین کی جاسکتی ہے تو مٹی کے ڈھیر کو
مرکز مان کر بھی جذباتی تسکین کے پہلو نکالے جاسکتے ہیں۔ اب بوبی لاکھ سر پختا۔
حقیقت کا احساس دلاتا۔ خیالی اندھیروں کے سفر میں بھٹکنے سے روکنے کی کوشش کرتا۔
لیکن وہ بڑی ملائمت سے اس کی بات ٹال جاتی جب خیالی اندھیروں کا سفر بھی اس کے
لئے تسلی کے پہلو لئے ہوئے تھا۔ تو دوسروں کو معترض ہونے کی کیا ضرورت۔

می کا جواز اور تھا۔ قبرستان جانے سے وہ اس لئے بھی روکنا چاہتی تھیں کہ ڈرتی
تھیں۔ ان کی نازوں پلے اکلوتی بیٹی قبرستان کی ہولناکی اور ویرانی سے ڈرنے جائے۔
کوئی بھوت پریت سایہ نہ ڈال دے۔ لیکن سونیا ماں کی سادہ لوحی پر پھکی سی مسکراہٹ
لبوں پر لے آتی۔ مشتاق مر کر بھی اس پر اتنا ہی حاوی تھا۔ جتنا زندگی میں تھا۔ بھوت
پریت کی اسے کیا پرواہ تھی۔ ان کی گنجائش بھی کہاں تھی۔

وہ بڑی اداس سہ پہر تھی۔ سونیا مشتاق کی قبر کے سرہانے سوگوار بیٹھی تھی۔ ذہن
میں کئی حسین یادیں تھرک رہی تھیں۔ یہ یادیں کبھی آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھلک رہی

تھیں۔ اور کبھی پراسراری مسکان بن کر لبوں پر پھیل جاتیں روزانہ اس کے ساتھ آنے والا ملازم دور درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا کڑی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ سونیا کے ساتھ روز قبرستان آ کر گھنٹوں اس کی واپسی کا انتظار کرنا سخت اور کڑی ڈیوٹی ہی تو تھی۔

قدموں اور ہلکی ہلکی باتوں کی آواز پر سونیا نے چونک کر دیکھا۔ گمان تو یہی گزرا کہ کسی نئے بچھڑنے والے کی آخری آرام گاہ بنانے کو لوگ آئے ہیں۔ لیکن آنے والے کچھ لوگ نہیں تھے۔ ایک سرتاپا سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس حسین و جوان عورت تھی اس کے ساتھ ایک مرد تھا۔ جس نے کوئی سال ڈیڑھ سال کا خوبصورت بچہ اٹھایا ہوا تھا۔

وہ سیدھے ادھر ہی آرہے تھے۔

سونیا حیران تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ آنے والی کا لباس اور شکل و صورت اس کے غیر ملکی ہونے کا احساس دلارہے تھے۔ مرد پاکستانی تھا اور بچہ بالکل انگریز لگ رہا تھا۔ ”یہ ہے مشتاق کی آخری آرام گاہ۔“ اس آدمی نے ساتھ آنے والی عورت سے انگریزی میں کہا۔ پھر سونیا کی طرف دیکھا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ عورت آگے بڑھی۔ گھنٹوں کے بل قبر کے اوپر جھک کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

”اوہ..... مش ٹیک..... مش..... مائے مش۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی سونیا حیرت زدہ سی اسے نکلے جا رہی تھی۔

مائے ڈارلنگ..... مائے سویٹ پارٹ۔ وہ قبر پر جھکی بے تابانہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی وہ روتی رہی پھر اس نے مرد سے بچے کو لے کر قبر کے ساتھ لگایا۔ ”یور ڈیڈی۔“ وہ مجنونانہ انداز میں بچے کے ہاتھ قبر کی سیلی مٹی پر پھیرتے ہوئے گرد و پیش سے جیسے بے خبر تھی۔ ”ڈیڈ..... یور..... ڈیڈ.....“ وہ ہلکے بلکے کر رہی تھی۔

فاتحہ پڑھنے کے بعد مدرسہ جھکائے چپ چپ کھڑا تھا انگریز عورت رو رہی تھی اور بچہ حیرت زدہ سا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

سونیا جیسے کوئی بھیا نک خواب دیکھ رہی تھی اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھلی تھیں۔ رنگ بے رنگ تھا۔ اور سارا وجود کانپ رہا تھا۔

”یہ..... یہ کون ہے؟“ اس نے کانپتی آواز میں اجنبی مرد سے پوچھا۔

”مسز مشتاق!“ مشتاق کی انگریز بیوی اور بچہ۔ غالباً آپ اس کی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ سونیا نے پاگلوں کی طرح چیخ کر کہا انگریز عورت نے پرخم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ غالباً مشتاق کی پاکستانی بیوی ہیں۔“ اجنبی اس کی حالت سے اندازہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ وہ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ شاید ایسی صورت حال متوقع نہ تھی۔

”محترمہ..... یہ مارگریٹ مشتاق ہیں۔ مشتاق میرا دوست تھا۔ یو کے میں ہم دونوں اڑھائی سال اکٹھے رہے اس نے وہاں شادی کی تھی۔ یہ بچہ بھی اسی کا ہے۔ میں نے سنا تھا۔ اس نے یہاں بھی شادی رچالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے آپ کو مارگریٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

سونیا کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی عمودی چٹان سے لڑھکتی نیچے آ رہی ہے دکھ صدمے اور درد سے اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔ اجنبی نے اندازہ کرتے ہوئے سوگوار آواز میں کہا ”محترمہ آپ کو دکھ تو ہوا۔ لیکن اب مشتاق ہی نہیں رہا۔ خدا اس کی خطائیں معاف کرے۔“

سونیا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چکراتا سر تھام لیا۔ مشتاق اتنا بڑا دھوکے باز تھا۔ وہ یقین نہ کر پا رہی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ مارگریٹ نے سونیا کی طرف نمناک نظروں سے دیکھا۔

”مشتاق کی کوئی قریبی عزیزہ۔“ اجنبی خاصا معاملہ فہم تھا۔ جلدی سے بولا.....

وہ سونیا کو دیکھتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ بچہ ہاتھ مار مار کر مٹی اڑاتا رہا۔

”محترمہ۔“ اجنبی سونیا سے اردو میں مخاطب تھا۔ مارگریٹ بھی آپ کی طرح لاعلم

ہے۔ تین چار ماہ سے اس کو مشتاق کی خبر معلوم نہ ہو رہی تھی۔ جانے کس کس سے پتہ کروانے کی کوشش کی مجھے لکھا۔ تو میں نے اس کی موت کی اطلاع دے دی، بے چاری ہزاروں میل سے جانے کن کن دشواریوں کے بعد اس کی مٹی کو چھونے آئی ہے۔“

سونیا اسی طرح ہاتھوں پر سر گرائے بیٹھی رہی۔

”موت نے سارے راستے مسدود کر دیئے اب مشتاق تک کوئی پہنچ نہیں سکتا اسی لئے میں نے مارگریٹ کو بتایا نہیں تھا۔ مشتاق کے متعلق وہ بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ وہ اسے عنقریب پاکستان بلانے والا تھا۔ مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ اتفاقاً آپ کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ خیر۔ اب تو معاملہ ہی اور ہو گیا۔ مشتاق جیسا بھی تھا آپ اسے معاف کر دیں کہ موت نے۔“ وہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ سونیا سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ کئی لمحے گزر گئے۔ اجنبی آہستہ آہستہ بولتا رہا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ کئی دن وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈولتی رہی۔ صدمہ اتنا اچانک غیر متوقع اور براہ راست تھا کہ اس کی جذباتی دنیا درہم برہم ہو گئی۔ ٹوٹ کر بخار چڑھا اور ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ دھوکے باز، فریبی، مکار، بدلا، انتقام، ذلیل، کمینہ اس کے ہونٹوں پر ہوش و بے ہوش میں یہی لفظ تھرکتے رہے۔

ممی اور بوبی ایک بار پھر نئے سرے سے تشویشناک پریشانی سے دو چار تھے ممی کا خدشہ صحیح تھا کہ آسیسی سایہ ہو گیا ہے۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے۔ بوبی کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ بے چارہ ڈاکٹروں کے پاس مارا مارا پھرا حکیموں کے پاس گیا۔ پیروں فقیروں کے در پر حاضری دی۔ کئی دنوں بعد سونیا سنبھلی۔

اس دن اس کی طبیعت بہلی ہوئی تھی۔ نرم نرم بستر میں کروٹ کے بل لیٹی سوچوں میں گم تھی۔ بوبی قریب ہی کرسی پر بیٹھا اس کے موڈی اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ ”بوبی۔“ اچانک اس نے بوبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”ہوں۔“ وہ قدرے آگے کو جھک آیا۔

”میری بات مانو گے؟“

”ضرور۔“

”مجھ سے شادی کرتے ہو۔“

”کیا؟“

بوبی اس انتہائی غیر متوقع بات پر بوکھلا گیا۔ حیرت زدہ سا اسے تکتے گیا وہ اک جھٹکے سے پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔

”ہاں کرو۔۔۔۔۔۔ یا نہ۔۔۔۔۔۔“ وہ درشتی سے بولی۔

”سونیا۔“ وہ ابھی تک حواس میں نہ آیا تھا۔

”جواب دو۔۔۔۔۔۔ بوبی۔“ وہ چیخی۔۔۔۔۔۔ ”نہیں تو میں کلیم شاہد یا۔۔۔۔۔۔“

”سونیا۔“ بوبی نے اٹھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

”جواب دو۔“ وہ جذبات سے عاری چہرے سے بڑے کرخت لہجے میں بولی۔

”ہاں یا نہ۔“

”تم میری زندگی ہو سونیا۔ میری جان ہو“ بوبی فرط جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

سونیا اس انداز سے مسکرائی جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

نکاح کی تقریب تو سادگی سے ہوئی۔ لیکن سونیا نے دلہن بنتے ہوئے آرائش و زیبائش اس طرح کی کہ حسین قاتلانہ کاروب دھار لیا۔

بوبی کمرے میں آیا۔ تو وہ مسہری پر بیٹھی نہیں تھی۔ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی فاتحانہ چمک تھی۔

بوبی بے صبری سے اس کی جانب بڑھا۔ بے تابی سے بازو پھیلائے۔

”نہیں۔“ سونیا نے بڑی ملائمت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کسی

بدست شرابی کی طرح لہرا رہی تھی۔ ”یہاں نہیں۔“

”تو۔“ بوبی بوکھلایا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ سونیا کے لہجے میں نرم نرم حکم تھا۔
وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ بوبی جیسے عامل کے پیچھے معمول تھا۔
وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ بوبی بھی بغیر کچھ سمجھے ساتھ بیٹھ گیا۔
سونیا نے گاڑی سٹارٹ کی اور پھر تیزی سے موٹر گیٹ سے باہر نکل گئی۔
دوسروں کے چکر کاٹ کر موٹر قبرستان کی طرف جارہی تھی۔
بوبی بدشگنی کے احساس سے کانپ گیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔
”آؤ۔“ سونیا گاڑی سے اتری۔ ہاتھ بڑھایا۔ بوبی نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔

چاندنی رات میں قبرستان کی ویرانی پر اسرار لگ رہی تھی۔ اک عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ درختوں کے سیاہ سائے مہیب نظر آ رہے تھے۔ کچی اور پکی قبریں ہیبت ناک تاثر دے رہی تھیں۔

سونیا بوبی کا ہاتھ پکڑ مشتاق کی قبر پر آ گئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ نتھنے پھڑک رہے تھے اس نے اک قہر آلود نگاہ قبر پر ڈالی۔ غصے سے وہ کانپ رہی تھی۔
بوبی دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔
وہ شاید لہرا گئی۔

بوبی نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں کا سہارا دیا۔

”مجھے ان بازوؤں میں سمیٹ لو بوبی۔ مجھے سینے میں چھپا لو۔ مجھے اتنی شدت سے پیار کر لو۔ اتنی شدت سے کہ۔ کہ مشتاق کی ہڈیاں تک حسد سے جل اٹھیں۔ بوبی کے سینے میں سمانے کی مجنونانہ کوشش کرتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

زرد چہرے

دلہن کے حسن و جمال کے چرچے ہر زبان پر تھے۔
سلمیٰ بھابی کا پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔ نومی انہی کا انتخاب تھی۔ اتنی بڑی بڑی فسوں ساز آنکھوں والی نومی۔ جو دلہن بنی عورتوں اور بچوں میں گھری بیٹھی تھی اور جسے دیکھ کر کئی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ دلہنیں تو اکثر اچھی لگتی ہیں۔ لیکن نومی کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ناک نقشہ حسین تھا ہی اس پر چمکتی سنہری رنگت بھرا بھرا سڈول جسم اور زندگی سے بھرپور ارمانوں بھرا دل جب عورتوں کی تعریف پر شرما شرما جاتی تو جیسے قیامت کا سامان ہو جاتا۔ اس نے یہ سرخ عروسی جوڑا اور جڑاؤ زیورات نہ بھی پہنے ہوتے۔ جب بھی وہ ایسی ہی قاتل نظر آتی اس کی آنکھوں میں ڈولتے سنہرے خوابوں کی چمک ان زیورات پر حاوی جوتھی۔ اس کی کھنکھاتی شرمیلی ہنسی جو پھوار کی طرح اس کے وجود سے برس رہی تھی۔ زیور اور سرخ جوڑے سے بھلا حسن تھوڑا ہی پار ہی تھی۔

لوگوں کی تعریفیں سن سن کر سلمیٰ بھابی پھولی نہ سار ہی تھیں۔ اس نے جیسے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ زرد رو دلی تیلی کمزور کمزوری سلمیٰ بھابی نے جیسے خود اپنی توقع کے خلاف بڑا اہم فریضہ بخیر و خوبی انجام دے لیا تھا۔ خالد اس کا نہ دیور کوئی دور پار کا رشتہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی پیار کے رشتے بھی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں۔ خالد اس کے شوہر کا بھائی بنا ہوا تھا۔ اتنی خوبصورت اور پیاری شخصیت تھی کہ سلمیٰ بھابی نے دیور اور بھائی کا

آئیڈیل

سارا پیارا سے دے رکھا تھا۔ اس کا اور تھا بھی کون؟ محبت کا بھوکا تھا اور پھر سلمیٰ بھابی۔ عادات و اطوار تو خیر خوبصورت تھے ہی خالد کے لئے تو اس کا زرد مضحل نڈھال اور کمزور کمزور چہرہ ہی ہماری دنیا کی جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ زرد چہرے خالد کی کمزوری تھے ایسے نڈھال اور مضحل چہرے اسے سکون و تسکین کی اتنی دولت دیتے تھے کہ زندگی کے حقائق اور ان کی ساری تلخیاں بھول جایا کرتا تھا۔ اس نے کبھی زرد چہروں سے اس اپنی مجنونانہ محبت کا برملا ذکر نہ کیا تھا لیکن یہ کشش زنجیر تھی۔ وہ اسی زنجیر سے بندھا سلمیٰ بھابی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا اور سلمیٰ بھابی نے جب اس کا گھر بنانے کے لئے تنگ و دو شروع کی تھی تو اس نے سارا معاملہ سارا اختیار ہی اسے دے دیا تھا۔ لڑکی کے متعلق اس نے صرف یہی کہا تھا۔ ”آپ کی طرح ہو بھابی۔“ سلمیٰ بھابی نے شریہ کہیں کا۔ کہہ کر اس کے گال پر پیار سے چپٹ لگایا تھا۔ اپنے بھائی کے لئے ایسی دلہن لاؤں گی۔ کہ دنیا دیکھے گی۔

اور وہ واقعی ایسی دلہن لے آئی تھی کہ دنیا دیکھ رہی تھی۔ خالد خوبصورت تھا جوان تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اچھے عہدے پر فائز بھی تھا لڑکیوں کی اس کے لئے کمی نہ تھی۔ پھر بھی جو کوئی نومی کو دیکھ رہا تھا۔ یہی کہہ رہا تھا۔ ”خالد بڑا خوش قسمت ہے بڑا بھاگوان ہے۔“

نومی شرمیلی اداؤں سے مسکرا رہی تھی۔ اس کا انگ انگ نشے سے ٹوٹ رہا تھا وہ جانتی تھی۔ اس کا شوہر اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے وہ اس کے اکیلے پن کو بہاروں کا حسن بن کر سمیٹنے کے تصور سے خود ہی بہکی جا رہی تھی۔

سلمیٰ بھابی نے جملہ عروسی سجانے کے سارے ہی ارمان خوب نکالے۔ سرخ سرخ کمرہ خوابناک روشنیوں میں بڑی ہی جذبات انگیز فضا لئے ہوئے تھا۔ پھولوں سے لدی بیج پر اس نے نومی کو بٹھایا۔ رنگ و نور بکھر بکھر گیا اور فضا میں پھولوں اور ہلکی ہلکی خوشبو کی مہک رچ بس گئی۔

خالد کے کانوں میں جانے ہنسی ہنسی میں کیا کیا ہدایتیں دے کر سلمیٰ بھابی نے اسے

آئیڈیل

کمرے میں دھکیل دیا۔ نومی دھک دھک کرتے دل کو تھامے اپنے گھٹنوں پر جھک کر بالکل گھڑی سی بن گئی۔

خالد کا دل بھی دھڑک اٹھا۔ آنکھوں میں جذبات کا بوجھل خمار لئے وہ نومی کے قریب آ بیٹھا۔ مہکی مہکی قربت کا احساس دونوں کو وارفتہ کر رہا تھا۔

خالد نے نومی کے گھونگھٹ کی طرف اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایا۔ نرم و گداز ہاتھوں نے مزاحمت کی۔ لیکن مزاحمت برائے نام ہی تھی۔ تھوڑی سی حسین سی کھینچا تانی ہوئی اور پھر خالد نے نومی کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ یہ لمحہ کتنا حسین تھا۔

”ا.....و.....ف.....“ لمحے کا دھڑکا دل ایک دم ساکت ہو گیا اور خالد نے نومی کا چہرہ سختی سے پرے جھٹک دیا۔

دوسرے لمحے وہ بستر پر گر چکا تھا، اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور سارے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی۔

نومی ششدر تھی، حیران اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ خالد آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

اسے ایسے چہروں سے نفرت تھی۔ سرخ و سپید صحت مند چہروں سے شدت سے نفرت تھی زرد مضحل کمزور کمزور چہرے اس کی کمزوری تھے۔ لیکن نومی..... یہ چہرہ.....

یہ چہرہ اسے اتنا خوفناک لگا کہ اپنے آپ پر قابو نہ پالیتا تو اس کی چیخ اتنی تیزی سے پھٹ پڑتی کہ کمرے سے نکل کر ساری کوٹھی کے در و دیوار سے ٹکرا جاتی۔

اسے سرخ و سپید صحت مند چہروں سے نفرت کیوں تھی؟ اور زرد مضحل کمزور کمزور چہرے اسے طہانیت و سکون کی دولت کیوں بخش دیتے تھے؟ اس کا جواب وہ خود کو کبھی

نہ دے پاتا تھا۔ اور دیتا بھی کیوں کر زندگی کے وہ سنگین لمحے تو اس کے شعور کی گرفت سے بہت دور تھے۔ لاشعور ہی مجروح تھا۔ زخمی تھا۔ کچلا کچلا یا تھا۔ وہ ان دنوں بشکل دو

اڑھائی سال کا تھا۔ جب اس کی شفیق ماں بیمار پڑ گئی تھی۔

بیماری اتنی بڑی تھی کہ وہ چار پائی سے لگ گئی تھی اس کا رنگ و روپ بیماری نے

www.pdfbooksfree.pk

ڈس لیا تھا۔ اور وہ زرد ہڈیوں کا ڈھانچہ بستر پر پڑی رہا کرتی تھی۔ موت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کا بخ بستہ احساس اسے سہا رہا تھا۔ وہ جتنا موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ متا جنونی ہو رہی تھی، شفقتیں برس رہی تھیں اور یوں زرد زرد مضمحل کمزور اور نڈھال چہرہ اس کے لئے محبت شفقت اور سکون کی علامت بن گیا تھا۔

لیکن محبتوں اور چاہتوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں میں جب اس کا وجود تسکین پا رہا تھا۔ تو سرخ و سپید صحت مند چہرے والی پھوپھی یہ لجات بکھیر دیتی۔ اس کی ماں بیمار تھی بچے کو اس سے دور رکھنا گھروالوں کا فرض تھا۔ لیکن اس کے ننھے سے ذہن میں جو کچھ ڈھل رہا تھا۔ اسے کون سمجھ سکتا تھا۔ جب بھی وہ ماں کے جلتے سینے سے لپٹ کر سونے کی کوشش میں ہوتا اور ماں کے سینے سے متا اہل کرنس نس میں سمارہی ہوتی۔ پھوپھی اسے اکثر چھٹ کر لے جاتی۔ اور محبت کی وہ گرمی متا کی وہ پیش جو اس کے وجود کو پگھلا رہی ہوتی۔ ایک دم ساکت ہو جاتی۔ خوف اور غیر محفوظ ہونے کا احساس اس کے ذہن میں جامد ہو جاتا۔ اس پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔

جانے اس کی ماں کتنی مدت بیمار رہی اور کب اللہ کو پیاری ہو گئی اور کتنی مدت اس نے پھوپھی کے سائے میں پرورش پائی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ زرد چہروں سے محبت اور صحت مند چہروں سے نفرت کی بنیادیں انہی دنوں کی پیداوار تھیں اس کا ذہن اس کی گرفت میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ سالہا سال گزر جانے اور اپنا تجزیہ کرنے کے باوجود بھی وہ اس نفرت اور محبت کو اپنے سے الگ نہ کر سکا تھا۔

آج نوی کا چہرہ دیکھ کر خوف اور غیر محفوظ ہونے کا احساس اس پر اس طرح مسلط ہوا کہ اس کا سارا وجود کپکپا اٹھا ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ گئیں۔ اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

نوی نئی نویلی دلہن شرم و حیا کے بوجھ سے دبی بیٹھی کئی لمحے اسے جھکی جھکی نظروں سے دیکھ دیکھ پریشان ہوتی رہی۔ اور جب کئی کوفت زدہ لمحے بیت گئے تو اس نے بڑی

جرات سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

خالد تڑپ کر اٹھا اور مسہری سے ایک ہی جست میں صوفے پر آ بیٹھا۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ چہرہ دونوں ہاتھوں پر گرا کر وہ جھک گیا۔

نوی پر تو جیسے غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ تصورات کے جس رنگین ہنڈولے میں وہ جھول رہی تھی اس سے ایک ایک یوں آن گرے گی کہ ہڈی پبلی ٹوٹ جائے گی ایسا تو کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ نڈھال اور بے دم ہو کر وہ تنکلیے پر گر گئی۔ صدمہ کچھ ایسا اچانک اور اتنا شدید تھا کہ اس کی سوچ و سمجھ کی صلاحیتیں ہی بکھر گئیں۔

خالد بھی جیسے جاکنی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ کئی لمحے صدیاں بن کر ریگ گئے خالد نے ڈرتے ڈرتے چہرے سے ہاتھ ہٹائے شاید وہ اپنی پچھلی سوچوں کو جھٹک رہا تھا۔ ماضی سے نکل کر حال سے نبھاہ کرنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بڑی ہمت بڑی جرات سے اس نے سراٹھایا۔ مسہری کی جانب دیکھا۔ نوی تنکے میں منہ دیئے شاید سسک رہی تھی۔ جذبہ ترم خالد کے دل میں اٹھا ایک جوان لڑکی کے خواب چکنا چور کر دینے کے جرم نے اسے شرمسار کیا۔ لیکن وہ اپنی اندرونی ہلچل پر اس جذبہ ترم اور احساس جرم کو غالب نہ کر سکا وہ اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نوی نے اسے جاتے دیکھا۔ تقدیر روٹھ کر جا رہی تھی۔ لیکن وہ بے بسی سے صرف دیکھتی رہ گئی۔

رات گزر گئی۔ خونی بے رحم اور سفاک رات، نوی کی فسون ساز آنکھوں میں ٹوٹے تصورات کی کرچیاں چھیتی رہیں اور بے خواب آنکھوں میں آرزوؤں اور ارمانوں کے لاشے اٹکے رہے۔

خالد چمن میں دیوانوں کی طرح گھومتا رہا۔ برآمدوں کمروں اور بالکونیوں میں پھرتا رہا۔ سلی بھابی نے یہ کیا ظلم کیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہا۔ ایک لڑکی کی پوری زندگی تباہ ہونے کے سوال پر غور کرتا رہا۔ کشش، تذبذب اور پریشانی میں اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ کچھ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نوی کو برداشت کرنے کی

اس میں ہمت تھی نہ طاقت لیکن شادی ہو چکی تھی۔ ایک معصوم زندگی کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے بھی تو جرأت اور ہمت کی ضرورت تھی تا کر وہ گناہوں کی سزا دینا ایسا سہل بھی تو نہیں تھا۔

دوسرا دن اس نے کام کے بہانے باہر ہی گزارا سہلی بھابی ہی نومی کے پاس رہی نومی کے چہرے پر چھائی مایوسی سے اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے نومی سے رات کی سرگزشت پوچھی۔ نومی کیا بتاتی۔ اس کے کندھے سے لگ کر بے اختیار رو دی۔ شریف خاندان کی کم زبان لڑکی اس کے سوا اور کبھی کیا سکتی تھی۔

دوسری رات خالد جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو حالات سے سمجھوتہ کر لینے کے فیصلے کے باوجود ڈانوا ڈول تھا۔ وہ خوفزدہ سا کمرے میں داخل ہوا۔

نومی سادہ سے کپڑوں میں بغیر کسی آرائش و زیبائش کے صوفے پر بیٹھی تھی وہ ویران ویران سی لگ رہی تھی بے خواب آنکھوں کے درپچے وا تو تھے لیکن ان میں انتظار کی کوئی رمق نہ تھی۔ ہونٹوں پر مہیب سانسنا تھا۔ وہ تو اتنی بلندی سے ایکا ایکا کی یوں گری تھی کہ چور چور ہو گئی تھی۔

ڈرتے ڈرتے خالد نے نومی کی طرف دیکھا اور اس کی نظریں نومی کے چہرے پر خود بخود اٹک گئیں۔ رات کی نومی اور اب کی نومی میں بہت فرق تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

”نومی“ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے لوٹ رہی تھی۔
نومی شرمائی نہ لجائی۔ سمٹ کر دوہری بھی نہیں ہوئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صرف اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بڑے پیار سے اس کا برف کی طرح مخ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر آہستگی سے اس کا حسین ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

نومی اس غیر متوقع حرکت سے حیران رہ گئی۔ اور جب خالد نے بڑی اپنائیت سے اپنا بازو اس کی کمر کی طرف بڑھایا۔ تو اس کا چہرہ گلزار ہو گیا۔ بے خواب آنکھیں مخمور و

معمور ہو گئیں۔

خالد نے اس کی طرف دیکھا اس چہرے نے پھر اس کے من میں ہلچل مچائی نفرت کا ریلا امنڈا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یہ ریلا ان حسین لمحوں کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا خالد نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے بتی گل کر دی۔ وہ اپنے فیصلے کو تباہ نہیں کر سکتا تھا وہ قربت کے ان حسین لمحوں کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نومی کو اس کی صحت مندی کے باوجود اپنے آپ سے دور نہیں رکھ سکتا تھا۔

رات بڑی سرعت سے گزر گئی۔ کل کی طرح اس کے سانس اٹکے اٹکے نہیں تھے نہ ہی لمحوں نے صدیوں کا روپ دھارا تھا۔ آج رات تو پلک جھپکتے میں بیت گئی تھی نومی کا انگ انگ مسکرا اٹھا تھا۔ چاہتوں کے طوفان ٹوٹ پڑے تھے نا۔ اس نے کل رات کی بے رخی و بیزاری کا خالد سے پوچھا۔ نا خالد نے ان کو فت زدہ گھڑیوں کا تذکرہ کیا۔ حال کا ظلم ایسا مسور کن تھا کہ کچھ پوچھنے کچھ بتانے کی نوبت ہی نہ آئی۔

نومی دھیرے دھیرے بستر کے قریب آئی۔ کروٹ کے بل لیٹے خالد پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے بڑے پیار سے آگے کو جھک کر اس کا چہرہ چھوا۔

خالد نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلا احساس اتنا آتشیں تھا کہ اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں۔

اور جب کچھ نہ سمجھتے ہوئے معصوم نومی نے زور سے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ تو وہ بے اختیار ہو گیا۔ نومی کو جھٹکے سے پرے ہٹاتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ ”تم تم روشنی میں میرے سامنے نہ آیا کرو۔“

نومی کے ہونٹ تک سپید پڑ گئے۔ وہ اس عجیب و غریب منطق کو سمجھ نہ سکی خالد اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا اور گھنٹہ بھر بعد جب وہ تیار ہو کر باہر نکلا تو نومی کے شیش محل چمکانا چور ہو گئے تھے۔

کوفت زدہ گھڑیوں اور طلسماتی لمحات کا مغلوبہ بھی عجیب ہی تھا۔ دن انہی کے سنگھم میں گزرنے لگے خالد کبھی سراپا محبت اور کبھی مجسم نفرت بنارہا۔ نومی ماحول کی ناہمواری

آئیڈیل

سے نمٹنے کی کوشش کرتی رہی۔ دونوں نبھاہ کر لینے کے باوجود اکھڑے اکھڑے رہے۔ خالد پر کبھی کبھی تو جنونی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کا بے ساختہ جی چاہتا کہ نومی کو دھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑ ڈالے۔ اس کی رگوں میں بہتا ہوا سرخ سرخ خون سارے کا سارا بہا ڈالے۔ اس کے ہونٹوں سے شگفتگی چھین لے۔ اس کے چہرے سے تروتازگی نوج لے۔ ایسی جنونی کیفیت میں وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو رکھتا۔ اکثر گھر سے باہر نکل جاتا اور نومی بپاری معصوم سی پیاری لڑکی جیسے آگ لگتی رہتی غم اسے اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرنے لگتا۔

یہ کمبخت غم بھی تو اپنا دارا کا ایک کی نہ کر سکتا تھا۔ جب وہ بے حد اداس ہوتی تو خالد کا رویہ ایک دم بدل جاتا۔ اور پھر تاریک راتیں بھی تو اس کے لئے پر امید صبحیں بن جاتیں زندگی عجیب ڈھنگ سے گزر رہی تھی۔ نومی کی خودداری بھی آڑے آرہی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ناہموار حالات سے کوئی آگاہ ہو اور پھر خالد پر بھی تو اسے ترس آتا تھا۔ وہ جب اس کی ذہنی حالت کے بارے میں سوچتی تو بے پناہ جذبہ ترحم ابل پڑتا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ خالد کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے چلے اس کے لاشعور میں کھولتی نفرت کا سراغ لگائے۔

کشتی طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر ہی تھی کہ خالد کو ملک سے باہر جانے کا کورس مل گیا۔ چھ ماہ کا کورس تھا۔ وہ نومی کی قربت کی کشش سے بڑے تذبذب میں تھا۔ ذہنی سکون کے لئے چھ ماہ کافی تھے۔ سکون اور اطمینان کی بے بہا دولت اسے میسر آ گئی۔ لیکن خوشی کے باوجود دل اندر ہی اندر دکھ بھی گیا۔ نومی سے چھ ماہ کی یہ جدائی بھی سہل نہ تھی نفرتوں کے درپردہ محبتیں بھی تو جلوہ گر تھیں۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

نومی کا جی چاہتا تھا وہ بھی اس کے ساتھ جائے لیکن خالد نے تو اشارتا بھی ایسی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ غیور تو تھی۔ دل چاہتا رہا۔ لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

خالد چلا گیا۔

آئیڈیل

اور نومی بے کیف زندگی کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں مزید گرہیں ڈالتی گئی۔ اب تو غم اپنا تھا۔ اور غم کو غلبہ کرنے کی کھلے بندوں چھٹی، وہ پکھلنے لگی۔

وقت ریگتار ہا۔ ایک دو تین اور پھر چوتھا مہینہ بھی گزر گیا خالد کا خط ضرور آتا لیکن روح جس جذبے کی متلاشی ہوتی۔ وہ خط کی بے نور سطروں سے کبھی نہ جھانکتی۔

نومی کے والدین بہنیں بھائی۔ دوست ملنے جلنے والے سبھی اس کی بگڑتی حالت سے تشویش محسوس کرتے لیکن نومی سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے دیئے جلا کر انہیں مطمئن کر دیتی۔ یوں بھی امید سے تھی وہ بھی شاید ان عورتوں میں سے تھی جو اپنا سارا رنگ روپ حسن نکھار شگفتگی تازگی اپنے بچے میں منتقل کر دیتی ہیں۔

بچے کی ولادت نومی کی بیماری کا بہانہ بن گئی۔ گول مٹول صحت مند بچہ خالد کا سامنا کہ نقشہ نومی نے اپنی صحت حسن اور تازگی دے کر اس کو تخلیق کیا تھا۔ اتنا پیارا تھا وہ نومی سوچتی شاید اسے دیکھ کر ہی خالد اپنی ذہنی الجھنوں سے نجات پا جائے۔ موہوم سی امید تھی۔ جس کے سہارے وہ بیماری سے نبرد آزما تھی۔

چھ ماہ بعد جب خالد واپس لوٹا۔ تو نومی سے ملنے کے لئے بے چینی کے باوجود دل میں خوف بدستور رہا تھا۔ وہ اسے ایئر پورٹ پر لینے نہیں آئی تھی۔ بڑی بے تابی سے اس نے اپنا استقبال کرنے والوں سے اس کے متعلق پوچھا تھا۔

نومی ہسپتال میں اپنے بیڈ پر نحیف و نزار پڑی تھی۔ اس کے ہونٹ مرجھا چکے تھے۔ چہرہ زرد تھا۔ کمزور مضمحل اور نڈھال سی سپید بستر پر پڑی تھی۔ اس کا دل ڈوب ڈوب رہا تھا۔ خالد کے آنے کی خوشی اپنی جگہ لیکن اپنی حالت دیکھ رہی تھی اس حسن کو جس کے ہر زبان پر چرچے تھے خالد قبول نہ کر سکا تھا۔ اب اس حالت میں جب اسے اپنے وجود سے خود ہی کوفت ہوتی تھی۔ خالد کا جانے رویہ کیا ہوگا۔

خالد گھر نہیں گیا۔ ایئر پورٹ سے سیدھا ہسپتال پہنچا۔ نرس بچہ لئے دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ خالد نے بچے کو نہیں دیکھا اس کی نظر نومی پر پڑی وہ سکتے میں آ گیا۔ نومی کے بھائی نے اسے سہارا دے دیا۔ ورنہ شاید وہ گر جاتا۔ اس کی حالت

گل پروشے

کسی نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔
لیکن

پروشے کی سیاہ آنکھوں میں چاندنی کے لہراتے عکس اور اس کے وجود میں
انگڑائیاں لیتا ہوا خمار چونکا دینے کو کافی تھا..... اس نے نظر بھر کر اسے نہیں دیکھا تھا۔
لیکن کچھ باتیں اپنا آپ یونہی منوالیتی ہیں.....
وہ کل شام ہی گاؤں آیا تھا۔

اس کا گاؤں لنڈی کوتل کے بے آب و گیاہ پہاڑی علاقے میں تھا۔ پتھریلے
پہاڑوں کے اس چھوٹے سے گاؤں میں اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ موٹے موٹے بائیوں
والے بان کے دو پلنگ ایک ٹوٹا پھوٹا صندوق چند مٹی اور سلور کے برتن اور دیوار سے
لٹکتی ایک بندوق..... اس کمرے کی کل یہی کائنات تھی۔

کمرے کے باہر دروازے کے قریب ہی مٹی کا بے ڈھب سا چولہا تھا۔ جس میں
راکھ کی دھول اڑتی رہتی۔ گل پروشے اپنی سکھیوں سہیلیوں کے ساتھ جھاڑیاں توڑتا
کر لے آیا کرتی..... اور ماں اسی گھاس پھوس اور خاردار جھاڑیوں کو جلا کر مٹی کی موٹی
موٹی روٹیاں پکا لیا کرتی۔ یہ روٹیاں کبھی سرخ مرچوں کی چٹنی کبھی بغیر گھی کے ابلے
ساگ اور کبھی خان محبوب خان کے گھر سے لائی ہوئی لسی سے نگل لی جاتیں.....

دگرگوں تھی۔ اس کے ذہن میں قیامت خیز تلاطم تھا۔ اس کے سامنے نومی کا چہرہ تھا۔ وہ
چہرہ جسے اس کی روح برسوں سے تلاش کر رہی تھی۔ جس کے لئے وہ مدتوں سے بھٹک
رہا تھا۔ جو اس کے اندر کی آواز تھی۔ جو اس کی محبت کی انتہا تھی جو اس کے عشق کا دیوانہ
پن تھا۔ کندھا چھڑا کر وہ تیر کی تیزی سے بڑھا اور لوگوں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر
نومی سے لپٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر آپوں آپ لفظ تھرا رہے تھے۔ ”تم کہاں تھی
نومی۔ میں تو مدتوں سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ میں نے تمہیں پالیا ہے نومی
تمہیں پالیا ہے۔“

نومی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر نڈھال سی مسکراہٹ اپنے دیوانے کو
اس نے بھی اس سختی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اب کھودینے کا خیال بھی محال تھا۔

☆☆☆

آئیڈیل

رحمان گل کو گھر کی غربت بے چین رکھتی تھی۔ وہ آسودگی کا متمنی تھا۔ ماں اور بہن کے آرام و آرائش کے لئے وہ بہت کچھ سوچا کرتا تھا۔ لیکن اس کی سوچیں عملی جامہ نہ پہن سکتیں۔ ماں کے ایک ہی جھینٹ کے جوڑے میں اب اتنے پیوند لگ چکے تھے کہ یہ پتہ ہی نہ چلتا۔ یہ گھیر دار گرتہ۔ اور شلوار اصل میں کسی کپڑے کی بنی ہے۔ پروشے کی کالی اوڑھنی اور لال پھولوں والی جھینٹ کا فراک نما کرتہ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ پچھلے سال عید پر جانے کیسے ماں نے یہ دونوں چیزیں پروشے کو بنوا دی تھیں۔ پرانی شلوار پر ٹخنوں کی پٹیاں نئی لگا کر عید کا جوڑا برابر کر دیا تھا۔ گل پروشے کی سہیلیاں تو امیر ملکوں اور خانوں کی بیٹیاں تھیں۔ گل رحمان کئی بار پروشے کو زربینہ اور شیرین گل سے دوستی ختم کرنے کو کہہ چکا تھا..... وہ جب بھی اسے ٹوکتا۔ ماں بیٹی کی طرف داری میں بول اٹھتی۔ ”بچپن کی سہیلیاں ہیں رحمان گل دوستی چھوٹے بڑے کی تمیز سے عاری ہوتی ہے.....“

”گل لالہ کو تو خواہ مخواہ میری سہیلیوں سے بیر ہے“ اماں کی شہ پا کر گل پروشے برا سامنہ بنا کر بھائی کو دیکھتی۔

”ہم غریب ہیں گل پروشے.....“ رحمن گل اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ تو وہ ہنس کر کہتی ”تم بہت بہت پیسے کماؤ نا گل لالہ.....“

اور بہت بہت پیسے کمانے ہی کے لئے اس نے سنگلاخ اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے کئی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پشاور آ گیا تھا۔ جہاں محنت مزدوری کے مواقع زیادہ تھے۔

پشاور سے وہ پنڈی پہنچا تھا۔ اور پنڈی چند دوستوں سے صلاح مشورے کے بعد کراچی جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ کراچی میں ان کے کئی ملنے والے تھے۔ وہاں کام اور اجرت بھی اچھی تھی۔ بہت بہت پیسے کمانے کے مواقع کہیں زیادہ تھے۔

لیکن کراچی جانے سے پہلے وہ گھر آیا۔ ماں بہن کے لئے اس نے بہت سی چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ ماں کے لئے ایک جوڑا خریدا تھا۔ گل پروشے کے لئے ریشمی لباس

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

بنوایا تھا۔ سکے کے کڑے اور موٹے موٹے کلائی بند بھی لئے تھے۔ سنہری موتیوں کی مالا بھی خریدی تھی۔ اور چاندی کی جھالروں والے بالے بھی چھپا کر لایا تھا۔ وہ گل پروشے کے سامنے ایک ایک چیز باری باری رکھ کر اس کی خوشیوں کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے بالے چھپا رکھے تھے۔

اور

واقعی بالے پا کر تو وہ دیوانی سی ہو گئی تھی۔ فٹ کانوں میں ڈال ٹوٹے ہوئے ذرا سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

اور اسی وقت رحمان گل کو اس کی آنکھوں کی روپہلی چاندنی کچھ عجیب سی سرگوشیاں کرتی محسوس ہوئی تھی۔ اور جب وہ دو دو قدموں کا فاصلہ ایک ایک قدم میں طے کرتی زربینہ کو اپنے بالے دکھانے دوڑی..... تو انگڑائیاں لیتا نما اس کے وجود سے چھلک چھلک کر جانے کیا کہہ گیا۔ کہ رحمان گل چپ چپ سا ہو گیا۔ ماں اسے دعائیں دیتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگی۔ اور وہ صحن میں پڑی چار پائی پر جا کر اوندھا لیٹ گیا۔

شام کے دھندلے پھیل گئے۔ شام کی اداسی گہری ہو گئی۔ سنگلاخ پہاڑوں کے پتھریلے سینے کچھ اور سیاہ ہو گئے۔ ہوائیں بوجھل ہو گئیں۔ تو ماں نے آ کر پیار سے اس کا کندھا ہلایا.....

”سو گئے ہو گل“

”نہیں.....“

”تو پھر ایسے کیوں لیٹے ہو۔ آؤ اندر چل کر بیٹھو۔ یاد دوستوں ہی سے مل آؤ.....“

”ماں“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا لیا۔

”کیوں بیٹے“

”گل پروشے اتنی دیر سے گئی ہے۔“

”آ جاتی ہے..... تو بھی تو اتنی چیزیں اٹھا لایا۔ بھلا ان بالوں کی کیا ضرورت تھی۔“

جب شادی ہوتی.....“

”اس کی شادی کر دو ماں.....“

ماں ہنس پڑی۔ اور پھر اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ”اگلے پھیرے آئے گا۔ تو دونوں بہن بھائیوں کی شادی کر دوں گی۔“

”میری بات چھوڑو ماں۔ دیکھا جائے گا۔ ہاں گل پروشے اب خاصی بڑی ہو گئی ہے۔“

”بیٹا ہم غریب لوگ ہیں۔ بدلے کا رشتہ ہی موزوں ہے۔ زر خان اچھا لڑکا ہے اور اس کی بہن قمر مجھے بہت پسند ہے۔ نہ ہم کچھ دیں گے۔ نہ ان سے کچھ لیں گے۔ ان کا احسان ہو گا نہ ہمارا..... شادیاں بھی ہو جائیں گی قمر کی ماں کو تم پسند ہو اور گل پروشے بھی بہت عزیز..... بس اگلے پھیرے آؤ گے تو اللہ نے چاہا..... دونوں فرضوں سے سبکدوش ہو جاؤں گی.....“

”اگلے پھیرے.....“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ ماں اندر جانے کو مڑی.....

”ماں گل پروشے کو اب تک آ جانا چاہیے.....“

”تو اندر چلا آ۔ وہ بھی آتی ہی ہوگی۔“

”لیکن“

وہ اندر نہیں گیا۔ اس کی چھٹی حس بیدار تھی۔ اس کا دل کچھ کہہ رہا تھا۔ لہراتی چاندنی اور انگڑائیاں لیتا خمار بول رہا تھا۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ کتنی ہی دیر کھلے میدان میں ٹہلتا رہا۔ آسمان پر اب ایک اور تہا ستارے کی جگہ کئی ستاروں کی چمک دکھائی تھی۔ سیاہی مائل نیلا آسمان ابھرتے چاند کی روشنی میں اجلا اجلا لگنے لگا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ گل پروشے کو آ جانا چاہیے تھا۔ سہیلیاں اسے اتنی عزیز ہو گئیں۔ کہ گل لالہ کو چھوڑ کر اتنی دیر سے غائب تھی۔ وہ زرینہ کے گھر پہنچنے گیا۔ ڈیوڑھی پر بیٹھے بیٹے کئے ملازم نے بتایا۔ کہ وہ کتنی دیر سے

جا چکی ہے۔ شیریں گل کے ہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ وہ الجھا الجھا گھبرا یا واپس پلٹا.....

”شاید وہ گھر پہنچ چکی ہو.....“ یہی سوچتے ہوئے اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ گھر سے چند گز کے فاصلے پر اس نے پروشے کو تنہا مخالف سمت سے آتے دیکھا۔

”پروشے“

اس کے تحکمانہ انداز سے پروشے سہم گئی۔ گھبرا کر اس نے گل لالہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اندھیرے کی دھندلاہٹوں میں اسے چہرے کے تاثرات دکھائی نہ دیے۔

”کہاں گئی تھیں اتنی دیر سے“

”زرینہ..... زر.....“

”کہاں“

”ادھر اس کی خالہ رہتی ہے.....“

پروشے کی آواز گھبراہٹ اور جسم پر طاری لرزے کی کپکپاہٹ رحمان گل نے اسی لمحے محسوس کر لی۔ لیکن اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پاتے ہوئے سختی سے بولا ”گھر چلو۔“

وہ سر جھکائے بوجھل قدموں سے چل دی۔ اور رحمان گل اس پتھر۔ بے سنسان راستے کی طرف چل دیا۔ جدھر سے گل پروشے آ رہی تھی۔

وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی گھر تھا نہ در..... پہاڑی سلسلے دور تک چلے گئے تھے۔ اور پتھروں کے سینے کا تھی کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں اگی تھیں۔ وہ ایک اونچے پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

اچانک اس کی نگاہ ایک ہیولے پر اٹک گئی..... اسے یہ جاننے میں قطعاً دیر نہ لگی۔ کہ گاؤں کا کوئی نوجوان ہے کمر کا پٹک..... گھیردار قمیض اور کندھے پر بندوق وہ نیچے اتر رہا تھا۔ غالباً گھاٹی والے گاؤں کا آدمی تھا۔

رحمان گل کا پورا جسم تھرا اٹھا۔ لیکن اس نے سرنفی کے انداز میں زور زور سے جھٹکا۔ کسی دوسرے سے کسی اندیشے کو سراٹھانے سے پہلے ہی اس نے مار ڈالنا چاہا۔

لیکن

اس کے اندر کھد بد ہوتی رہی۔

رات ٹھیک طرح سے سو بھی نہ سکا۔ کروٹیں ہی بدلتا رہا۔ کئی بار اس نے سوئی پروشے کو دیکھا۔ لیکن شک جنم لے چکا تھا۔ کوشش بسیار کے باوجود وہ اسے اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکا۔

اور پھر کئی دن کھوج میں گزر گئے۔ گل پروشے باہر جاتی تو وہ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا۔ پروشے بھی اس کی آنکھوں کی خشکیوں سے سہم گئی تھی۔ باہر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ لیکن جب شام کے دھند لکے پھیل جاتے۔ اور آسمان کے سینے میں تنہا ستارہ اٹکا ہوتا۔ تو وہ بے چین ہو جاتی۔ پھر کسی نہ کسی بہانے گھر سے نکل ضرور جاتی۔

چند ہی دنوں میں رحمان سارے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ گل پروشے اور دلبر خان کو اس نے شام کے دھند لکوں میں قریب ہوتے دیکھا۔ اس کا خون کھول گیا۔ اس کی غیرت نے جوش مارا۔ رحمان گل کی بہن اور یوں عشق لڑاتی پھرے..... یہ ایک غیرت مند بھائی کہاں برداشت کر سکتا تھا۔

اس دن گل پروشے ڈری ڈری سہی سہی گھر میں داخل ہوئی تو رحمان گل نے اسے لکڑا۔

”گل پروشے“

”جی گل لالہ.....“

”ادھر آؤ.....“

”جی.....“

”کہاں سے آرہی ہو۔“

”وہ چپ رہی“

”سچ بٹا دو.....“

وہ ڈرنے لگی۔ اور گل رحمان اسے دونوں چٹیا سے گھسیٹا دھکا دے کر کمرے میں لے آیا۔ اس کی غیرت للکار بنی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا ماں درمیان میں نہ آ جاتی تو شاید اس کی کھولتی غیرت گل پروشے کو اسی وقت ختم کر دیتی۔ گل پروشے کو اس نے گھر میں قید کر دیا۔ اور خود دلبر خان کی نگرانی کرتا رہا دلبر خان روزانہ اسی جگہ آتا جہاں گل پروشے سے ملتا تھا۔ رات گئے تک وہاں بیٹھا انتظار کرتا رہتا.....

پھر کئی دن گزر گئے۔ اس کے ساتھی واپس جانے کو بے تاب تھے۔ کچھ واپس چلے بھی گئے۔ لیکن وہ کیسے جاسکتا تھا۔ اس کی عزت داؤ پر لگی تھی۔ اس کی غیرت کو لکڑا جا رہا تھا۔ دلبر خان اب اکثر گھر کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ زبردست قسم کا خاموش ٹکراؤ دونوں میں کئی بار ہو چکا تھا۔

رحمان گل دن رات محتاط رہتا۔ رات کو اپنی چارپائی عین دروازے کے آگے ڈال کر سوتا۔ ذرا سے کھٹکے سے بھی آنکھ کھل جاتی..... خوابوں میں بڑبڑاتا۔ گل پروشے کی شادی کے متعلق اب وہ بہت سنجیدہ تھا۔ زرخان سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر ہی وہ واپس جانا چاہتا تھا۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی..... اور معاملہ ختم ہو گیا۔

اندھی جوانی انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر بھری..... پروشے رات کے ایک بے سدھ حصے میں رحمان گل کے پلنگ کے نیچے سے رینگ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

سوتے میں ایک بھیا تک خواب سے گڑبڑا کر رحمان پلنگ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ روز جلنے والا دیا بجھا ہوا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سرہانے رکھی مارجس اٹھائی۔ دیا سلائی جلتے ہی جیسے کسی وزنی بم کے دھماکے سے سب کچھ اڑ گیا۔

آئیڈیل

گل پروشے کی چار پائی خالی تھی۔ اور بند کواڑوں کے ساتھ لوہے کی کندھی لٹک رہی تھی..... اس نے ایک دم دروازہ کھولا..... چاندنی میں صحن صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ وہاں کہیں بھی پروشے نہیں تھی۔ اس نے سارا صحن کونوں کھدروں تک دیکھ ڈالا۔ غصے اور غیرت کے بل کھائے طوفانوں میں گھرا وہ واپس کمرے میں آیا۔ جھٹکے سے دیوار سے بندوق اتاری..... دوسرے لمحے خوفناک آندھی کی طرح وہ صحن عبور کر کے باہر جا رہا تھا۔

اسے سمت اور جگہ کا تعین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ جانے کب سے گل پروشے یوں رات کے اندھیروں میں دلبر خان کی تنہائیاں آباد کر رہی تھی وہ جوش انتقام سے پھر رہا تھا۔ ضبط و صبر تڑپ رہے تھے۔ غیرت للکار رہی تھی۔ غیرت پکار رہی تھی۔

اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ گل پروشے اور دلبر خان کے سائے اسے کئی گز کے فاصلے ہی سے نظر آ گئے۔ ایک بہت بڑے پتھر پر گل پروشے بیٹھی تھی۔ اور اس کے عین سامنے پتھر پر ایک پاؤں رکھے دلبر خان قدرے جھکا کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ غالباً گل پروشے کے کندھے پر تھا۔

اس سے زیادہ کچھ دیکھنے کی اس میں تاب کہاں تھی۔ ایک دو تین اس نے اکٹھی گولیاں داغ دیں۔ فضا میں گولیوں کی ٹانخ ٹانخ میں گل پروشے اور دلبر خان کی آخری مشترکہ چیخ گم ہو گئی۔ گولیاں تو دو ہی کافی تھیں۔ اس کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جذبہ انتقام کی ٹھنڈک کے لئے اس نے ساری گولیاں دونوں پر ختم کر دیں۔

اور

پھر وہ پورے سکون اور اطمینان سے کراچی آ گیا۔ گل پروشے کو یاد کر کے اسے کبھی افسوس نہ ہوا۔

ہاں یہ افسوس ضرور ہوتا..... کہ ماں نے گل پروشے کی جوانی کے اٹھتے طوفانوں کو پہلے سے محسوس کیوں نہیں کیا۔ فتنہ بیدار ہوتے ہی پکلا جاتا۔ تو نوبت یہاں تک نہ

آئیڈیل

پہنچتی۔

کراچی میں اس نے بہت جگہ قسمت آزمائی کی۔ مزدوری کی۔ ڈرائیوری کی چوکیداری کی۔ ٹک کے ایک جگہ وہ کبھی نہ رہ سکا۔ کبھی خود سری پر نکالا گیا۔ کبھی مالک سے تلخ کلامی کی۔ کبھی اپنے حقوق بے جا استعمال کرنے کی وجہ سے جواب ملا۔ کہیں طاقت کا بیجا مظاہرہ کرنے پر۔

وہ کئی بار واپس اپنے گاؤں جانے کے لئے تیار ہوا۔ اب اسے کون سا گل پروشے کے لئے نئی نئی چیزیں خریدنا تھیں۔ لیکن دوستوں نے جانے نہیں دیا۔

ان دنوں وہ ایک امیر ترین اور مغرب زدہ گھرانے سے منسلک تھا..... ڈرائیوری اور چوکیداری کے فرائض اس کے قد و قامت ڈیل ڈول اور طاقت کو دیکھتے ہوئے سوچے گئے تھے۔ ڈرائیوری تو برائے نام ہی تھی۔ کیونکہ اس گھر کی عورتیں مرد حتیٰ کہ تیرہ چودہ سالہ بچے بھی گاڑی چلاتے تھے..... چوکیداری کا فرض پوری طرح اس کے ذمہ تھا۔

”اس گھر کی پوری پوری حفاظت کرنا ہے خان.....“ اسے ملازم رکھتے وقت سیٹھ یونس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے تن کر کہا تھا۔ ”پورے دل و جان سے کروں گا صاحب“ وہ واقعی اپنے فرض کی ادائیگی دل و جان سے کرنے لگا.....“ لیکن

کچھ عرصہ بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ اس محل نما کوٹھی میں ڈاکو اور لٹیرے بلا روک ٹوک آتے ہیں۔ لیکن ان لٹیروں اور ڈاکوؤں کو کچھ کہنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ کیونکہ یہ بڑے صاحب کے دوستوں کا روپ دھارے ہوتے بیگم کے ملنے جلنے والے نادیدہ بی بی کے فریڈ ہوتے۔

نادیدہ بی بی سیٹھ یونس کی جواں سال بہن تھی۔ بالکل ویسی جیسی اس کی گل پروشے

آئیڈیل

بہن تھی۔ گل پروشے کی آنکھوں میں لہرانے والی چاندنی اور وجود میں انگڑائیاں لینے والا خمار اس نے نادیہ میں بھی محسوس کیا تھا۔ اور وہ کانپ کانپ گیا تھا۔ غیرت سینے میں طوفان اٹھانے لگی تھی.....

پھر وہ سائے کی طرح نادیہ کا نگران رہنے لگا۔

اکثر اسے کالج چھوڑنے جاتا۔ اور واپس لاتا۔

نادیہ اپنی گاڑی میں اکثر ایک دبے پتلے شوخ شوخ لباس والے ہی لڑکے کو لفٹ دیا کرتی تھی۔ پہلے تو وہ چپ رہا۔ لیکن جب سامنے والے چھوٹے سے گول آئینے میں نادیہ اور پپی لڑکے کی حرکتیں بے ہودگی سے بھی آگے نکلنے لگیں تو اس سے خاموش نہ رہا گیا۔ نادیہ کو اس نے بری طرح ڈانٹا۔

ایک ملازم کی اس گستاخانہ حرکت کو نادیہ کیسے برداشت کر لیتی۔ غصے سے لال انگارہ ہوتی چیخ اٹھی۔ ”اویوشٹ اپ.....“ آئندہ ایسی بات کی تو نوکری سے نکلوادوں گی.....“

نوکری کی تو اسے خاک پرواہ تھی۔ وہ محض اس لڑکی کی نگرانی کے لئے وہاں ٹکا رہا تھا۔ جو گل پروشے تھی جو اس کی نہیں تو یونس کی بہن تھی۔

بہن

غیرت اور عزت کا علامتی نشان۔

نادیہ باز نہیں آئی۔ باز آتی بھی کیسے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ اکثر بڑے بڑے فنکشن ہوتے۔ عمر کی قید ہوتی نہ رشتوں کی تمیز۔ یونس مسز یونس اور نادیہ رنگ رلیوں میں مست ہوتے..... ان کے ساتھ ان کے دوست ان کے فرینڈ طوفان بدتمیزی اٹھائے رہتے۔

اور اس کا خون کھولتا رہتا۔

کئی دفعہ اس نے دیکھا نادیہ یونس کے سامنے ہی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بازو میں بازو ڈالے کھڑی ہے۔ اس پپی لڑکے کے ساتھ ناچتے ہوئے بھی اس نے کئی بار

آئیڈیل

اسے دیکھا۔ وہ اسے چاندنی راتوں میں گھنٹوں چمن میں لئے پھرتا.....“ مدہوشی اور مستی کی کیفیت دونوں پر طاری ہوتی۔

اس رات بھی یہاں ایک بہت بڑا فنکشن تھا۔ بدستی کا دور دورہ تھا۔ شراب و کباب کی محفل تھی۔ بیاہے بن بیاہے سب ایک ہی رنگ میں رنگے تھے۔ ہاؤس کے شور سے فضا معمور تھی۔ وہ برآمدے میں ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ خاصا بے چین اور پریشان..... رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے نادیہ اور وہ لڑکا برابر والے دروازے سے دبے قدموں سے نکلے اور چمن میں اتر گئے تھے۔

وہ بے تابی سے ان کی واپسی کا منتظر تھا۔

لیکن کافی دیر گزر چکی تھی۔ وہ لوٹے نہیں تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گل پروشے۔

جا کر ابھی نہیں لوٹی.....

اس کے سینے میں کچھ ویسے ہی جذبات تھے۔ مدوجزرا ٹھہر رہے تھے طوفان بل کھا رہے تھے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ وہ برآمدے سے چمن میں آ گیا۔ اور اس کی نظریں نادیہ اور اس پپی لڑکے کو ڈھونڈنے لگیں۔

آج بھی چاندنی چار سو پھیلی ہوئی تھی..... اور ہواؤں میں بے مہری سی تھی۔ وسیع و عریض چمن میں ادھر ادھر دیکھتے وہ غیر ہموار سانس لے رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج ایک بار پھر گل پروشے غیرت کا نشانہ بن جائے گی۔

گھنے درختوں تلے سے گزرتے ہوئے اس نے عجیب و غریب مدہم مدہم آوازیں سنیں۔ تیز تیز جلتے جلتے سانسوں اور گھبراہٹوں میں تیرتی سرگوشیوں کی۔ وہ رک گیا۔

اور

پھر

اس نے جو کچھ دیکھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔
گل پروشے اور دلبر خان کو تو اس نے محض قریب قریب کھڑے دیکھا تھا۔ یہاں تو۔

..... یہاں تو.....

اس کے پاس پستول ہوتا، تو وہ گل پروشے کو ایک بار پھر قتل کر دیتا۔

جب وہ اپنے حواس میں آیا، تو اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ آج وہ یونس کو بتائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نادیہ یونس کی بہن تھی۔ بالکل ویسی جیسی گل پروشے اس کی بہن.....

بڑی مشکل سے وہ ڈرائنگ روم سے یونس کو برآمدے میں کھینچ کر لایا۔ وہ بہکا ہوا تھا..... مسز نصرانی کی نرم و گداز بانہوں کے سہارے وہ کتنے مزے سے ڈول رہا تھا رحمان گل پر غصہ بھی آیا۔ لیکن ضبط کر گیا۔

”کیا کہنا ہے“ اس نے تیزی سے پوچھا.....

صاحب وہ..... وہ نادیہ بی بی اور وہ..... پپی لڑکا.....“ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”کیا ہوا انہیں“

”دونوں چمن میں ہیں.....“

”بے وقوف.....“ یونس غصے سے پاؤں پیٹتے ہوئے واپس مڑا.....“ یہ بھی بتانے کی بات تھی۔ بے وقوف کہیں کا.....“

وہ زیر لب گالیاں دیتے ہوئے اندر جانے کو مڑا۔ لیکن گالیوں کے تازیانے کھا کر بھی اس نے اس کا بازو کھینچ کر کہا۔ ”آپ کیسے بھائی ہیں۔ نادیہ آپ کی بہن ہے..... عزت ہے۔ غیرت ہے۔ اور یہ عزت و غیرت داؤ پر لگی ہے صاحب..... آپ“

یونس نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا..... اور مسکراتے ہوئے بولا ”سودا گھائے کا نہیں رحمان گل.....“

وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

یونس بہکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا ”جانتے ہو۔ یہ لڑکا کون ہے؟ اس افسر کا بیٹا ہے جس سے تین لاکھ کا منافع کمانا ہے ہم نے..... صرف اس کے دستخط کرنے کی دیر ہے۔ تین لاکھ..... پورے تین لاکھ..... غیرت، عزت..... سب تم جیسے جاہلوں کی جذباتیت ہے“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اندر چلا گیا۔

اور

رحمان گل پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

غیرت عزت اور جاہلیت اس کے ذہن میں یہ تینوں لفظ قیامت خیز طوفان کی طرح ٹکرا رہے تھے۔

اسے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ یونس نادیہ کا بھائی ہے۔

☆☆☆

فریب

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر میز پر پڑی۔ نیلے رنگ کا لفافہ گلدان کے نیچے پڑا تھا۔ کتابیں پلنگ پر پھینک کر وہ بے تابی سے لفافہ پر جھپٹا۔ یقیناً یہ شکیلہ ہی کا خط تھا۔ ہمہ شوق اس نے لفافہ ہاتھوں میں لیا۔ پتہ وہی تھا جو اس نے شکیلہ کو لکھا تھا۔ ”مس عطیہ رحمان!“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہاں نہ شوق سے لفافہ چاک کرتے ہوئے قریبی کرسی پر آڑا ترچھا پڑ کر خط نکال کر پڑھنے لگا۔

خط مس شکیلہ ہی کا تھا۔

”پیاری عطیہ..... سلام شوق!“

میں نے قلمی دوستی کے لئے رسالے میں اپنا پتہ دیا تھا اس سلسلے میں مجھے کئی خطوط موصول ہوئے ہیں لیکن آپ کی تحریر میں کچھ ایسا جادو ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ یہ سلسلہ منقطع نہیں کریں گی اور یوں ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔“

اس کے بعد شکیلہ نے اپنے مشاغل لکھے تھے۔ اسے خط لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھانے نئے لوگوں سے دوستی کی خواہش بھی شدید تھی بڑی چاہت سے اس نے اس خط کا جواب طلب کیا تھا۔ انتظار کی زحمت گوارہ کرنے کی تاب ہی نہ تھی اس میں۔

خط کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھنے کے بعد اس نے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا اس

کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھیں آنکھیں شوخ شوخ سی چمک لئے تھیں اس خط سے جو اپنائیت پھوٹ رہی تھی اس کا جواب دینے کو وہ مضمون سوچ رہا تھا۔

چند دن ادھر کی بات تھی، وہ کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا عام سار سالہ قلمی دوستی کے عنوان سے ایک پورا کالم تھا جس میں لڑکے لڑکیوں کے پتے مع ان کے مشاغل کے لکھے تھے اسے جانے کیا سوچھی شکیلہ احمد نام اچھا سا لگا اس کے مشاغل بھی پسند آئے پہلی فرصت میں اس نے اسے خط لکھنے کا سوچا اور پھر مس عطیہ رحمان کے فرضی نام سے خط لکھ دیا شغل یہ خط لڑکی بن کر لکھا آج جواب متوقع تھا۔ کالج سے آتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ صبح ملازم کو تاکید کر گیا تھا کہ مس عطیہ رحمان کے نام کوئی خط آئے تو اماں کو بتائے بغیر اس کے کمرے کی میز پر رکھ دے۔

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا اک انوکھی سی خوشی اک انجانا سا سرور اس کے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ کچھ پالینے کا احساس آپوں آپ من میں ابھر رہا تھا شاید اس لئے کہ کسی لڑکی کی طرف سے اس نے یہ پہلا خط پایا تھا۔

اسی دن اس نے شکیلہ کو خط لکھ دیا بڑے محتاط انداز میں لیکن اس کا جذبہ شوق ایک ایک لفظ سے ٹپکتا تھا یہ خط بھی لکھا تو مس عطیہ رحمان بن کر لکھا لیکن نفس مضمون یہی تھا کہ آپ کیسی ہیں شکل و صورت کیسی ہے۔ رنگ سپید ہے یا گندمی، بال سیاہ ہیں یا سنہری، آنکھوں کی رنگت نیلگوں ہے یا تیر و تار رات کی سی۔ بڑی بے تاب سی تحریر تھی۔ ایک ایک لفظ کو زبان مل گئی تھی۔

خط پوسٹ کر کے وہ آیا تو انتظار کے لمحے اسی وقت سے کوفت دینے لگے۔ وہ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ شکیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر مستقبل آئینے کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ اس آئینے میں شکیلہ کا پیکر تھرک رہا تھا۔

رات بھر وہ بے چین سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ سوتے جاگتے میں رنگین خواب بنتے بگڑتے رہے۔ پہلا خط تو اس نے محض شغل لکھا تھا۔ لیکن دوسرے خط میں وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

حسب توقع چوتھے دن خط کا جواب آ گیا۔ شکیلہ نے بھی کچھ اس کی سی بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ اسی کے الفاظ لوٹائے تھے۔ بڑی محبت سے لکھا تھا ”پہلے آپ اپنے متعلق بتائیے، پھر میں لکھوں گی۔ ویسے یہ کہہ دوں کہ میں بد صورت نہیں ہوں۔ دیکھنے والے تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ خدا جانے مبالغہ آرائی کرتے ہیں یا سچ!“

اس کے بعد کچھ رسمی سی باتیں تھیں اور آخر میں جواب کا شدت اور بے چینی سے انتظار کا بار بار لکھا تھا۔

اس خط سے بات آگے بڑھ گئی۔ شکیلہ یقیناً بہت خوبصورت تھی اس دفعہ تو اس نے اپنے خاندان کے متعلق بھی اشارتاً لکھا تھا۔ بہت باوقار خاندان سے تعلق تھا اس کا۔ عمر بھی تحریر کی تھی۔ دور قیامت تھا۔ وہ تو خط پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا۔ اپنی قسمت پر آپ ہی رشک آنے لگا۔

رات ایک بجے تک اپنے رائٹنگ ٹیبل پر جھکا وہ شکیلہ کو محبت نامہ لکھتا رہا۔ گویا بھی خط مس عطیہ کی طرف سے تھا۔ لیکن آج تو الفاظ پکار پکار کر اعلان محبت کر رہے تھے۔ جن جن کر اس نے لفظ لکھے تھے..... ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے تحریر کئے تھے۔ انداز آج بھی محتاط تھا۔ خط لکھ کر کئی بار پڑھا۔ مبادا کہیں مذکر مونث کی غلطی نہ ہوگئی ہو۔ پھر اس نے مطمئن ہو کر لفافہ بند کیا اور صبح پوسٹ کرنے کے لئے ہش شرٹ کی جیب میں ڈال کر بستر پر آ گیا۔ وہ اطمینان سے سونہ سکا ایک عجیب قسم کی کھلبلی سی من میں مچی تھی۔ زندگی کے اس حسین لیکن عجیب اتفاق سے وہ مسحور ہو رہا تھا۔

پھر چوتھے دن شکیلہ کا خط آیا۔ حسب سابق رعنائیاں، شادایاں اور دلفریبیاں لئے۔ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والی بات تھی شکیلہ نے تو اپنی تحریر سے اس بار اس کا جذبہ شوق کچھ اس طرح بھڑکا دیا تھا کہ وہ بے پئے مدہوش ہو گیا تھا۔

اور پھر یونہی خطوط کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہر خط نامہ محبت ہوتا۔ ہر خط میں بے چینی ہوتی۔ انتظار کی صبر آزمائی کیفیتوں سے دو چار دونوں ہی تھے۔

پھر اسے صبر کا یارا نہ رہا۔ کب تک وہ مس عطیہ رحمان بن کر اپنے جذبات کو

دبائے رکھے گا۔ محبت کی جس منزل پر وہ تحریروں کے رابطے سے پہنچ گیا تھا۔ وہاں یہ راز راز رہنا نہیں چاہیے تھا۔ کیوں نہ وہ شکیلہ کو بتا دے کہ وہ مس عطیہ رحمان نہیں آصف رحمان ہے۔

آصف رحمان جو ان دیکھی شکیلہ سے محبت کی اونچی اونچی سرحدیں پھلانگ کر ملنے کا تمنا کی ہے۔ شکیلہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی جسے اس نے محبت کی شدتوں سے چاہا اور اپنا لینے کا عہد کر لیا ہے۔

وہ کئی دن سوچتا رہا۔ اس کے آخری خط کا جواب بھی اسی سوچ کی نذر ہو گیا۔ شکیلہ شاید اس سے بھی دو قدم آگے نکل چکی تھی۔ تیسرے دن پھر خط آ گیا۔ جس میں دم توڑتی بے تائیاں تھیں۔ گلے تھے، شکوے تھے۔ جواب میں تاخیر آ کر ہوئی کیوں؟ اس نے اس کیوں کا جواب طلب کیا تھا۔

وہ شش و پنج کی حالت سے نکل چکا تھا۔ اس نے انکشاف کا تہیہ کر لیا تھا۔ قلمی دوستی حقیقت کے روپ میں سامنے آ گئی تھی۔ اب اسے مزید راز میں رکھنا نہیں جاسکتا تھا۔ اور تو اور اس نے تو اماں سے بھی دل کی بات کہہ دی۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ اپنی بات منوالینے کی اسے عادت تھی۔

”اماں۔ آپ کو بہو چاہیے نا!“

”کیوں نہیں، تو جلدی سے امتحان دے لے پھر بہو بھی لے آؤں گی۔“

”پسند تو امتحان سے پہلے بھی کی جاسکتی ہے نا!“

”میری پسند آپ کی پسند ہوگی اماں.....“

اور پھر اس نے پوری تفصیل کے ساتھ شکیلہ کے بارے میں اماں کو بتا دیا۔ اپنے بیان میں کچھ ایسی رنگ آمیزی کی کہ اماں بھی بنا دیکھے لڑکی کے حسن و جمال، اس کے باوقار خاندان اور اس کے بلند کردار سے متاثر ہو گئیں۔

اسی رات اس کے خط میں انکشافی لمحہ پھٹ پڑا۔ اس نے اپنے متعلق پوری تفصیل سے شکیلہ کو لکھ دیا۔ اپنے خاندان، اپنی مالی حیثیت۔ اپنی جائیداد سب کے متعلق بڑی

آئیڈیل

تفصیل سے لکھا۔ شکلیہ کے گھر جانے اور اپنی اماں سے اس کے والدین کا تعارف کرانے کا بھی شوق سے لکھا۔ اس خط میں اس نے اپنی ایک خوبصورت سی تصویر بھی ملفوف کی۔ اس تصویر کے جواب میں شکلیہ کی تصویر بھی مانگی اور پھر جتنے جملے وہ وضع کر سکتا تھا۔ جتنے الفاظ وہ تلاش کر سکتا تھا۔ خط کے جواب کے ضمن میں اس نے لکھ دیئے۔ خط پوسٹ کر کے وہ انتظار کے ایک ایک لمحے کی کوفت سہنے لگا۔ حسب توقع چوتھے دن خط آ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ لفافے پر جھپٹا جو میز پر چشم انتظار کی طرح بڑا تھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ تین دن اس نے بڑی صبر آزمائی کیفیتوں سے گزارے تھے۔ کبھی امید بندھ جاتی تھی۔ اور کبھی ناامیدی کے سیاہ دھند لکے چھا جاتے تھے کیا خبر شکلیہ برا مان جائے۔۔۔ اسے دھوکہ باز جیسے لفظ سے نوازے اس کے حسین محل چکنا چور کر دے۔

خط کھولنے سے پہلے وہ دھڑکتے دل سے نفس مضمون کی قیاس آرائی کر رہا تھا۔ بند لفافے کو اس نے انگلیوں سے ٹٹولا۔ لفافے میں تصویر تھی۔ تصویر..... شکلیہ کی تصویر..... فرط مسرت سے اس کا جی چاہا ناچنے لگے۔ شکلیہ نے اگر برا مانا ہوتا تو کبھی اپنی تصویر نہ بھیجتی۔ خط کا جواب ہی نہ دیتی۔

وہ کرسی میں دھنس گیا۔ دل اب بھی دھک دھک کئے دے رہا تھا۔ چہرہ اندرونی مسرتوں کے پرتو سے چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں خمار تھا۔ اور انگ انگ عجیب سے تشنخی اکڑاؤ سے ٹوٹنے لگا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھولا۔

تصویر نکالی.....

اور

حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ تصویر کو الٹا پلٹا۔ کرسی پر آگے جھک آیا۔ لفافے کو دیکھا اور پھر تصویر پر نظریں جمادیں۔ اس میں کوئی خط نہیں تھا۔ پیڈ کے

آئیڈیل

نیلے کاغذ میں صرف تصویر تھی۔

کسی نوجوان کی تصویر.....

جس کی پشت پر صرف اتنا لکھا تھا۔

فقط شکلیہ احمد

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

ستھری تھی دورو یہ گھنے درخت تھے اور ان درختوں کے عقب میں بڑی بڑی محل نما کوٹھیاں تھیں سرمئی سڑک ان کوٹھیوں کے قدموں میں مچلتی دو تین فرلانگ تک جا کر بڑی سڑک سے جا ملتی وہیں پر بس سٹاپ تھا۔

یہ راستہ کافی لمبا تھا۔ لیکن روز وہ اسی راستے دفتر جاتا۔ اس سرمئی کشادہ اور صاف و شفاف سڑک پر تقریباً ٹہلے ہوئے وہ بس سٹاپ تک جاتا۔ گلیوں کی گھٹن جس اور سیلن کا احساس اس خوبصورت سڑک پر آ کر اپنے آپ مٹ جاتا..... مہک سے لدی ہوئیں جب اس کے نتھنوں میں گھٹیں تو اس پر مستی سی چھا جاتی۔ دائیں بائیں پھیلے کوٹھیوں کے وسیع و عریض چمن دیکھ کر اسے بڑی تسکین ملتی..... شاید یہ تسکین جھوٹی ہوتی..... لیکن اس نے اپنے گرد اگر دھوٹ ہی کا تانا بانا تو بن رکھا تھا۔ شخصیت کے گرد جھوٹ ہی کا سنہری خول تو چڑھا رکھا تھا۔ اتنا لمبا راستہ اختیار کرنے میں بھی تو اسی جھوٹ کا دخل تھا۔ کوٹھیوں کے سامنے سے وہ جس شان جس ادا سے گزرتا..... دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا کہ وہ انہی میں سے کسی کوٹھی کا مکین ہے۔ کتنا لذت بخش سرور ملتا تھا اسے جب کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس سے بات کرتا.....

اس کا تعلق تو نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ بند بند تاریک گلی میں دو کوٹھڑی نما کمروں اور ناپختہ چھوٹے سے صحن والے گھر میں اپنے بوڑھے والدین ڈھلتی عمروں کی کنواری بہنوں۔ دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بیوہ پھوپھی کے تین چار نواسے نواسیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ معمولی کاروبار کرتا تھا۔ بڑی ہمت اور محنت سے اس نے اسے ایف اے تک تعلیم دلوائی تھی۔ اور پھر بڑی دوڑ دھوپ..... بڑے بڑے لوگوں کی غلامی کر کے انکم ٹیکس آفس میں بطور کلرک بھرتی کروا دیا تھا۔ اڑھائی تین سو کی آمدنی اس کنبے کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ لیکن وہ اس آمدنی کا بیشتر حصہ اپنی ذات کے رکھ رکھاؤ اور بنانے سنوارنے پر خرچ کر دیتا تھا۔ غربت زدہ والدین کبھی صدائے احتجاج بلند بھی کرتے..... تو وہ بگڑ جاتا۔

”جوتا کپڑا بھی نہ خریدوں..... مجھے اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔ دفتر جاتا

غیر متوقع

صرف دو ہی تو گلیاں پڑتی تھیں۔ پھر بازار آ جاتا تھا۔ اسی بازار کے آخری سرے سے بس مل جاتی تھی۔

لیکن وہ کبھی اس راستے دفتر نہیں گیا تھا۔ اپنی تنگ اور جس زدہ گلی سے نکل کر وہ دائیں ہاتھ والی پتی سی سلن والی گلی میں مڑ جاتا..... نالی کے سیلٹی ملغوبے سے اپنے جوتے اور پتلون کے پانچے بچاتا..... وہ گلی میں وسط میں چلتا۔ اس کی نظریں دورو یہ پرانی طرز کے اونچے اونچے مکانوں کے پرنا لوں پر ہوتیں ان ڈھکے نالوں سے موت کے وقت کی طرح گندے پانی اور کوڑے کرکٹ کے گرنے کا کوئی وقت معین نہیں تھا..... یہ گلی اس کی اپنی گلی سے بھی زیادہ گندی تھی۔ جگہ جگہ غلاظت کی ڈھیریاں ہوتیں۔ کوڑے کباڑ کے ڈھیر۔ موسی پھلوں کے چھلکے سبھی کچھ ہوتا۔ سات سات آٹھ آٹھ سال تک کی عمر کے بچے نالیوں پر بیٹھے رفع حاجت میں مصروف ہوتے۔ سبائڈ سٹرائڈ بعض اوقات ناقابل برداشت ہوتی۔ لیکن وہ اسی گلی سے گزرتا۔ یہ گلی جس دیوار کے ساتھ ختم ہوتی وہاں اینٹیں گرا گرا کر نکال نکال کر اچھی خاصی کھڑکی بنادی گئی تھی۔ اسی کھڑکی کے راستے وہ مال گودام کی پشت پر آ نکلتا۔ اور پھر دائیں ہاتھ کے چھوٹے سے میدان کو عبور کرتا..... جہاں لوہے کی کترنوں کے ڈھیر ہوتے۔ ان کترنوں سے دامن بچاتا نوکیلی تاروں کو پھلانگتا وہ اس سرمئی سڑک پر آ نکلتا..... جو کشادہ اور صاف

ہوں۔ کسی دکان پر تو نہیں جاتا۔“

وہ چپ ہو جاتے..... بیٹا دفتر کا بابو تھا کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ جو کچھ دے دیتا اسے ہی غنیمت سمجھ لیتے۔

وہ اپنے لئے ہر ماہ کوئی نہ کوئی نئے فیشن کا کپڑا بنواتا۔ قیمتی جوتے خریدتا۔ غیر ملکی پرفیوم لاتا۔ سگریٹوں پر بھی ایک معقول رقم خرچ ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اس نے بچت کی ایک ترکیب سوچی تھی۔ خاصی کامیاب ترکیب تھی۔ وہ کے ٹو کے سگریٹ لیتا اور کریون اے کی ڈبی میں ڈال لیتا۔ اس کے ساتھی اس سے مرعوب تھے ایسا لباس ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اور کریون اے۔ بھلا کون پی سکتا تھا۔

اپنے کولیکٹر میں اپنے آپ کو نمایاں و ممتاز کر کے اسے ذہنی تسکین ملتی۔ کئی لوگوں کو تو اس نے تاثر بھی یہی دیا تھا کہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ نوکری محض وقت گزاری کے لئے کر رہا ہے۔ اس کے دو ایک ساتھی جو بس میں اس کے ساتھ آتے تھے۔ اسے اکثر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اسے سرمئی سڑک سے آتے کئی بار دیکھ چکے تھے۔ اس کی شخصیت اس کے لباس اور اس کی باتوں سے خاصے مرعوب تھے۔

انہی ساتھیوں سے ایک ساتھی نے اس دن کہا تھا۔ ”صاحب آپ گاڑی وغیرہ پر کیوں نہیں آتے.....“

اس نے ہنس کر جلدی سے کہا تھا۔ ”جب تک میرا باپ زندہ ہے۔ گاڑی کی حسرت ہی رہے گی.....“

دوسرا ساتھی بولا تھا۔ ”سکوٹر وغیرہ ہی خرید لیں۔“

وہ بڑے بے ساختہ انداز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا تھا۔ ”میری ماں کو تم نہیں جانتے..... وہ سکوٹر کو خطرناک سواری کہتی ہیں۔ سکوٹر خود چلانا تو ایک طرف وہ تو مجھے کسی کے پیچھے بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔“

بھرم رکھنے کا اسے کس خوبصورتی سے سلیقہ آ گیا تھا۔ جھوٹ اپنی جگہ قبیح سہی لیکن اس کے رد عمل سے جو سکون و ذہنی آسائش اسے میسر آتی تھی۔ وہ اپنی جگہ حسین تھی.....

چھٹی کے بعد بھی وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا۔ کبھی کبھی ریسٹورنٹ میں۔ کبھی لائبریری میں اور کبھی دوستوں کے ساتھ سڑکوں کے تفریحی چکر میں..... گھریلو حالات کی تھکن سے فرار کا یہ بہترین طریقہ تھا..... گھر تھا بھی کیا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ ڈر بہ سا لگتا۔ جس میں چھوٹے بڑے مرغیاں مرنے بند ہیں۔ جنہیں صرف دانہ دنکا چگنے پانی پینے اور گھڑی دو گھڑی آنکھیں بند کر کے پڑ رہنے کے سوا دنیا جہان کی کوئی خبر نہیں۔ ایک مجبور قسم کی یکسانیت گھر کے ماحول پر چھائی رہتی۔ اور یکسانیت تو خوشی و مسرت کو بھی اکتا ڈالتی ہے چہ جائیکہ گھٹن مایوسی اور بیزاری کی یکسانیت..... وہ بھی اس یکسانیت سے اکتایا ہوا تھا۔

لیکن اکتاہٹ کو مایوسی میں بدلنے کی بجائے اس نے اپنی ذات کے گرد مصنوعی حصار وضع کر لئے تھے۔ وہ خوش تھا..... اور یوں زندگی رواں دواں تھی۔

سرمئی صاف اور کشادہ ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں والی سڑک اس کی زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس سڑک کے دورویہ کوٹھیوں میں بسنے والوں کو خاصا جان گیا تھا۔ لال کوٹھی میں نیلی مزدہ تھی۔ سفید گیٹ والی کوٹھی سے تین بچے ماڈل سکول میں جاتے تھے۔ گارڈینا کی باڑ والی کوٹھی کے کتے بڑے خونخوار تھے۔ برزہ نما چھت والی کوٹھی میں کئی لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ جس کوٹھی کے گیٹ پر بائبل برش کی پھولوں سے لدی جھالریں لٹکتی رہتی تھیں۔ اس میں کوئی امریکن جوڑا رہتا تھا اور انہی چھانک والی بیلوں سے گھری کوٹھی سے کالی موٹر میں ادھیڑ عمر عورت اکثر باہر جایا کرتی تھی۔ دو بچے ساتھ ہوتے۔ غالباً انہیں سکول چھوڑنے جاتی تھی۔

یہ معلومات اسے حاصل تھیں۔ اس کے علاوہ اب وہ مختلف کوٹھیوں کے بیروں خانساموں اور جمعہ دارنیوں کو بھی پہچاننے لگا تھا سائیکلوں پر ٹین کے پیپوں میں دودھ ڈالے گوالے بھی اس کے علم میں تھے۔ کہ فلاں گوالا فلاں کوٹھی میں دودھ دیتا ہے۔ اس سڑک کی اہمیت تو اسے دن معلوم ہوئی۔ جس دن وہ سانولی سلونی سی لڑکی اس

اکٹھے سوار ہوئے۔ یونیورسٹی کے شاپ پر وہ اتر گئی اس مسکراتی الوداعی نظروں میں بڑے خوبصورت پیغام تھے۔

پھر دونوں راستے میں روزانہ ملنے لگے۔ باتیں ہونے لگیں اور تکلف مٹنے لگا ایک دن اس لڑکی نے پوچھا۔ ”آپ روز کہاں جاتے ہیں۔“

”آپ کہاں جاتی ہیں۔“ ”وہ مسکرایا۔“

لڑکی بھی مسکرا دی۔ پھر اس نے بتایا۔ ”میں دفتر جاتا ہوں۔ آپ یقیناً یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں.....؟“

اس کا سوال ان سنا کر کے لڑکی نے پوچھا۔ ”میں دفتر میں ملازم ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں.....؟“

وہ ایک لمحہ کو سوچ میں ڈوبا..... انکم ٹیکس کا کلرک کہہ کر تعارف کرانے میں سبکی سی محسوس ہوئی۔ اتنی جہازی سائز کوٹھی میں رہنے والی لڑکی کی نظروں میں ایک کلرک کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ لڑکی نے مضطربانہ اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں.....“

اس نے دیکھا لڑکی بے حد مرعوب ہو گئی تھی۔ خوشی کی اک اچھوتی لہر اسے چھو گئی۔ پھر کئی ملاقاتوں میں اس نے لڑکی کو اپنے باپ کے دولت مند اور گھرانے کے ماڈرن ہونے کا تاثر دیا..... لڑکی بھی خاصی گھل مل گئی تھی۔ اس کے بارے میں وہ بہت کچھ جان گیا۔ لڑکی اس وسیع و عریض کوٹھی میں اپنی ماں اور بھتیجیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بھائی اور بھابی دو سال کے لئے امریکہ گئے تھے۔ بچے پڑھائی کی وجہ سے یہیں تھے وہ ایم اے پریوس کی طالبہ تھی۔

ملاقات اب تک صرف راستے تک ہی محدود تھی۔ وہ اسے آگے بڑھانے پر اپنے دل کو مجبور پاتا۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے بولا ”مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر آپ آج شام

چائے میرے ساتھ پیئیں.....“

لڑکی شش و پنج میں پڑ گئی۔

کے ذہن کی سکرین پر منعکس ہوئی۔ شاید وہ روز ہی اس راستے سے جایا کرتی تھی۔ یا ہو سکتا ہے اب ہی دونوں کے راستے ایک ہوئے ہوں۔ بہر حال وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ انہی پھانک والی بیلوں سے گھری کوٹھی سے وہ نکلتی اور بس شاپ کی طرف اپنی مخصوص رفتار سے چل دیتی۔ اس کے ہاتھ میں کبھی دو ایک کتابیں ہوتیں۔ کبھی بیگ اور کبھی فائل۔

وہ معمولی نقش و نگار کی عام سی لڑکی تھی۔ لیکن اس کے سانولے رنگ میں جوانی کی ایسی تیش تھی کہ دیکھنے والا دیکھے جانے پر مجبور ہو جاتا۔

اس کی دلچسپی اس اجنبی وجود میں بڑھنے لگی۔ وہ بھی روز کی راہی تھی۔ بس سے یونیورسٹی جاتی تھی۔ اس کا شاپ پہلے پڑتا تھا..... یونیورسٹی کے شاپ پر اتنے سے اس نے قیافہ لگا لیا تھا۔ کہ وہ یقیناً وہاں پڑھتی ہے۔ پڑھاتی اس لئے نہیں کہ اس کی عمر ابھی ان حدود تک نہ پہنچی تھی۔ انیس بیس سال سے یقیناً زیادہ نہ تھی۔

اب تو اس راستے سے دفتر جانا اس پر گویا فرض ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی روز ہی اسے نظر آتی۔ کبھی وہ پہلے پہنچ جاتا اور لڑکی بعد میں کوٹھی سے نکلتی اور کبھی لڑکی پھانک سے نکل کر جا رہی ہوتی..... اور وہ پیچھے پیچھے چل نکلتا۔

لڑکی بھی شاید اس کے غیر محسوس تعاقب سے آشنا ہو گئی تھی۔ اس لئے کوئی دن بھی ایسا نہ ہوتا..... جو وہ اس کی راہ میں نہ آتی۔ لیکن اتنے دنوں کے خاموش تعاقب اور غیر محسوس ٹکراؤ کے سوا دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

اس دن لڑکی کے بیگ سے کاغذوں کے پلندے کا گرنا تقریباً بحر ملاقات والی بات ہو گئی۔

لپک کر اس نے کاغذ اٹھائے۔ اور مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا دیئے۔ ”شکریہ“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ یوں جیسے وہ اجنبی نہ ہو۔ جواباً وہ بھی مسکرایا۔ اور یوں سلسلہ گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

بس شاپ تک دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ رسمی سی چند باتیں ہوئیں۔ دونوں بس میں

”شاید یہ میری گستاخانہ جرأت ہے۔“ وہ عاجزی سے بولا۔
 ”نہیں..... نہیں تو.....“ وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔

”تو سمجھ لوں کہ آپ نے میری استدعا کو ٹھکرایا نہیں.....“ وہ خوشی سے بہکتے ہوئے بولا.....

”لیکن.....“

”کیا۔“

”آپ کے گھر والے کیا کہیں گے.....“

وہ ٹپٹنا گیا..... پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں فی الحال آپ کو اپنے گھر مدعو نہیں کر سکتا..... کسی کیفے ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں چائے کی دعوت دے رہا ہوں۔“
 لڑکی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دعوت قبول کر لی۔

دعوت پر دعوت دی جانے لگی۔ اکثر شاہیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ کبھی ہوٹل کبھی شہر سے دور کبھی دریا کے کنارے۔ قریبیں بڑھ گئیں۔ لیکن جوں جوں وہ ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے کچھ پریشان پریشان رہنے لگے تھے۔ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے۔ کچھ کہنا چاہتے تو رک جاتے۔ ایک دوسرے کی امارت کے تذکروں سے پریشان ہو جاتے۔ اپنی جذباتی کیفیت سے تو وہ آگاہ تھا۔ اس سانولی نمکین سی لڑکی کو وہ واقعی پیار کرنے لگا۔ جوں جوں پیار شدت اختیار کر رہا تھا۔ توں توں اپنے ارد گرد پھیلانے جھوٹ کے حصار سے پریشان ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی توجی چاہتا۔ کہ جرأت سے کام لے کر اس لڑکی کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت کہ وہ لڑکی اس کی غربت کو قبول کرتے ہوئے اس کے جھوٹ کو بھی معاف کر دے گی۔

لیکن

یہ لڑکی کیوں ڈانوا ڈول ہو جاتی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ الفاظ زبان پر آتے آتے رک جاتے تھے۔ وہ اسے کرید بھی تو نہیں سکتا تھا۔ یہی باتیں وہ اس سے بھی پوچھ سکتی تھی..... پھر کیا بنتا۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے۔ دنوں اکثر خاموش خاموش سوچوں میں ڈوبے ڈوبے رہتے..... وہ اکتا کر کہتا۔ ”باتیں کرو۔ ہنسو۔ مسکراؤ.....“

وہ ہنس پڑتی باتیں کرنے لگتی۔ مسکرا دیتی۔ لیکن وقفوں کے بعد خاموشی اس پر چپ چاپ مسلط ہوتی رہتی۔

اس دن بھی وہ کئی لمحے گم صم رہی تھی۔ اور پھر اچانک اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بول اٹھی۔ ”آپ مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے؟“

یہ اتنا غیر متوقع اور ایسا مبار سوال تھا۔ کہ وہ بے طرح بوکھلا گیا۔ لیکن اک کا یاں تھا۔ گھبراہٹ اس پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ ہنس کر بولا۔ ”یہ تمہیں کیا سوچھی؟“

وہ ادا اس نظر آنے لگی۔ آج بھی اس کی زبان پر کوئی ان کہی بات آ کر رک گئی۔ بے چین نظروں سے اسے دیکھا اور صرف اتنا بولی۔ ”آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو میں..... میں.....“

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔“ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”مجھ پر اعتماد کرو۔“

”سچ۔“ وہ خوش ہو گئی۔ دفور مسرت سے اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”ہاں۔“ وہ سوچوں میں ڈوبتے ہوئے بولا.....

اور پھر سوچیں طوفانی سمندر کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔ دن رات وہ سوچوں میں گم رہنے لگا۔ معاملہ سنجیدگی کی یہ صورت اختیار کرے گا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اتنی امیر کبیر لڑکی اور وہ..... اپنے ڈربہ نما گھر کے مقابل اس کی طویل وعریض کوٹھی۔ اس کا خاندان..... اف کیا ہوگا..... وہ گھبرا گھبرا کر رہ جاتا۔ کبھی جی چاہتا..... کہ خاموشی سے وہ راستہ چھوڑ دے۔ اس سے قطع تعلق کر لے۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا..... یہ لڑکی حقیقتاً اس کی نس نس میں بس چکی تھی۔

پھر انہی دنوں گھر میں کچھ مدہم مدہم سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شاید کسی نے اسے اس

آئیڈیل

لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ماں کو خبردار کر دیا تھا۔ یادہ خود ہی نظر شناس تھی جو ان بیٹے کی آنکھوں میں ڈھلنے والی آرزوؤں کا اسے علم ہو گیا تھا۔ شادی اس کا واحد علاج اس کی سمجھ میں آیا تھا.....

وہ ان دنوں بہت ہی پریشان رہنے لگا تھا..... اس دن جانے کس بات پر اس کی بہن نے اسے چھیڑا تو وہ چڑ گیا۔

”اوہو ابھی سے یہ حال ہے شادی کے بعد تو پوچھو گے بھی نہیں۔ شادی ہو رہی ہے نا۔“

”کیسی شادی کس کی شادی.....“

”تمہاری اور کس کی۔“

وہ حیران و پریشان ہو کر بہن کا منہ دیکھنے لگا۔ ”تو یہ سرجوڑ جوڑ صلاح مشورے اسی سلسلے میں ہوتے ہیں۔“

”اور کیا.....“

”لیکن میں شادی نہیں کروں گا۔“

وہ ہنس پڑی..... پھینکی بے کیف سی ہنسی اور پھر دکھ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی ”جھیمو کی ماں روز تقاضا کرتی ہے۔ کب تک بیٹی کو گھر بٹھائے رکھیں۔“

جھیمو!

اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر گرا لیا۔

اور ڈھلتی عمروالی کنواری بہن اپنا دکھ چھپاتے ہوئے ہنس کر بولی۔ ”آخر تو شادی کرنا ہی ہے..... تم نے بھی تو حد ہی ختم کر دی۔ کئی ماہ سے گھر پیسہ دیتے ہو نہ دھیلہ..... سارا سارا دن باہر ہی رہتے ہو..... سونے کے لئے گھر آتے..... یہ بری بات ہے۔ اماں باوا ٹھیک ہی سوچتے ہیں۔ شادی ہو جائے گی۔ تو آپ ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جھیمو تمہیں تیر کی طرح سیدھا کرے گی.....“

وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا دل و دماغ جھٹکے کھا رہا تھا۔

آئیڈیل

جھیمو! برابر والے ڈربہ نما مکان میں ماں باپ بھابیوں بھائیوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہنے والی جھیمو پر اماں کی کب سے نظر تھی۔ میا لے رنگ پھینکی سی ناک اور پھٹی پھٹی آنکھوں والی جھیمو میں اماں کو جہاں بھر کی خوبیاں نظر آتی تھیں..... وہ ہنڈیا مزے کی پکاتی تھی۔ ڈھیروں برتن چٹکی بجاتے مانجھ دھو ڈالتی تھی۔ کپڑے دھونے میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ کھیس دریاں اور چادریں تک منٹوں میں دھو کر کوٹھا بھر دیتی تھی۔ دوسوتی کی کڑھائی بھی جانتی تھی۔ اور رنگین دھاگوں سے لٹھے کی چادروں پر نیل بوٹے بھی خوب بناتی تھی۔ گھر میں کوئی نیکیے کا غلاف یا انگیٹھی پوش ایسا نہ تھا۔ جس پر اس نے گاڑھے گاڑھے رنگوں کے بڑے بڑے پھول نہ کاڑھے ہوں۔ پلک جھپک ہر کام کر ڈالتی تھی۔ ان خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی۔ کہ نویں جماعت تک پڑھی ہوئی بھی تھی۔

اپنے نام کے ساتھ وہ جھیمو کا نام عرصے سے سن رہا تھا۔ یہ بات اسے کبھی بری بھی نہ لگی تھی۔ جھیمو بھی باخبر تھی۔ دروازے کے ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے اسے گھر سے باہر آتے جاتے دیکھ ضرور لیتی تھی۔ وہ بھی چھپی دلچسپی لیتا تھا۔ دزدیدہ نظروں سے ٹاٹ کی اوٹ سے چھپتا نکلتا چہرہ دیکھ ہی لیا کرتا تھا۔ لبوں پر آپوں آپ ہی مسکراہٹ آ جاتی تھی۔

لیکن جب سے اس سانولی لڑکی سے ناٹھ جوڑا تھا۔ وہ جھیمو کو یک نظر انداز کر بیٹھا تھا۔ کوٹھڑی میں رہنے والی لڑکی کوٹھی میں رہنے والی دوشیزہ سے نسبت ہی کیا رکھ سکتی تھی۔ جھیمو کو تو بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ اوڑھنے پہننے کا جب باتیں کرتی تو آواز اپنے گھر میں بیٹھے سن لی جاتی۔ رنگین کپڑے ہمیشہ ہی بے ڈھنگے ہوتے گو وہ لڑکی بھی سادہ ہی تھی۔ ہمیشہ ہی لٹھے کی سفید شلوار پہنتی..... ساتھ رنگ برنگی پھولوں والی قمیض ہوتی۔ لیکن رنگوں اور پھولوں کا تناسب اس کے وجود اور رنگ کے ساتھ اتنا مناسب ہوتا کہ سادگی بھی پرکاری لگتی۔

وہ پہلے ہی پریشان کیا کم تھا۔ جو اس نئی بات نے ذہنی کوفت دی۔ لیکن وہ عجب

مخمسے میں تھا۔ چاروں طرف سے کچھ یوں جکڑا گیا تھا۔ کہ ہلنے کی بھی گنجائش نہ رہی تھی۔ چھیمو سے شادی سے انکار کر کے بھی اسے وہ لڑکی نہ مل سکتی تھی۔

وہ لڑکی..... جسے اس نے اپنے متعلق اتنا بڑا فریب دے رکھا تھا۔

ماں بہنوں اور چھیمو کی اماں کا اصرار بڑھنے لگا۔

کئی دن گزر گئے۔

وہ سوچوں میں گم رہا..... اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ کہ اپنے جھوٹ کی قلعی کھول دے..... یا اس لڑکی سے کنارہ کشی کر لے۔

بڑا جان لیوا مرحلہ تھا۔ کئی دفعہ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رات رات بھر وہ بے چین کروٹیں بدلتا رہا..... اپنے آپ کو کوستا رہا..... لعن طعن کرتا رہا..... سوچوں میں ڈوبتا رہا ابھرتا رہا.....

اور شاید ہوش مندی کی کوئی رمت اس میں باقی تھی۔ عقل رسوا نہ ہوئی تھی۔ جذباتیت سے ہٹ کر سوچنے کا شعور تھا۔ جو چیز اس کی دسترس سے چاند ستاروں کی طرح دور تھی۔ اسے حاصل کرنے کی لگن حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اپنا بھرم پھوڑ کر بھی اسے پانے کی آس و امید بے بنیاد تھی۔ اس لئے۔

اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اس لڑکی کی راہ سے خاموشی سے ہٹ جائے گا۔ یوں اس کی زندگی سے نکل جائے گا۔ جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اسے اک دکھ بھری یاد سمجھ کر سینے میں محفوظ کر لے گا۔ اور بس.....

اس فیصلے سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دل بے بس ہو کر پھڑکا۔ لیکن اس نے اس فیصلے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا.....

اور

جب دل کی دنیا اجڑ ہی گئی تھی۔ تو یہ دنیا ماں باپ جس کے بھی حوالے کر دیتے ہیں کیا فرق پڑتا..... چھیمو ہوتی یا کوئی اور..... اس کے لئے معاملہ یکساں ہی تھا.....

اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا..... دوسرے راستے سے دفتر آنے جانے لگا۔ ہوٹل ریسٹورانٹ اور کیفے بھی تیاگ دیئے۔ ڈرتا تھا۔ کہیں اس سے سامنا نہ ہو جائے۔ زیادہ وقت وہ گھر ہی پہنچنے لگا۔

گھر..... چھوٹا سا ڈربہ..... جس میں ایک نئی مرغی لانے کا بندوبست بڑی تیزی اور بڑی خوشی سے اہل خانہ کر رہے تھے۔

ایک مہینے کے اندر ہی اس کی انگلی میں نکاح کی لال موٹے نگینے والی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ رخصتی سردیوں میں طے پائی۔

اداسیوں کی کاٹ کلیجے میں اترتی رہی۔ لیکن اپنے کئے کی سزا سمجھ کر وہ اسے برداشت کرتا رہا۔

بڑے ہی دنوں بعد وہ اس شام اس کیفے کی طرف گیا۔ جہاں وہ دونوں کیمن میں آنے سامنے خاموشیوں کی زبان میں حال دل کہا سنا کرتے تھے۔ اتفاق ہی تھا۔ جو وہ بھی اپنی ماں اور بھتیجیوں کے ساتھ سڑک پار والی جوتوں کی دکان میں آئی تھی۔ اس کی موٹر باہر کھڑی تھی۔ اس نے اسے کیفے میں آتے دیکھ لیا تھا۔ ماں سے جانے کیا کہہ کر وہ ادھر آ گئی تھی۔ وہ ملنے سے کترا رہا تھا۔ اسی لئے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اٹھ کر چل دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ پہلے پہنچ گئی۔

وہ بھی اپنے حواس مجتمع کر کے بیٹھ گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا تھا پھر بھی اس نے اپنے بے لوث پیار پر کوئی آنچ نہ آنے دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ارادہ کر لیا۔ کہ اپنے متعلق آج سب کچھ بتا دے گا۔

دونوں کیمن میں آنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ ایک ہی سانس میں اس کے یوں ایک ایک غائب ہو جانے کا گلہ کر رہی تھی۔ بہت بے چین بہت افسردہ ہو رہی تھی وہ۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا.....

پھر

جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اور بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”مجھے احساس ہو گیا تھا کہ

ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ اس لئے میں نے راہ بدل ڈالی.....“
وہ بے چین ہو کر وہاں آواز میں بولی۔ ”آپ کا مطلب کیا ہے.....“
اور اس نے سارا مطلب اسے سمجھا دیا۔ بڑے اعتماد سے اپنے جھوٹ کا پردہ تار
تار کر دیا.....

اس کے سر سے اس کے دل سے اور اس کی روح سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔
ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے پشت کرسی کی پشت سے ٹکرا کر گردن پیچھے ڈال
دی۔

متوقع انجام کی کوفت برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس میں۔
لیکن جب کئی لمحے خاموشی طاری رہی۔ تو اس نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی
آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا۔
وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تو کیا.....؟ کیا اس کی غربت اور اس کا جھوٹ
دونوں اس کے لئے قابل قبول ہیں۔ بے اختیارانہ اس نے ہاتھ میز پر لائے رکھتے
ہوئے گھبرا کر اسے دیکھا۔

”مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے..... ڈر لگتا ہے کہیں پاگل ہی نہ ہو جاؤں.....“ اس لڑکی
نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا.....

”جی؟؟.....“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ بڑے حسین انداز سے مسکرائی ”کتنی مدت سے میں بھی یہی بات آپ سے کہنا
چاہ رہی تھی..... کہ..... میں.....“

”جی۔“

”کہ میں وہ نہیں ہوں۔ جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح ایک
غریب لڑکی ہوں۔ یہ کوٹھی میری نہیں۔ اس کے سروٹ کوارٹر میں اپنے مفلوج باپ
ضعیف ماں اور بیوہ بہن کے ساتھ رہتی ہوں۔ کوٹھی کی مالکہ کا بیٹا اور بہو امریکہ گئے

ہوئے ہیں۔ وہ اکیلی تھیں۔ اس لئے ازراہ مہربانی ہمیں سروٹ کوارٹر میں جگہ دے
دی ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی نہیں ہوں۔ یونیورسٹی کے پیچھے عزیز بھٹی روڈ پر جو
سکول ہے وہاں لائبریرین ہوں..... آپ کی باتوں سے مرعوب ہو کر میں نے بھی اپنے
گرد یہ خول چڑھا لیا تھا.....“

وہ خوش دلی سے ہنسی اور ننھا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”چلئے حساب برابر ہو
گیا.....“

وہ گنگ سا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا..... تا سفا اور بے بسی
کے ملے جلے احساس سے اس نے اپنا سر میز پر پھیلے ہاتھوں میں مخ دیا.....
لال تھکینے والی موٹی سی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں بری طرح چبھ رہی تھی۔

☆☆☆

ادھیڑ عمر کی بھاری بھر کم صفیہ نے بڑے اعتماد سے اپنے سامنے میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی عورت سے کہتے ہوئے اس کے برابر سر جھکائے بیٹھی زرد رولڑکی کو دیکھا۔

لڑکی کا سر احساس جرم و ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں تلے گہرے گہرے سیاہی مائل حلقے تھے۔ ہونٹوں پر چوڑی جمی تھی۔ بڑی سی پھولدار کالی چادر میں اس نے اپنا وجود لپیٹ رکھا تھا۔

اسے ساتھ لانے والی عورت بڑی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی بہن تھی یا ماں یہ صفیہ نے نہیں پوچھا تھا۔ نہ ہی اس نے جرم کی روداد سنی تھی۔ اس نے تو کیس دیکھا تھا۔ چند سوال کئے تھے۔ ضرورت مند کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا تھا اس کی مجبوری کی شدت کو دیکھا تھا۔ فیس کی حد مقرر کرنے کے لئے وہ صرف اتنا ہی دیکھا کرتی تھی۔

وہ ڈاکٹر تھی نہ نرس لیکن ایک مجرب اور اکسیر نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ نسخہ نہیں خزانے کی کنجی تھی۔ جو اسے مل گئی تھی۔ آٹھ دس سالوں میں اتنا بڑا تغیر رونما ہو گیا تھا کہ دیکھنے والے حیران و ششدر تھے۔

کہاں تو وہ صفیہ جسے خاوند چھوڑ کر دیارِ غیر میں اجنبی ہو کر جا بسا تھا۔ دو بچوں کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ اتنا پڑھی لکھی نہ تھی کہ کہیں نوکری ہی کر لیتی۔ اور اتنی گری پڑی بھی نہ تھی کہ لوگوں کے گھروں میں برتن جھاڑ دے کر گزارہ چلا لیتی۔ گردابِ بلا میں پھنس گئی۔ عزیزوں رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا۔ کوئی سگا بہن بھائی نہ تھا ماں باپ بھی راہی ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ سسرال والوں نے دھتکار دیا تھا۔ کسمپرسی کے عالم میں کئی سال گزارنے کے بعد اسے کسی گاؤں کی دائی سے یہ نسخہ ملا۔ چند جڑی بوٹیاں کوٹ چھان کر شہد میں ملا کر گولیاں بنانا ہوتیں۔ بس تین گولیوں میں معاملہ پار ہو جاتا۔

شروع میں یہ نسخہ اس نے کثرتِ اولاد سے تنگ آئی خواتین پر آزمایا۔ نتیجہ غیر معمولی طور پر تسلی بخش رہا۔ دکھ نہ تکلیف ایک دو ماہ کا حمل آسانی سے گرجاتا عورت کی

کوئی بات ہی نہیں

”خلاصی ہو جائے گی نا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ آپ کے متعلق کسی نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا تھا۔ کہ
”اوہ کوئی بات ہی نہیں.....“
”سچ“

”ہاں ہاں۔ بھی کہہ جو دیا کہ کوئی بات ہی نہیں۔“
”تو پھر“

”تین دن دوائی کھانا ہوگی۔ اس کے بعد۔ میں خود سنبھال لوں گی۔ ہاں فیس پانچ سو سے کم نہ ہوگی۔ دوائی کا سو الگ لوں گی۔ سمجھیں۔“
”فیس کی کوئی پرواہ نہیں بس خلاصی ہو جائے۔ ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔ ہاں ایک عرض ضرور ہے کہ..... کہ.....“

”فکر نہ کریں۔ بات صیغہ راز میں رہے گی۔ غالباً آپ یہی کہنا چاہ رہی ہیں۔“
”جی۔ جی۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری اتنی بڑی مشکل حل کر دی ہے۔ فیس کے علاوہ بھی آپ کی خدمت کروں گی، بس جان چھوٹ جائے۔“

”کوئی بات ہی نہیں۔ ہاں تو میں آج دوائی دوں گی۔ کل صبح لے جانا۔ تین خوراکیں اور دوں گی۔ ویسے آج تک کسی کو دوبارہ دوائی دینے کی ضرورت پیش نہیں

صحت پر بھی فرق نہ پڑتا اور کام بھی بن جاتا۔

آہستہ آہستہ اس کی کامیابی وجہ شہرت بننے لگی۔ ضرورت مند خواتین چپکے چپکے اس سے دوائی لے کر کھالیتیں اور گلو خلاصی ہو جاتی۔ پہلے وہ پانچ دس روپے لے کر دوائی بنا دیتی تھی۔ لیکن جب دوائی اکسیر ثابت ہونے لگی تو اس نے ریٹ بڑھا کر دو گنا کر دیا۔ اصلی ریٹ تو اس وقت بڑھا جب گناہ سے نجات کے لئے اس کی طرف رجوع کیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی گھاگ ہوتی گئی۔ نظروں ہی میں آنے والے کی مجبوری اور مالی حیثیت کو پرکھ لیتی۔ عزت کے داؤ پر لگے لوگ اس کی منہ مانگی رقم سے بھی زیادہ دینے پر آمادہ ہو جاتے۔

وہ بھی اصول کی پکی تھی۔ کسی کا نام و مقام صیغہ راز میں رکھنے کی حامی بھری تو کیا مجال کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو جائے۔

یوں اس نے بے انتہار روپیہ کمایا۔ وہ صفیہ جو دو وقت کی روٹی کو بھی محتاج تھی آج ایک فیشن ایبل علاقے میں انتہائی خوبصورت بنگلے کی مالک تھی بڑی سی کار تھی۔ بیرہ تھا۔ خانساں تھا۔ بیٹا امریکہ میں تھا۔ بیٹی کنیرڈ میں پڑھ رہی تھی۔ بینک بیلنس دن بدن بڑھ رہا تھا۔ اونچے طبقے میں شامل تھی کلب کی باقاعدہ ممبر تھی۔ بڑے بڑے لوگوں سے رسم و راہ تھی۔

بنگلے ہی کا ایک کمرہ اس نے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ کمرہ کسی بہت بڑی فرم کے دفتر سے بھی خوبصورت تھا۔ چمکتی سطح والی بڑی وزنی میز کے ایک طرف اس کے گھومنے والی چمڑے کی فوم والی کرسی تھی۔ سامنے دو تین چمڑے کی گدے دار کرسیاں پڑی رہتیں فرش پر پھولدار قالین تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے تھے۔ مشورے اور حاجت کے لئے عورتیں یہیں آتی تھیں۔

”کوئی بات ہی نہیں۔“ وہ آنے والی ہر خاتون کو اتنے اعتماد سے کہتی کہ انہیں امید کا سنہری روپ پوری تابانی سے نظر آنے لگتا۔ ان کی ہمت بندھ جاتی۔ اور ناامیدی کے اندھیروں میں بدنامی کا نظر آنے والا بھوت روپوش ہو جاتا۔

یہ جملہ تو اب جیسے اس کا نکیہ کلام ہی بن گیا تھا۔ ہر آنے والی کو وہ یہ جملہ ضرور کہتے سنائی دیتی۔ اس کی بیٹی فاطمہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ یہ جملہ سنتی آئی تھی پہلے پہلے تو وہ ان الفاظ کو سمجھ نہ پاتی تھی۔ لیکن عمر اور شعور کے ساتھ ساتھ اسے ان الفاظ کی معجزہ نمائی کا احساس ہونے لگا۔

مئی جو چند سال پہلے امی تھی۔ جب یہ جملہ کسی عورت سے کہتی تو فاطمہ ساری بات سمجھ جاتی۔ مرجھائے ہوئے چہروں والی ندامت سے بھٹکے سروں اور بدنامی کے خوف سے سپید پڑے چہروں والیاں اس نے مئی کی صرف تین دن کی دوائی سے سرور شاداں ہوتے دیکھی تھیں۔ مئی تو کسی سند یافتہ ڈاکٹر سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ اب تو اسے بھی یوں لگتا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

کوئی بات ہی نہیں کا پر اعتماد احساس فاطمہ کے شعور اور لاشعور میں پوری طرح رچ بس گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا اپنے بوائے فرینڈز سے رویہ لا پرواہی نہ ہو گیا تھا۔ محتاط نہیں رہا تھا۔

کسی نے چائے کی دعوت دی۔ وہ چل پڑی۔

کسی نے کلب میں مدعو کیا اس نے دعوت قبول کر لی۔

کسی نے دن یارات کی قید توڑ کر سیر و تفریح کی پیش کش کی۔ اس نے مان لی۔ صفیہ فاطمہ کی سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھی۔ لیکن نئی تہذیب کے جن خطوط پر بیٹی کی تربیت کی تھی۔ سرزنش یا ڈانٹ ڈپٹ کی مجاز نہ تھی۔ ہاں اکثر وہ اسے ملائمت اور پیار سے ٹوک دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی زمانے کی اونچ نیچ بھی سمجھانے کی کوشش کرتی تو ناظمہ کھلکھلا کر ہنس کر کہتی۔ ”مئی کوئی بات ہی نہیں۔“

صفیہ اسے ناظمہ کی معصومیت سمجھ کر خود بھی ہنس دیا کرتی اپنے کاروبار کی سنگینی کا اسے کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا۔ ہزاروں بن بیاہی لڑکیاں اس کے پاس آچکی تھیں۔ کچی عمر کی نا سمجھ لڑکیاں، مجبوری کی زر میں آئی ہوئی معصوم بیٹیاں تنگی حالات سے پریشان ہو کر عصمتوں کے سودے کرنے والی لڑکیاں دباؤ میں آ کر بک جانے والی اور

آئیڈیل

جوانی کے جنسی تقاضوں سے مجبور ہو کر گناہ کی وادی میں قدم رکھنے والی لڑکیاں نئے دور کی فیشن زدہ لڑکیاں۔ ہر قسم کی لڑکیاں اس کے پاس آچکی تھیں۔ اس نے کبھی ان کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ ان کی آمد اس کے لئے سودمند تھی۔ بس وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ ان کی پریشانی اور کوفت دور کر دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔

پیسہ بنورنے کی اندھی دوڑ میں وہ پیش پیش تھی۔ مادہ پرستی نے اسے ان فرائض سے بھی غافل کر دیا تھا۔ جو بحیثیت ماں اس پر عائد ہوئے تھے۔

یہ غفلت رنگ لے آئی۔

چند دنوں سے وہ ناظمہ کی بدلی بدلی حالت کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ سوچوں میں گم پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔

کئی دنوں کے خاموش مشاہدے کے بعد اس نے ناظمہ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیٹی بڑی چپ چپ رہنے لگی ہو۔ کسی سہیلی، کسی دوست سے لڑائی تو نہیں ہوگئی.....“ ناظمہ کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ ماں کو جواب دیئے بغیر نگاہیں جھکا کر وہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

صفیہ کے وجود میں ٹھنڈی سی لہر کپکپا گئی۔ یہ گھبراہٹ اور نگاہوں کا ایسا جھکاؤ اس نے ہزاروں بار دیکھا تھا۔ صفیہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چکر اتا ہوا سر تھام لیا۔ کئی لمحے بے جان سے بیت گئے۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ اپنے آپ کو اس بد اعتمادی پر برا بھلا کہا۔ ناظمہ ایسی کبھی نہیں ہو سکتی۔

ناظمہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ صفیہ قدرے پرسکون ہو کر ادھر ہی چل دی۔ اپنے پلنگ پر ناظمہ پاؤں لٹکائے سر جھکائے بیٹھی گود میں رکھے ہاتھوں کو بڑی بیقراری سے مسل رہی تھی۔

صفیہ کو دھچکا سا لگا۔

لیکن ہمت کر کے آگے بڑھی۔ بیٹی کے قریب بیٹھتے ہوئے لہجے میں بمشکل ملائمت پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ”ناز و کیوں! بہت پریشان ہو۔“

آئیڈیل

ناظمہ نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ اور پھر جلدی سے سر جھکا لیا۔ صفیہ کا دل جیسے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے ہاتھ ناظمہ کی ٹھوڑی تلے رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ زرد اڑی اڑی رنگت سپید پڑتے ہوئے آنکھوں تلے سیاہی مائل حلقے وہ چیخنی۔ ”ناظمہ!“

ناظمہ گھبرا کر ماں کا رنگت بدلتا چہرہ دیکھتے ہوئے خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”کوئی بات ہی نہیں..... نہیں نامی.....“

”ناظمہ!“ صفیہ پورے وجود سے کانپ گئی۔ اس کا بھرپور تھپڑ ناظمہ کے منہ پر پڑا۔ ناظمہ ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

جا کر پوری برتھ خالی ہو گئی اور میں نے بچوں کو جلدی جلدی سوٹ کیسوں اور گٹھریوں کی طرح سیٹوں پر پھینکا۔ بچے بھی بڑی ہوشیاری سے سیٹوں پر قبضہ کر بیٹھے۔ سامان وغیرہ ٹھیک کرنے کے بعد میں بھی تھوڑی سی جگہ لے کر بیٹھ گئی۔ پسینے سے سارے کپڑے تر تھے اور ڈبے میں جس کی وجہ سے سڑانڈ سی اٹھ رہی تھی۔ سامنے والی برتھ پر بیٹھی خواتین نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ دھوپ کا رخ جو اس طرف تھا۔

گاڑی چل پڑی، قدرے سکون ہوا۔ لیکن بچوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ سکون کا سوال ہی کہاں تھا۔ ککو اور جی جگہ کے لئے لڑنے لگے۔ جازی کو نیند آنے لگی۔ اس نے پاؤں پیار نے شروع کر دیئے۔ لہنی کو اس کے پاؤں می ٹھوکر لگی اس نے جازی پر بلہ بول دیا۔ اب جازی نے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کیا ہے۔ تو پورے ڈبے میں اس کی تانیں گونجنے لگیں۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر فری نے لہنی کی جیب سے چیونگم کا پیکٹ اڑالیا۔ اور دوسری طرف منہ کر کے جلدی جلدی آدھی پو کے منہ میں ڈالیں اور آدھی اپنے میں۔ لہنی کو پتہ چلا، تو وہ غراتی ہوئی لپکی۔ گھونسہ فری کے بجائے خاموش بیٹھے سیج کو جا لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لہنی کے بال پکڑ لئے۔۔۔ ڈبے میں دھینگا مشتی شاید کنٹرول سے باہر ہو جاتی کہ کہیں سے بوتل والا آ گیا۔

”کوک، سیون اپ، فننا۔“ اس نے صدا لگائی۔

”امی، پھوپھو خالہ۔“ بچے لڑائی جھگڑا بھول، مجھے پکارنے لگے۔

میں جوان سب سے بیزار ہو کر سامنے والی سیٹ پر جا بیٹھی تھی اور مسافر خاتون کی ہمدردی کا جواب لوٹا رہی تھی۔ جس نے کہا تھا، یہ بچے جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ بچوں کی پکار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سب آرام سے بیٹھو گے تو کوک ملے گی۔“ میں نے بچوں سے کہا۔ اور حیرانگی کی بات بچے سارے جھگڑے بھول بھال سیٹ پر بڑے سکون، تمیز اور آرام سے بیٹھ گئے۔

میں نے بوتل والے کو بلایا۔ بارہ تیرہ سال کا منحنی سا بچہ بڑی سی بالٹی اٹھائے ادھر

جون کا پتہ ہوا آسمان سرخ تانبے کی رنگت کا ہو رہا تھا۔ فضا میں حدت گھلی ہوئی تھی۔ اور زمین کے سینے سے گرد و غبار اٹھ رہے تھے۔ ہریالی جھلس گئی تھی۔ نظر نہ آنے والی آگ نے ہر چیز کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔

عوامی ایکسپریس موسم کی انتہا سے بے نیاز اپنی مخصوص رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ چھت تپ رہی تھی۔ سیٹیں آگ اگل رہی تھیں۔ پسینے سے برا حال تھا۔ مسافر ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ کوئی سیٹوں کے لئے جھگڑ رہا تھا۔ کوئی سامان نیچے پھینک رہا تھا۔ کوئی اوپر چڑھ رہا تھا۔ بے ترتیبی اور افراتفری مچی تھی، بعض سیٹیں خواہ مخواہ رکی تھیں، کچھ سیٹوں پر ضرورت سے زیادہ لوگ دھنسنے بیٹھے تھے۔ گرمی کا احساس اور شدت اور بڑھ گئی تھی۔

مجھے راولپنڈی سے لاہور جانا تھا۔ کام ایسا آن پڑا تھا کہ اسی گاڑی سے وہاں پہنچ سکتی تھی بچوں کا ساتھ قیامت کی گرمی اور عوامی ایکسپریس کا سفر، خاصا تلخ تجربہ تھا۔ لیکن تجربے ہی تو علم ہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ دل کو تسلی دیتے ہوئے میں ڈبے میں گھسی۔ گوجر خان تک جگہ کا تعین نہ ہو سکا۔ بچے پریشان ہو ہو کر چیخنے لگتے۔ بچے بھی کون سے کم تھے۔ پورے سات تھے۔ ایک بھائی کا ایک بہن کا۔ تین بھانجی کے اور دو اپنے۔ سات بچوں کو سنبھالنا مشکل ترین کام تھا۔ بہر حال خوش قسمتی تھی کہ گوجر خان

آئیڈیل

آ گیا۔ بالٹی میں کم و بیش بیس پچیس بوتلیں تھیں۔ برف اور پانی الگ۔ اتنی وزنی بالٹی اس نے بازو کے سہارے اٹھا رکھی تھی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے اس بچے کے بازو کی ہڈی وزن سے کمان کی طرح ہو چکی ہے۔

وہ بہت کم گوتھا۔ چہرے پر بچپن کی طرح کوئی جھلک نہ تھی۔ آنکھوں میں رونق تھی نہ زندگی کی چمک، بھٹی نمیض اور میلا کچھلا پاجامہ تھا اور اسٹنچی سلپروں پر کئی جوڑ لگے ہوئے تھے۔

میں نے سب بچوں کو ایک ایک بوتل دلائی۔ ساتھ والی خاتون کو بھی اخلا تا پیش کی۔ خود بھی لے لی۔ برف کی لگی بوتلیں۔ واقعی شدت کی اس گرمی میں جنتی تحفے کی طرح محسوس ہوئیں۔

پچھلی سیٹ پر بچوں نے بھی بوتلیں دیکھتے ہوئے اودھم مچا دیا۔ وہ بچہ انہیں بھی بوتلیں دینے لگا۔ گھڑی بھر میں اس کی پندرہ سولہ بوتلیں بک گئیں۔ گاڑی چل رہی تھی۔ خالی بوتلوں کے انتظار میں وہ دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

بچے اب سکون پذیر ہو گئے۔ جازبی اور سبج نے اپنی اپنی کہانیوں کی کتابیں نکال لیں۔ لبتی، سکوا اور جی سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ پو، فری کے کندھے سے سر لگا کر اونگھنے لگا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ساتھ والی خاتون کو شاید نیند آ رہی تھی، اس نے پاؤں پیارے شروع کر دیئے۔ یہ جگہ خالی کرنے کا اشارتی حربہ تھا۔ میں چپ چاپ اٹھ گئی۔

بچوں نے ساتھ ساتھ کھسک کر میرے لئے جگہ بنادی۔ لیکن میں ذرا سی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ جس ناقابل برداشت تھی۔ بچوں کو آرام سے بیٹھنے کا کہہ کر میں اس دروازے کے قریب کھڑی ہوئی جہاں وہ لڑکا وزنی بالٹی قریب رکھے کھڑا ہا ہر دیکھ رہا تھا۔

گاڑی جہلم کے غیر ہموار علاقے سے گزر رہی تھی۔ دو پہر تپ رہی تھی، لو کے

آئیڈیل

تھیڑے سیال آگ کی طرح لگ رہے تھے..... میں دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ سنگل سیٹ پر بیٹھی پشاور سے آنے والی پٹھان عورت کا چہرہ گرمی سے متمار ہا تھا۔ ”کس بلا کی گرمی ہے۔“ اس نے دوپٹے سے اپنے چہرے کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر میں اور وہ گرمی کے اس بدترین دن کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

”پانی پیو گے۔“ اس عورت نے اخلا تا پوچھا۔

میں نے شکریہ کہتے ہوئے کہا۔ ”ابھی پیا ہے“ آپ پیس، کیا لیں گی؟“ ”فتنا۔“ اس نے کہا۔

میں نے مڑ کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ بوتل منہ سے لگائے غٹا غٹ پی رہا تھا۔ ”فتنا مانگ رہی ہیں۔“ میں نے لڑکے سے کہا۔

اس نے جلدی سے بوتل بالٹی میں سیدھی رکھ دی اور فتنا نکال کر عورت کو پیش کر دی۔

”تم بوتل پی رہے تھے؟“ میں نے یونہی اس لڑکے سے کہا۔

”نہیں جی۔“

”تو یہ کیا تھا۔“

”پانی۔“

”پانی؟“

”جی..... خالی بوتل میں پانی بھر کر برف میں رکھ دیتا ہوں۔ خوب ٹھنڈا ہوا جاتا ہے، گرمی میں پیاس بہت لگتی ہے نا جی۔“

اس نے پھر آدھی بوتل نکالی اور پانی حلق میں انڈیلنے لگا۔ اور مجھے یونہی خیال سا آ گیا۔ یہ بھی آخر بچہ ہی ہے۔ اس کا جی نہ چاہتا ہوگا۔ فتنا، سیون اپ اور کوک پینے کو۔ اتنی بڑی آزمائش وہ ہر وقت اٹھائے پھرتا ہے جانے کیوں مجھے اس بچے سے ہمدردی ہو گئی۔ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”تم بوتل نہیں پیتے.....“

آئیڈیل

”ایک روپے کی بوتل ہے بیگم صاحبہ۔“ اس نے تلخی گھلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”میری تو سارے دن کی کمائی ایک روپیہ نہیں ہوتی..... بوتل کہاں سے پیوں گا۔“

”یہ جو تم دن بھر بوتلیں بیچتے پھرتے ہو، تمہارا جی نہیں چاہتا کہ خود بھی پی لو.....“

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ ہاں اس کی بے رنگ اور بے رونق آنکھوں نے اپنی جاندار خواہش کا احساس مجھے ضرور کروادیا۔

”پیو گے بوتل۔“ میں نے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے سرنفی میں ہلادیا۔

”یہ لو ایک روپیہ اور بوتل پی لو۔“ میں نے بڑے سے روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

وہ حیرت زدہ سا مجھے دیکھنے لگا۔ جانے یہ بات اس کی توقع سے بعید تھی یا اس کی انا پر تازیانہ تھی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے اور کبھی میرے ہاتھ میں پکڑے روپے کو دیکھ رہا تھا۔

”لے لو بچے، کوئی بات نہیں۔ میں نے ابھی ابھی سات بچوں کو بوتلیں دلائی ہیں۔ ایک تم بھی پی لو۔“ میں نے مانتا بھری شفقت سے اسے دیکھا۔

”نہیں جی، نہیں جی.....“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

روپیہ اس نے نہیں پکڑا۔ ہاں اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرارت چمکنے ضرور لگی۔

وہ انکار کرتا رہا۔ اور میں اصرار بچہ ہی تھا نا! جب اصرار میں شفقتوں کا احساس ہوا تو روپیہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

”پی لو نا۔“ میں اس کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ شاید احسان کر کے ملنے والی تسکین دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ شائستگی سے بولا۔

”ابھی پانی پیا ہے بیگم صاحبہ جی، جب پیاس لگے گی۔ تو پی لوں گا۔“

آئیڈیل

کوئی اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم پڑ رہی تھی۔ ڈبے میں ہل چل شروع ہو گئی تھی کچھ مسافروں کو یہاں اترنا تھا۔ شاید کچھ سواریاں سوار بھی ہو جائیں۔ میں اپنی جگہ سے ہٹی۔ اس بچے نے بالٹی اپنی کمان نما بانہہ پر اوپر اٹھالی، وزن سے اس کا جسم دوسری طرف جھک سا گیا۔ آنکھوں میں تہہ در تہہ سوچوں کا غبار لئے اس نے مجھے تشکرانہ انداز میں دیکھا اور پھر گاڑی کے رکتے رکتے ڈبے سے باہر نکل گیا۔

میں اپنے بچوں کے پاس آ بیٹھی۔ بچوں کے سرخ و سپید صحت مند چہرے اور ان کے رنگ برنگے خوبصورت لباس دیکھ کر وہ بچہ میرے ذہن میں سوال بن گیا۔ اس کا بے رونق چہرہ اس کی اجازت آنکھیں، اس کا نامکمل لباس..... اور سب سے بڑھ کر اس کا عمر سے تجاوز کرتا ہوا رویہ۔ اس کی بیس بچپن سیر کی وزنی بالٹی اٹھانے والا کمان کی طرح مڑا ہوا بازو، میں لاشعوری طور اس بچے کا اپنے بچوں سے موازنہ کر رہی تھی۔ جرم کا احساس مجھے ڈسنے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس بچے کی زبوں حالی کے ذمہ دار ہم ہی لوگ ہیں۔ یہ بچہ بھی تو دل و دماغ رکھتا ہے اس کے من میں بھی خواہشیں اٹھتی ہیں۔ لیکن..... لیکن وہ بچہ بچہ رہا ہی نہیں۔ پختہ عمر کا جہاندیدہ مرد بن گیا ہے۔ حالات نے اسے عمر سے بہت آگے پھینک دیا ہے۔ بچوں کی سی شوخی، عمر کا فطری تقاضا اس میں نام کو نہیں رہا۔ مجھے اس بچے سے ہمدردی ہو گئی۔

بچوں نے کھانا مانگا تو میں اپنی سوچوں سے چونکی۔ سیٹوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ بنا کر میں نے وہ بڑے بڑے لفٹن کیریر نکالے۔ قیمہ، پراٹھے، انڈے، بھنی ہوئی مرغی اور میٹھے چاول پلیٹوں میں ڈالنے لگی۔ بھابی نے بڑا تکلف کیا تھا۔

بچوں کو کھانا کھلاتے ہوئے مجھے پھر اس بچے کا خیال آ گیا۔ وقت کی سنگین دہلیز پر ٹھہرا ہوا وہ بچہ بار بار میری توجہ کا دامن کھینچ رہا تھا۔ ساتوں بچے چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ مزے سے چیزیں نگل رہے تھے۔ ایک پل کو نچلا بیٹھنا تو انہیں آتا ہی نہیں تھا۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا تھا۔ بچہ اسی کو تو کہتے ہیں جو شعور کو نہ پہنچا ہو..... لیکن..... وہ..... وہ..... بچہ۔

میں جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

گجرات کے قریب پھر کوک، فٹے والا آ گیا۔ یہ مزدور نما مرد تھا۔ بچوں نے ضد کی۔ میں نے ڈانٹا، لیکن وہ بھلا کیسے مانتے۔ گرمی تو بلا کی تھی۔ انہیں بوتلیں دلانا ہی پڑیں۔ سب بچے بوتلوں بھری بالٹی کے گرد ہو گئے اور اپنی اپنی پسند کی بوتلیں لینے لگے۔ کتنی بے فکری، کیسی بے نیازی تھی۔ میرا جی چاہا، وہ بچہ پھر سے آ جائے۔ میں اسے بوتل دلاؤں، ایک نہیں بہت سی، اتنی کہ اس کی نگاہوں کا متحیر پن سیراب ہو جائے۔

باقی راستہ بھی کٹ گیا۔ بچوں نے خوب دھما چوکڑی مچائی۔ کچھ دیر کو اونگھ بھی گئے۔ بیدار ہوئے تو پھر کوک، فٹے کا مطالبہ ہوا۔ خدا خدا کر کے لاہور آ ہی گیا۔ میں نے سامان سمیٹا۔ چھوٹے بچوں کو بڑے بچوں کے حوالے کیا۔ آرام سے گاڑی سے اترنے کی تلقین کی۔ خیال تھا بھائی اسٹیشن پر آئے ہوں گے وہ انہیں سنبھال لیں گے۔

میں نے پلیٹ فارم پر نگاہ ڈالی۔ بھائی کہیں بھی نظر نہ آئے۔ بڑی مشکل پیش آئی۔ میں کچھ گھبرا بھی گئی۔ رش بہت تھا۔ لیکن حواس مجتمع کرتے ہوئے باری باری بچوں کو اتارا۔ سامان اٹھوایا اور پلیٹ فارم پر ہی بک سٹال کے پاس ٹھہر کے بھائی کا انتظار کرنے لگی۔ بچے یہاں بھی طوفان اٹھانے لگے۔ کبھی سامان کے اوپر چڑھنے لگتے۔ کبھی سٹال پر۔ جازی تو بھاگ بھاگ کر پھر گاڑی کی طرف جانے لگا۔ سمجھنے کی طرف دوڑ گیا۔ پو اور فری ذرا سنبھلی ہوئی بچیاں تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں لہنی سکوا اور جمی کو پکڑا کر میں جازی کو پکڑنے لپکی۔

اس کے کان پکڑ کر میں واپس لائی، تو ایک پان بیڑی والے کے پاس مجھے وہ لڑکا نظر آ گیا۔ جانے میں کیوں تیزی سے اس کی جانب گئی۔ اس کی میری طرف پشت تھی۔ اور وہ چھابڑی والے سے ایک روپے کی بیڑیاں مانگ رہا تھا۔

آگ کا ایک لپکا تھا، جو پاؤں سے اٹھا اور سر سے نکل گیا۔ اتنا کم عمر بچہ اور بیڑیاں۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ اسی روپے کی بیڑیاں خرید رہا ہے، جو میں نے بوتل کے لئے دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے اصرار کے باوجود اس نے بوتل نہیں پی تھی۔ کہا تھا

جب پیاس لگے گی تو پی لوں گا۔ یہ محض اس لئے کہ اس روپے کی اس کو بیڑیاں خریدنا تھیں۔

دکھ اور کرب کے ملے جلے احساس نے مجھے آتش زیر پا کر دیا۔ یہ بچے کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے۔ ان کی شکلوں سے انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ ورنہ یہ اسی قابل ہی ہوتے ہیں۔ یہ کسی احساس کے بغیر پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بغیر ہی مر جاتے ہیں۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ ذلیل، کمینہ اور جانے کیا کیا کہہ کر میں اسے دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ مجھ سے اپنے اندازوں کی شکست شاید برداشت نہ ہو پار ہی تھی۔

وہ بیڑی کے پیکٹ لے کر مڑا۔

میں اس کے عین سامنے کھڑی ہو گئی۔

”بیگم صاحبہ جی..... آپ..... آپ نے لاہور ہی اترنا تھا۔“ وہ رکتے رکتے بولا۔

”بدتمیز، ذلیل..... میں نے تجھے روپیہ بوتل پینے کے لئے دیا تھا اور تو اس کی

بیڑیاں خرید رہا ہے۔ اتنی سی عمر میں نشہ کرتا ہے۔“ میں نے اس کا کان مروڑتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”بتا یہ اسی روپے کی لی ہیں نا۔ میں نے تجھے شریف اور معصوم بچہ سمجھا تھا..... تو تو بالکل آوارہ نکلا.....“

میرے مفروضے کو ٹھیس پہنچی تھی۔ مجھے اسی لئے تو بے انتہا غصہ آ رہا تھا اور میں نے اسے اتنی زبردست لعن طعن کی تھی، بھرے پرے اسٹیشن کا بھی خیال نہ کیا۔ اسے اس طرح برا بھلا کہا۔

لیکن

وہ میری سرزنش اور برا بھلا کہنے سے بھڑکا نہیں۔ اس نے میری طرف حسرت سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل برداشت تھے۔ میں نے اس کا کان چھوڑ دیا۔ اور آواز میں کچھ نرمی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”تم ابھی چھوٹے ہو، اتنی کم عمر میں بیڑی پینا نقصان دہ ہے۔“

”یہ میں نے اپنے لئے نہیں خریدی۔“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے بھرائی ہوئی

آواز میں کہا۔

”تو اور کس کے لئے لی ہیں۔“ میں اس کے انداز سے بے طرح متاثر ہوئی۔

”باپ کے لئے.....“ وہ بغیر آنسوؤں کے جیسے رو دیا۔

”تمہارا باپ نشہ کرتا ہے تو خود بھی خرید سکتا ہے۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔

”وہ..... وہ..... بہت نشہ کرتا ہے بیگم صاحب جی..... ہر وقت بیڑی پیتا ہے اور

جب بیڑی نہ ملے تو میری ماں کو مارتا ہے..... میں نے..... میں نے آپ کے روپے

سے اس کے لئے بیڑیاں لے لی ہیں..... ایک دو دن تو ماں کو نہیں مارے گا نا..... میں

اپنی ماں کو پٹنے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسی لئے بوتل نہیں پی تھی..... کہ باپ کے لئے

بیڑیاں خرید لوں گا۔ ماں پٹنے سے بچ جائے گی۔“

اس کی آواز گھٹ گئی۔ اور بنجر آنکھوں کی نمی امنڈنے سے پہلے وہ تیزی سے وہاں

سے چلا گیا۔

سچائی اپنی ضامن آپ ہوتی ہے۔ میں نے اس کے الفاظ کی سچائی محسوس کر لی۔

مجھے اسے کوئے دینے کا انتہائی دکھ ہوا۔ حالات کے بے رحم سینے میں گڑے اس بچے کا

وجود کتنا عظیم تھا۔ آزمائش سے نپٹ کر دوسروں کے لئے قربانی کرنا کتنا بڑا اور کیسا

کنٹھن کام ہے۔

اس بچے نے کتنا زبردست ایثار کیا تھا۔

میرا سرا اس کی عظمت کے سامنے جھک گیا۔

☆☆☆

لا علاج

خیبرمیل دو گھنٹے لیٹ تھی۔

میں اپنے اوور کوٹ کے کالر چڑھائے ہاتھ جیبوں میں ڈالے پلیٹ فارم پر کھڑا

تھا۔ میری گاڑی براؤن لائن سے تو وقت پر آ گئی تھی۔ لیکن خیبرمیل لیٹ تھی۔ اور اب

جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ یہیں اسی اسٹیشن پر اس بلا کی سردی میں مجھے

انتظار کے دو کوفت زدہ گھنٹے گزارنا تھے۔ یہ دسمبر کی شاید سرد ترین رات تھی، سارا اسٹیشن

ایک بوجھل سی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ روشنیاں بھی مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹھٹھری

رات میں سنسان سا اسٹیشن بڑا عجیب سا لگا رہا تھا۔ ریلوے کا عملہ اپنے اپنے کمروں میں

گھسا ہوا تھا۔ مسافر ویٹنگ روم میں دیکے بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں کوئی قلی بچ پر اکڑوں

بیٹھا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بوسیدہ کبلر یا کھیس سے اپنے جسم کو سمیٹے نظر آ جاتا،

چائے کے اسٹال پر بھی اٹکا دکا مسافر ہی تھے۔

میں کافی دیر ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ چائے منگوائی تھی اخبار پڑھ رہا تھا۔ ویٹر

سے باتیں کی تھیں۔ دوسرے بچوں پر نرم و گرم بستروں میں دھنسنے مسافروں سے گفتگو کی

کوشش کی تھی۔ باتیں موسم سے لے کر ملکی سیاست تک کر ڈالی تھیں۔ جسموں کی طرح

شاید ان مسافروں کے ذہن بھی ٹھٹھرے ہوئے تھے، اول آں کے سوا میری کسی بات کا

ڈھنگ سے جواب ہی نہ دے رہے تھے۔ اکتا کر میں باہر نکل آیا۔ اور بچ بستہ

آئیڈیل

ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا۔ کتنی ہی دیر میں اس خارش زدہ کتے کو دیکھتا رہا۔ جو بریک میں رکھے جانے والے سامان کے عین بچوں بچ گھڑی بنا پڑا تھا۔ اپنے آپ کو سردی سے بچانے کا ایک جانور کو بھی شعور تھا۔

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ گھڑی دیکھی اب بھی سوا گھنٹہ باقی تھا۔ میں ویننگ روم میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ بلا ارادہ قدم اٹھاتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تیسرے درجے کے مسافر خانے میں تھا۔

یہاں زندگی قدرے بیدار تھی۔ ٹین کی محرابی چھت والے دو طرف سے بغیر دیوار کے اس ہال نما کمرے میں بہت سے لوگ تھے۔ کچھ بھیک منگے تھے جو بچوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ کچھ زمین پر بستر لگائے پوٹلی بنے بیٹھے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے۔ کچھ خراٹے بھر رہے تھے۔ گڑ کی چائے پینے والے بھی تھے اور سستی قسم کے سگریٹ کا دھواں اڑانے والے بھی۔ ایک کونے میں کچھ خواتین بھی تھیں۔ جو اپنے میاں سے برقعوں کا خیمہ بنائے بچوں کو حدت پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں سگریٹ کے کش لیتا لوگوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ میری توجہ کو ایک دردناک آواز نے مبذول کر لیا۔ میں ایک دم پلٹا کونے والے بچ پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا بین کر رہا تھا۔ دو جوان لڑکیاں اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے بوسیدہ سے برقعے ان کی غربت کی داستان کہہ رہے تھے۔

بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ”ٹی بی لا علاج ہے لوگو۔“

اس کا بین کا سا انداز دردناک تو تھا۔ لیکن مجھے اس کے اس جملے سے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اتفاق ہی کی بات ہے کہ میں ٹی بی کا ڈاکٹر تھا اور آج کے دور میں جبکہ اس موذی مرض کو پوری طرح شکست دی جا چکی ہے۔ یہ بیماری لا علاج نہیں رہی۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا، یہ کیونکر سن سکتا تھا کہ ٹی بی لا علاج ہے مجھے اس شخص کی کم فہمی سے جھلا ہٹ ہوئی، اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اسے سمجھانے کو میں اس کی طرف بڑھا۔ میں یہی سوچ سکا کہ یہ شخص ٹی بی کا مریض ہے اور فرسودہ خیالات رکھنے والوں

آئیڈیل

کی طرح اسے بھی جدید علاج کا علم نہیں یہ اب بھی ٹی بی کو لا علاج کہہ رہا ہے۔

بوڑھا اب بھی تواتر سے یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھی بوڑھی عورت رو رہی تھی۔ اور کالے بوسیدہ برقعوں میں لپٹی دہلی پتلی زرد زرد لڑکیاں اسے سہارا دینے کی کوشش میں بے سہارا ہوئی جا رہی تھیں۔

بوڑھے کی آواز کے درد نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ میں ہمدردی سے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ میں اس کا علاج خود کروں گا۔ خواہ یہ کسی اور شہر ہی کا رہنے والا ہو۔

میں آہستہ آہستہ ان کے قریب آ گیا۔ دل ہی دل میں تعارف کے لئے جملے وضع کرنے لگا۔ ان جوان لڑکیوں کی موجودگی میں براہ راست بات کرتے ہوئے مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پھر رویا۔ ”ٹی بی لا علاج ہے لوگو۔“ بوڑھی عورت کی چند ہیائی آنکھیں اور تیزی سے برسنے لگیں۔ لڑکیاں پریشان سے پریشان تر ہو گئیں۔ میرے دل میں ہمدردی کے جذبات مچنے لگے۔ اور دوبارہ اور سہ بارہ اس نے یہی الفاظ دہرائے تو میں نے اس بوڑھی عورت سے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے ماں جی ٹی بی لا علاج تو نہیں یہ بار بار کیوں ایسا کہہ رہے ہیں۔“ عورت نے اپنی چند ہیائی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ چادر سے آنسو پونچھے۔ ایک دلدوز آہ بھری اور پھر سر کمزنی انداز میں ہلایا۔

”ہمارے باپ کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔“ بڑی لڑکی نے بڑے شائستہ انداز میں کہا۔ اس کے چہرے پر مایوسیوں کی ایسی کہرتھی کہ میں پریشان ہو گیا۔

”کیا یہ ٹی بی کے مریض ہیں۔“ میں نے حوصلہ کر کے پھر پوچھا۔ ان لوگوں کی مدد کو میرے اندر سے پکار سی اٹھ رہی تھی۔

لڑکی نے نفی میں سر ہلادیا۔

”ہمارے بھائی کو ٹی بی ہو گئی تھی۔“ دوسری لڑکی نے روتی آنکھوں سے کہا۔

ماضی کی طرف اشارہ تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان کا بھائی ٹی بی سے مرگیا ہے..... بوڑھا باپ صدے سے نیم پاگل ہے۔ اور بہنوں کے چہرے سے غربت کے سایوں میں مایوسی کی گھٹن اسی لئے پھیلی ہے۔ ماں کی آنکھیں بیٹے کو روتے روتے چند ہیامی گئی ہیں۔

”آپ نے اس کا علاج نہیں کرایا تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ اور پھر ایک ہی سانس میں اس بیماری کے مکمل اور سو فیصد علاج کی یقین دہانی کرانے کی کئی باتیں کہہ ڈالیں۔

بوڑھا اب بھی وقفوں سے وہی جملہ پکار رہا تھا۔ لڑکیاں بے توجہی سے میری باتیں سن رہی تھیں۔ اور بوڑھیا کی چادر کا کونہ زیادہ سے زیادہ گیلاتا رہتا جا رہا تھا۔ تجسس اور کرید فطری تھا۔ میں ان لوگوں کی روداد سننے کا خواہاں تھا۔ آج کے دور میں بھی یہ لوگ جدید علاج کی سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے یہ جہالت تھی کم علمی تھی۔ اگر وہ اپنے بیٹے کا مکمل علاج کرواتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا..... میں نے ذہن میں آئے انہی دلائل کی روشنی میں ان سے باتیں کیں، لیکن ماں بیٹیوں نے اپنی داستان غم جو سنائی تو میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

یہ بوڑھا آدمی ماسٹر کریم دین تھا۔ ایک پرائمری سکول کا دوسری جماعت کو پڑھانے والا استاد..... جس نے پچیس تیس سال پیشتر علم کی قدیلیں ننھے منے ذہنوں میں روشن کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ خلوص، عزم اور حوصلے سے اس نے اپنی ذمہ داری نبھائی تھی۔ اس کے کئی شاگرد بڑے ہو کر اونچے اونچے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس نے ہمیشہ اپنے عزم میں تقویت پائی تھی۔ اور اپنے اکلوتے بیٹے کو ان جیسے منصب تک پہنچانے کے لئے شروع سے کاوش شروع کر دی تھی۔ چار بیٹیوں میں صرف ایک بیٹا تھا..... ایک بیٹا..... اس کے مستقبل کی روشنی اس کے بڑھاپے کا سہارا..... اس کی عمر بھر کی محنتوں کا نچوڑ..... انتہائی معمولی تنخواہ پر بھی وہ صبر و شکر سے قانع تھا۔ اس نے صعوبتیں جھیلیں، فاقے کاٹے..... پھٹے پرانے کپڑوں میں گزارہ کیا۔ اس کی بیوی

اور بیٹیوں نے بھی اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔ یہ بیٹا ان سب کی خوشگوار زندگی کا ضامن تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بننے والا تھا۔ سب کی نظریں آنے والے ان خوبصورت لمحوں میں انکی تھیں۔ کبھی کبھی جب تنگدستی اور عسرت سے بیوی گھبرا جاتی تو کرم دین اسے خوبصورت خواب دکھاتا۔ خواب خواب ہی تو تھے۔ جب اس کا اکلوتا بیٹا سی ایس پی کا امتحان پاس کر کے ایک دم بڑا افسر بن جائے گا۔ ماں کی سونی کلائیوں میں چوڑیاں سجاے گا۔ بہنوں کے ماتھے پر چمکتے جھومر سجا کر انہیں گھر سے وداع کرے گا۔ ایک خوبصورت سا بنگلہ نوکر چاکر اور روپے پیسے کی ریل پیل ہوگی یہ دلفریب سہارے ماں بیٹیوں کو اتنے پھلے پھلے جاتے کہ وہ حال کی تلخیوں سے ہنستے کھیلتے نبٹنے کا عزم کر لیتیں۔

دن گزرتے گئے۔ محدود آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ لیکن مہنگائی جست لگا کر بڑھتی گئی۔ حالات سے نباہ کر لینا ہی ممکن نہ رہا۔ بیٹیوں نے سلائی کڑھائی اجرت پر کرنا شروع کر دی۔ سو سو سو روپے میں پانچ بچوں۔ ایک بیوی اور دسے سے کراہتی ماں کا بار کھینچنا کس طرح ممکن تھا۔ پھر بھی برے دن گزر رہے تھے۔ کرم دین کی توجہ بیٹے سے نہ ہٹی تھی۔ وہ اسے تعلیمی مدارج طے کرنے میں ہر ممکن سہولت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بیٹا اسی غیبی خزانے کی کنجی تھا جو مستقبل میں تھا۔ اور دن بدن اس کی دسترس کے قریب آ رہا تھا۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ گھر میں کھانا نہیں پکتا۔ سردیوں میں بستر نہیں بن سکتے۔ کپڑے ضرورتوں کو بھی پورا کرنے سے قاصر ہیں اسے تو یہی دھن تھی کہ اس کا بیٹا جلد سے جلد تعلیم مکمل کر لے۔ بیٹا بھی دن رات ایک کر رہا تھا۔ کتابیں چاٹ رہا تھا۔ صحت اجازت نہ دیتی تھی۔ لیکن محنت کرنا ہی تھی۔ باپ کی آس وہ توڑ تھوڑا ہی سکتا تھا۔ بیٹے نے میٹرک کر لیا۔ ایف اے میں داخلہ ایک مسئلہ تھا لیکن دوڑ دھوپ اور کئی شاگردوں کی سفارش کام آ گئی۔ کتابوں کے لئے اسے گھر کے کئی برتن بیچنا پڑے لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ چند سال ہی تو باقی تھے پھر زندگی خوشگوار کروٹ لینے والی تھی۔ لیکن ایف اے کے آخری دنوں میں بیٹے کو بخار نے آ لیا۔ امتحان دینا ضروری

آئیڈیل

تھا۔ بخار کی پرواہ نہ کی رات رات بھر جاگ کر پڑھا۔ خیراتی ہسپتال سے دوائی لا کر کھاتا رہا۔ خوراک اچھی ملنے کا سوال ہی کیا تھا۔ صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ لیکن باپ کی طرح اسے بھی سنہری مستقبل کو ایک جست میں جا کر پکڑ لینے کی دھن تھی۔ دو سال یونہی گزر گئے۔ صحت جواب دے گئی، بخار مستقل صورت اختیار کر گیا۔ کھانسی بھی رہنے لگی۔ اور سردی کی راتوں میں بھی بدن پسینے میں ڈوبنے لگا۔ معمولی علاج تو ممکن تھا وہ کربھی رہا تھا۔ لیکن جب تکلیف اور بڑھی تو باپ گھبرا گیا۔

بی اے کا امتحان سر پر تھا اور بیماری زور پکڑتی جا رہی تھی وہ اسے خود ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے روداد سننے کے بعد ایکسرے کا مشورہ دیا۔ ٹی بی کا خدشہ تھا۔ باپ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اور حساس بیٹا بھی کانپ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر نے دونوں کی حالت دیکھ کر بڑی ہمدردی سے بیماری کی نوعیت سمجھائی اور یہ بات ذہن نشین کرائی کہ خدا نخواستہ اگر ٹی بی ہوئی بھی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی آج کل عام بیماریوں کی سی بیماری ہے۔ اس کا مجرب علاج ہو سکتا ہے۔

ایکسرے رپورٹ میں اس کے دائیں پھیپھڑے پر انچ بھر زخم کا نشان تھا۔ ماں باپ اور بہنوں کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ خود وہ بھی مایوسیوں میں ڈوب گیا۔ ٹی بی ہسپتال سے رجوع کیا، وہاں بھی ڈاکٹر نے یہی کہانی بی لا علاج نہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں، لیکن ٹوٹے حوصلے تقویت کیونکر پاتے۔ لٹی آس کیوں کر سہارا لیتی۔ انجکشن دوائیاں، تو مفت ملیں۔ لیکن غذا کی جو فہرست ڈاکٹر نے بنا کر دی اور خوشگوار گھریلو ماحول کی جو اہمیت بتائی۔ وہ باپ دے سکا نہ ماں..... نہ ہی کڑھائی سلائی کر کے پیسے جمع کرنے والی بہنیں..... سوسا سوروپے میں تو روکھی سوکھی روٹی بھی نہ چلتی تھی۔ اتنی شاہی بیماری کو کیسے سہارا دیا جاتا۔ بیٹے کا حساس دل ہر وقت جلتا رہتا۔ ماں باپ کے پریشان چہرے جن پر ساختہ مسکراہٹ بھی نہ ٹھہر سکتی تھی۔ اسے ذہنی کوفت دیتے۔ ماں باپ اور بہنیں بھوکی رہ کر اس کے لئے انڈے، کھن، پھل، گوشت اور دودھ مہیا بھی کرتیں۔ تو اسے یوں لگتا جیسے وہ ان سب کا خون چوس رہا ہے۔ صحت بننے کے بجائے اور بگڑتی۔ مایوس

www.pdfbooksfree.pk

آئیڈیل

باپ بھاگ بھاگ کر ڈاکٹروں کے پاس جاتا..... وہ اسے یہی تسلی دیتے کہ ٹی بی لا علاج نہیں۔

لیکن جب سال بھر بعد اس کا جواں سال بیٹا خوشگوار ماحول اور عمدہ غذا نہ ہونے کی صورت میں ٹی بی سے ہی مر گیا۔ تو وہ حواس کھو بیٹھا۔ اس کا مستقبل اجڑ گیا تھا۔ خواب بکھر گئے تھے۔ امیدیں بجھ گئی تھیں۔ اور اب ایک ہی رٹ تھی۔

”ٹی بی لا علاج ہے لوگو۔“ بوڑھے کرم دین نے سر ہاتھوں میں تھامے پھر بین کے انداز میں کہا۔ تو میرا دل سینے میں دہل گیا۔ ٹی بی کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اس موذی مرض کے موثر اور مجرب علاج کے متعلق جانتے ہوئے بھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ کرم دین سچ کہہ رہا ہے۔

گاڑی آگئی تھی میں تیز قدموں سے وہاں سے آ گیا۔ کرم دین سے کچھ کہنے اسے سمجھانے یا ٹی بی لا علاج نہیں ہے ثابت کرنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آپ پر نگاہ ڈالی، پھر گرد و پیش دیکھا، آسمان پر نگاہ ڈالی..... ہاتھ بڑھا کر کانٹوں کو چھوا اور پھر اطمینان کا ایک طویل اور فرحت بخش سانس لیا۔

وہ زندہ تھا

وہ اب پورے حواس میں تھا۔

اس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی، اس کی خاک وردی خاک اور خون میں اٹی تھی۔ اس کے بھاری بھر کم بوٹ اپنی رنگت کھو چکے تھے۔ مٹی کی کئی تہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا بایاں بازو زخمی تھا اور دائیں ٹانگ میں ابھی تک لوہے کی چھوٹی چھوٹی پھانسیں اٹکی تھیں۔ پتلون کا کپڑا کئی جگہ سے اڑ چکا تھا اور جما ہوا خون دھول میں اٹ کر سیاہی مائل رنگت کا ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اپنی ٹانگ سے نکالے۔ اور درد کا احساس کر کے شاید سوچ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ کام میں مصروف تھے۔ لیکن ذہن الجھاؤ کے مراحل میں تھا۔

وہ کب سے یہاں پڑا تھا؟ گردش کتنی ساعتوں کا گلا گھونٹ چکی تھی..... لمحے کتنی صدیوں سے بوجھ گھسیٹ رہے تھے؟ اس نے نگاہ آسمان پر ڈالی، اندھے سے اجالے تھے۔ اسے پتہ نہ چل سکا کہ شام اتر رہی ہے یا صبح بیدار ہو رہی ہے۔ اس نے سر جھکا لیا اور بڑے انہماک سے اپنے بازو کا زخم دیکھنے لگا۔ اس نے زخم کے گرد گرد جم جانے والے سیاہی مائل سرخ خون کو ناخن سے کھرچا..... شاید اس طرح وہ بیٹے وقت کا اندازہ کر رہا تھا۔ کتنی ہی دیر سے وہ بے خیالی کے عالم میں اس کام میں مصروف رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا، آسمان پر گہری نگاہ ڈالی۔ اندھیرے کچھ اور پھیل چکے تھے۔ یقیناً شام اتر رہی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی پھٹی آستین کو بازو پر ٹھیک سے جمایا..... تو..... تو وہ کل رات کے پچھلے پہرے سے یہاں پڑا ہے۔

اس نے پلکیں جھپکائیں اور پھر نگاہ آسمان کی طرف دوڑائی۔ واقعی شام ہو رہی تھی۔ اب اس کے خفیہ احساس بیدار ہو چکے تھے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کل رات اسے ایڈوانس کا حکم ملا تھا۔ دشمن نے اس سرحدی چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ جس کی اہمیت

آخری گولی

اس کی آنکھیں کھلیں تو دھندلی دھندلی روشنیاں ان میں اتر گئیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑا۔ کھلی آنکھوں میں گھلتی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کا جسم اس کے ذہن ہی کی طرح جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔ روشنیاں آنکھوں میں جذب ہوتی رہیں اور پھر ان میں کچھ عکس آپوں آپ گھلنے لگے کچھ جھکی ہوئی جھاڑیاں، کچھ الجھے الجھے سرکنڈے کچھ ٹوٹی ہوئی شاخیں، گھلتے عکس واضح ہونے لگے تو ذہنی انجماد بھی قدرے حرارت پانے لگا۔ اس نے چاروں طرف بمشکل دیکھا سرکنڈے، جھاڑیاں اور شاخیں صرف یہی نظر آیا۔ کئی بے جان لمحے وہ ان سب کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے حواس پر چھائی خوابیدگی کی کہر کچھ چھٹنے لگی اسے اپنا آپ محسوس ہونے لگا۔

اس احساس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا، لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔ یوں جیسے وزنی پتھر ہو، پھر اس نے پاؤں کو جنبش دینے کی کوشش کی، جو رایگاں گئی۔

”کہیں وہ مرنے نہیں گیا۔“ سوچ کا سنسناتا ہوا اور اپنی پوری سفاکی سے اس کے ذہن پر ہوا۔ لمحے کی اس چوٹ سے وہ اذیت کھا کر بلبلایا۔ ”نہیں..... نہیں.....“ اس کے اندر سے احتجاجی چیخ ابھری۔ ”وہ مرنے نہیں سکتا..... وہ مرنے نہیں سکتا..... ارادے کی قوت زندگی کی جھر جھری بن کر اس کے رگ و پے میں کپکپا ہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سختی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور پھر پاؤں..... دوسرے لمحے وہ اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے

مادرِ وطن کے دفاع کے لئے آہنی حصار کی سی تھی۔ دشمن کو اس علاقے سے مار بھگانا تھا۔ اور وہ اپنی کمپنی کے ساتھ اس حکم پر دشمن کی موت بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی بندوق آگ اگل رہی تھی۔ اور اس کے سینے کی برق تپاں اس اگلی آگ سے بھی کہیں زیادہ خوفناک ہو رہی تھی۔ وقت اور فاصلے سے بے نیاز وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بندوق سے نکلی ہوئی کوئی گولی رائیگاں نہیں گئی تھی اس کا نشانہ کبھی چوکا ہی نہ تھا۔ وہ توڑتی چڑیا کے پروں کو نشانہ بنا دینے کا ماہر تھا۔

گولہ باری ہو رہی تھی۔ گولیوں کی بوچھاڑیں آ رہی تھیں، آگ و خون کا کھیل جاری تھا اس کی مقدس سرزمین کے نرم و گداز سینے میں بموں، گولیوں اور راکٹوں سے زخم پڑ رہے تھے آگ اور خون کا کھیل جاری تھا۔ اس کے خوبصورت شہروں کی جینینیں خون آلود ہو رہی تھیں۔ اس کے معصوم گاؤں کی مہکتی فضاؤں میں بارود کی زہرناکی پھیل رہی تھی۔ اس کے لہلہاتے کھیت جھلے جا رہے تھے۔ مادرِ وطن کا سینہ جل رہا تھا۔

اور جب وہ اپنی بندوق کی نالی دشمنوں کے تعاقب میں سیدھی گئے گولیاں برساتے آگے ہی آگے بھاگ رہا تھا۔ تو اس کے ذہن میں مادرِ وطن کے جلتے سینے ہی کی پیش تھی..... اسے اور کچھ یاد نہ تھا۔ اپنی بوڑھی ماں، جوان بیوی اور صرف چھ ماہ کی معصوم بچی کوئی بھی تو اس کی یادوں سے نہ لپٹی تھی۔ اس وقت وہ صرف اس مقدس مٹی کا بیٹا تھا۔ وطن کا سپوت تھا۔ نگران تھا، محافظ تھا، باقی ہر رشتہ ہر ناٹھ ٹانوی تھا۔ اسے اپنے دیس کی مٹی پر لگے دشمن کے نجس قدموں کا نشان مٹا کر اسے کڑی سزا دینا تھا۔ اس جرأت کو سزا جو اس نے اس کے وطن کی مقدس سرزمین پر قدم رکھنے کی کئی تھی وہ آگے ہی آگے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ دھماکے فضاؤں کا دل چیر رہے تھے۔ آسمان کا سینہ بھی جل اٹھا تھا۔ اک خوفناک سی سرخی پھیلی تھی۔ خاک، خون، بارود اور آگ چاروں طرف یہی کچھ تھا اس کے ساتھی جانے کہاں کہاں جا پہنچے تھے۔ کچھ جام شہادت نوش کر چکے تھے، کچھ دشمن کا دل چیر کے آگے بڑھ چکے تھے۔ وہ اپنی دھن، اپنی لگن اور اپنی آگ میں جلتا قہر الہی بنا دشمن کا تعاقب کر رہا تھا، زندگی اور موت اس کی دوڑ سے بہت پیچھے رہ

گئی تھیں۔

اس سے آگے اسے کچھ یاد نہ تھا۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ اور کب اس کے بازو اور ٹانگ میں پھٹتے گولوں کے ٹکڑے آ کر لگے اور وہ بے ہوش ہو کر ان سرکنڈوں میں آگرا..... اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اب وہ کہاں تھا دشمن کی یلغار روک دی گئی تھی، حملہ پسپا کر دیا گیا تھا..... حملہ پسپا کر دیا تھا یا..... اسے سوچتے ہوئے جھلاہٹ سی ہوئی۔ وہ بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا تو صورتحال کا علم تو ہوتا۔

اب تو..... اب تو چاروں اور اک جامد سناٹا تھا۔ خاموشیوں کو بھی جیسے نیند آ رہی تھی۔ کوئی پتا نہیں سرک رہا تھا اور جلنے والے آسمان پر جیسے دھواں بھی جامد ہو گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ویران الجھی جھاڑیوں میں بیٹھا رہا..... وہ یقیناً اس وقت دشمن کے علاقے میں تھا۔ اس سوچ سے ہی اسے جھر جھری سی آگئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اپنی بندوق اٹھالی۔ برق کی سی تیزی سے اس کے ہاتھ گولیوں کو ٹٹولنے لگے۔ بندوق میں صرف ایک گولی تھی۔

ایک گولی

آخری گولی

دشمن کا علاقہ اور ایک، صرف ایک گولی۔

ایک لمحے کو اسے اپنے حواس منتشر ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ اس کا جسم بھی کمزور نہیں تھا..... اسے اپنی بہادری پر بھی شبہ نہیں تھا۔ اپنے بازوؤں میں بھری بجلیوں کی تڑپ پر بھی شک نہیں تھا..... پھر بھی..... دشمن کا علاقہ اور اس کے پاس صرف ایک گولی..... کہیں دشمن سے آمناسا منا ہو گیا تو.....

لڑتے لڑتے شہید ہو جانے کا سبق تو اسے اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن اب وہ یوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے موت کو مار بھگایا تھا۔ اب اس کے شکنجے میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یادوں میں کہیں سے اس کی بوڑھی ماں در آئی تھی۔ جوان بیوی کا پیکر تھرکنے لگا تھا۔ اور معصوم بچی کا خیال آن دھمکا تھا۔ اتنے کڑے مرحلے میں وہ زندہ بچ نکلا تھا۔ تو

اب زندگی یوں دامن کھینچنے لگی تھی۔ وہ بہت جلد واپس اپنی مقدس زمین پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس مقدس زمین پر جس کے کسی گوشے میں اس کی بوڑھی ماں، جوان بیوی اور معصوم بچی تھی۔ اس کی ماں نے جب آخری بار اسے جنگ میں کودنے سے پہلے دعائیں دیتے ہوئے اس کے فاتح لوٹنے کی دعا مانگی تھی۔ تو اس کے بوڑھے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ کانپ رہی تھی۔

پھر اسے اپنی جواں سال بیوی یاد آ گئی۔ وہ اسے خدا اور رسول کو سوچتے ہوئے رو دی تھی۔ اس کی نظروں میں مایوسی تھی۔ وہ اس سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اسے جنگ کی آگ میں دھکیلنے کے بجائے اپنے دل میں چھپا لینا چاہتی تھی وہ جانتا تھا کہ مسکراتے ہوئے وداع کرنے والی محبوب بیوی کے اندر ایک مجروح عورت تڑپ رہی ہے۔ اور بچی..... بچی اس کے خیالوں میں در آئی۔ اسے باپ کی ضرورت تھی زندگی کی طویل راہوں پر وہی اس کا رہبر تھا۔

وہ تڑپ اٹھا..... یہ زندہ رہنے کی تڑپ تھی۔ خون کے رشتوں کی تڑپ تھی۔ روح کے بندھنوں کی تڑپ تھی۔

اسے ہر قیمت پر زندہ پہنچنا ہے۔ واپس زندہ پہنچنا ہے اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی بندوق پر پڑا۔ ایک گولی، آخری گولی، دشمن کا علاقہ اور آخری گولی..... لیکن اس بار وہ ہراساں نہیں ہوا۔ اسے اپنے عزم اور اپنے بھروسے کی قوت پر پورا یقین تھا۔ وہ اٹھا۔ بڑی آہستگی سے اٹھا۔ بازو اور ٹانگ کے زخم کرب کی تکلیف سے دوچار کر گئے۔ لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رات ڈھل آئی تھی..... چاروں طرف سنائے تھے۔ فضا میں ساکت تھیں شجر و حجر جیسے موت کی نیند میں تھے۔ ہر طرف تاریکیوں کے جال پھیلے تھے۔ اس نے دم روک کر ادھر ادھر دیکھا۔ زندگی کے کہیں آثار نظر نہ آئے۔ وہ سر کندھے احتیاط سے ہٹانے لگا..... بندوق اس کے کندھے پر تھی۔ زخمی بازو اینٹھنا ہوا تھا۔ ٹانگ شدت درد سے بے سہارا ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن زندگی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ اپنی

پوری قوت سے سر کندھے ہٹا ہٹا کر راستہ بنانے لگا۔ کافی جدوجہد کے بعد وہ سر کندوں، شاخوں اور جھاڑیوں کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اب وہ کھلے میدان میں ننگے آسمان تلے اپنی بندوق کندھے پر لگائے آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے واپس لوٹ رہا تھا۔

وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے ڈھیروں کو عبور کرتا، خود روجھاڑیوں کو پار کرتا، چلا گیا..... اسے شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ سوکھی زبان اس نے کئی بار لبوں پر پھیری۔ رک کر اندھیروں میں چاروں طرف کئی بار دیکھا، دور نزدیک کہیں بھی تو آبادی کا نشان نظر نہ آیا۔ ہاں جنوب مشرق کی طرف سے اسے جھکا ہوا آسمان قدرے سرخی مائل دکھائی دیا۔ اور دور کہیں..... دور..... گولہ باری سے ہونے والے دھماکوں کی لرزش مبہم مبہم سنائی دینے لگی۔ اس کے قدم خود بخود اس سمت اٹھنے لگے۔ اور ایک بار پھر اس کے اندر بیدار ہونے والا بیٹا، شوہر اور باپ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔

اب وہ گھنے درختوں تلے سے گزر رہا تھا۔ پھر وہ یہ راستہ بھی جیسے تیسے پھلانگتے ہوئے گزر گیا۔ اب..... اب وہ شاید کسی گاؤں کے قریب تھا۔ اندھیرے میں ڈوبے مکانوں کے سائے کچھ زیادہ ہی سیاہ نظر آ رہے تھے۔ پھیلے کھیتوں کا احساس بھی یقین دلا رہا تھا کہ وہ کسی گاؤں کے قریب ہی ہے۔

پیاس بھی شدت سے محسوس ہوئی اس کے قدم اور تیزی سے اٹھنے لگے۔ اب وہ پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ دونوں طرف تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیت تھے۔ اور سامنے ہی کسی کنوئیں کی منڈیر کا ہیولا نظروں میں ڈول رہا تھا۔

لیکن نہیں، وہ کنوئیں کا پانی نہیں پئے گا۔ ہو سکتا ہے دشمن نے اسے زہر آلود کر دیا ہو۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے زبان خشک ہو کر تالو سے چپکی جا رہی تھی۔ ہونٹ جل رہے تھے، لیکن وہ پانی کے پاس پہنچ کر بھی پیاسا تھا۔ وہ یہ پانی پی نہیں سکتا تھا منڈیر کے قریب کھڑے ہو کر اس نے حسرت سے پانی کو دیکھا۔ اور پھر لوٹ آیا۔ یہ

گاؤں بالکل خالی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ محتاط قدم اٹھائے ایک کھلے دروازے میں اندر جھانکا، وہاں کوئی بھی نہ تھا..... وہ ایک اور گھر میں داخل ہوا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا..... اس گھر کی گری ہوئی دیواریں اور ٹوٹی پھوٹی چھتیں غماز تھیں کہ جنگ کی خوفناک لہر ادھر سے بھی گزر چکی ہے۔

وہ پانی کی تلاش میں کئی گھروں میں جھانکا۔ شاید کہیں کوئی تل نظر آجائے۔ لیکن وہاں شاید تل تھے ہی نہیں یا اندھیرے میں اسے ہی نظر نہ آتے تھے۔

طلب تلاش کی راہیں بنا رہی تھی۔ اور وہ بے دھڑک خالی گھروں میں جھانک رہا تھا تقریباً یہ سارا گاؤں خالی تھا۔ کم از کم جتنے گھروں میں وہ گھس چکا تھا خالی تھے۔ لیکن بڑے سے اونچے دروازے میں جب وہ داخل ہوا تو اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ یہاں زندگی کے آثار ہلکی ہلکی باتوں اور دبے دبے قہقہوں میں بکھر رہے تھے اس نے چپکے سے بڑے محتاط انداز میں لوٹ جانا چاہا لیکن تجسس نے اس کے قدم تھام لئے۔ ہو سکتا ہے اس کے اپنے ہی سپاہی یہاں ڈیرہ ڈالے ہوں۔

اس نے بندوق کو ٹھیک طرح سے جمایا اور بے آواز قدموں سے دیوار کے ساتھ چلتے صحن پار کیا۔ اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ ہی اس سمت سرکتا گیا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں وہ دیوار کے ساتھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے کان آوازیں کو جذب کرنے لگے۔

ایک نہیں کئی آوازیں تھیں..... اور جب اس نے غور سے سنا تو محسوس کیا کہ بھاری مردانہ آوازیں میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی۔ وہ اس دالان سے ابھی کافی دور تھا۔ اس لئے پوری طرح سمجھ نہ پایا کہ معاملہ کیا ہے۔

وہ پھر دیوار کے ساتھ ساتھ لگا۔ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ اب وہ اس دالان کی بوسیدہ سی کھڑکی کے پاس تھا۔ جو بوسیدگی کا بار درازوں کی صورت میں لئے تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے اس کھڑکی کو چھوا۔ وہ اندر سے بند تھی۔ اب آوازیں صاف طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی کی دراڑ سے آنکھیں لگا دیں۔ کمرے میں شاید

کسی کونے میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے کئی ہیولے دیکھے وہ سب سپاہی تھے۔ لیکن یہ جان لینے میں اسے دشواری نہ ہوئی۔ کہ سپاہی دشمن کے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے بندوق پر رکھا۔ اس کا دم جیسے رک گیا..... ایک گولی..... اور اتنے بہت سے سپاہی..... کیا اسے واپس پلٹ جانا چاہیے؟

وہ ابھی ذہن میں اس ابھرتے سوال ہی کو بمشکل سمجھ پایا تھا کہ اندر سے نسوانی آواز واضح سی آئی..... یہ آواز نہیں، منت سماجت، چیخ اور دکھ کی تیز لہر تھی۔ وہ چوکنہ ہو کر سننے لگا۔ اور پھر اس نے قدرے کھلی دراڑ پر آنکھیں لگا دیں۔ اس نے جو کچھ دیکھا، اس کی روح کھول اٹھی۔

آٹھ دس سپاہی ایک نوجوان لڑکی کو گھیرے ہوئے اس سے ناشائستہ اور نازیبا حرکات کر رہے تھے۔ لڑکی حواس باختہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی انتھک کوشش میں بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی چیخوں پر آہ و فریاد پر سپاہی بیدردی سے ہنس رہے تھے۔ کوئی اس کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ کوئی اپنی طرف۔ کوئی پستول دکھا رہا تھا۔ کوئی بندوق کا بٹ بڑھا رہا تھا۔

”خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو..... مجھے مار ڈالو..... لیکن میری آبرو سے نہ کھیلو..... میں پاک وطن کی پاک بیٹی ہوں ظالمو.....“ وہ گڑگڑا کر کہہ رہی تھی۔

”پاک وطن کی پاک بیٹی۔“ دریدہ دہنوں نے اس طرح قہقہہ لگایا کہ ان کے کف آلود جہڑے کسی خوفناک درندے کے منہ کی طرح نظر آنے لگے۔

اور کھڑکی سے لگا جاننا سپاہی سر تا پا شعلہ بن گیا۔ وہ لڑکی اس کے دیس کی بیٹی تھی۔ اس کے دیس کی بیٹی تھی۔ جسے دشمن کے سپاہی اٹھالائے تھے، جس کی آبرو کا وہ رکھوالا تھا۔ جس کی تقدیس کا وہ نگہبان تھا۔ اس کی رگوں میں سیال خون بہتی ہوئی آگ بن گیا۔ اس کے سینے میں بجلیاں تڑپ گئیں۔ دیس کی آبرو، دیس کی حرمت اور تقدس دشمن کے زرخے میں تھا..... اس لڑکی کو وہ جانتا نہیں تھا..... کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ روحانی تعلق بھی نہیں تھا۔ لیکن دیس کی بیٹی کا رشتہ اور تعلق اتنا مستحکم، اتنا گہرا اور اتنا عظیم تھا کہ

آئیڈیل

وہ تڑپ گیا۔ شرارے کی طرح لپک کر اس نے ان آٹھ دس مسلح سپاہیوں کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالنا چاہا، لیکن بندوق اور رائفلوں اور شین گنوں کے مقابلے میں اس کے پاس صرف ایک گولی تھی..... ایک گولی..... آخری گولی..... اور دیس کی بیٹی دشمن کے زرعے میں اسے بچانا اس کا اولین فرض تھا۔ اس نے بندوق تھامی، اس کی نالی بڑی دراڑ میں رکھتے ہوئے اسی دراڑ سے نشانہ باندھا اور پھر آخری گولی..... ایک ہی گولی بے دھڑک داغ دی۔ وہ اس نازک لمحے میں صرف یہی کر سکتا تھا۔

کمرے میں گولی کی آواز کے ساتھ ہی ایک چیخ بھی ابھری۔ سپاہیوں میں اس غیر متوقع گولی سے بھکڑ مچ گئی۔

دراڑ سے اس نے دیکھا۔ کہ اس کا نشانہ صحیح تھا۔ گولی اس کے عین دل پر لگی تھی اس کا نشانہ کبھی چوکا نہیں تھا۔ وہ تو اڑتی چڑیا کے پروں کا نشانہ بنا لیا کرتا تھا۔
اطمینان کا گہرا لیکن جلتا ہوا سانس لیتے ہوئے اس نے بندوق کا بٹ کھڑکی پر پورے زور سے مارا..... کھڑکی کھل گئی۔

اور پیشتر اس کے کہ سپاہی کچھ سوچ سکتے، وہ بھرا ہوا طوفان بن کر کمرے میں کود گیا۔ اس کمرے میں جس میں بے شمار بندوقیں، رائفلیں اور جانے کیا کچھ تھا اور جس کے اندر دس بارہ مسلح سپاہی تھے۔

لیکن ان سب سے وہ بلا خوف و خطر نکرا گیا۔

جان کی بازی لگا کر اس نے اپنے دیس کی آبرو، حرمت اور تقدس کو بچا لیا تھا۔
لڑکی دم توڑ چکی تھی۔

☆☆☆